

اولیاء اور علماء کی تصدیقات
اور
چند اہم اضافوں کے ساتھ

امام حسین رضی اللہ عنہ اور واقعہ کربلا

قرآن، حدیث تارخ اور دانش کی روشنی میں

حافظ ظفر اللہ شفیق

تاقیامت قطع استبداد کرد
موج خون او چمن ایجاد کرد

امام حسین رضی اللہ عنہ
اور

واقعہ کربلا

قرآن، حدیث، تاریخ اور دانش کی روشنی میں

امام حسینؑ کے سوانحی نقوش، خاندانی خصوصیات،
ولولہ انگیز قیادت کا تذکرہ، واقعہ کربلا کی بے غبار تفصیلات،
کربلا کے اسرار و معارف، شبہات کے جوابات،
کربلا کی جغرافیائی اور عمرانی تاریخ

— نالیس —

حافظ ظفر اللہ شفیق

ادارہ صراط مستقیم

شالا مارلنک روڈ، باغبان پورہ، لاہور

جملہ حقوق بحق مُصنّف محفوظ ہیں

کتاب : _____ امام حسین ؑ اور واقعہ کربلا
قرآن، حدیث، تاریخ اور دانش کی روشنی میں

تصنیف : _____ حافظ ظفر اللہ شفیق
Mob: 0300-4186759

ناشر :

ادارہ صراطِ مستقیم

شریٹ #9/c-s مسلم کالونی شالا مارلنگ روڈ، ہاغبانپورہ، لاہور

ملنے کے چند مقامات

- « مسجد خالد، کیولری گراؤنڈ لاہور کینٹ
- « مکتبہ سید احمد شہید الکرم مارکیٹ اردو بازار، لاہور
- « ادارہ اسلامیات، انارکلی، لاہور
- « مکتبہ سلطان عالمگیر 5 لوئر مال لاہور

آئینہ مضامین

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
40	وفائی کی	13	نہ تنہا من
41	○ مسلم کی گرفتاری	14	○ آراء و تقاریر
41	○ مسلم اور حائی کی شہادت	18	حرف دل
	○ امام حسینؑ نظام خلافت کے لیے	33	واقعہ کربلا
41	کوفہ روانہ ہوتے ہیں		○ امام حسینؑ سے بیعت کا مطالبہ
42	○ ابن سعد کا تقرر		ہوتا ہے اور آپؐ مکہ کی جانب
43	○ امام حسینؑ کی تجویز		ہجرت کرتے ہیں
43	○ سانحہ کربلا کا آغاز ہوتا ہے	35	○ اہل کوفہ پیام بھیجتے ہیں
43	○ شیر خوار بیٹے کی شہادت	35	○ مسلمؑ کوفہ روانہ ہوتے ہیں
44	○ امام حسینؑ کی شہادت	36	○ باشندگان کوفہ کی بیعت
44	○ سر مبارک یزید کے دربار میں	36	○ نعمان بن بشیر کی حق گوئی و معزولی
	○ خواتین اور بچے یزید کے	37	○ ابن زیاد کی کوفہ میں آمد
45	دربار میں	37	○ مسلم بن عقیلؑ کی تلاش
47	○ قافلہ واپس مدینہ پہنچتا ہے	38	○ حانیؑ بن عروہ کی گرفتاری
48	○ امام حسینؑ کا سر کہاں دفن ہوا؟	39	○ قبیلہ مذحج کا احتجاج
48	○ امام حسینؑ کا مزار		○ مسلمؑ کا لشکر شاہی محل کے
51	اسرار کربلا		دروازے پر
53	○ قربانی اور خلافت کا سفر	40	○ مسلمؑ کے ساتھیوں نے بے
	○ ملوکیت کے خلاف قیام میں		

103	اللہ کے خاص تربیت یافتہ ہیں ○ امام حسنؑ اور امام حسینؑ کا لڑکھڑانا اور گرنا رسول اللہ ﷺ	58	امام حسینؑ کی سبقت قابلِ تعجب نہیں
103	کو گوارا نہ ہوا	62	○ عزمِ حسینیؑ عزمِ مصدیقیؑ کا نمونہ ہے ○ سیدنا ابوبکرؓ اور سیدنا حسینؑ کا
105	○ حسینؑ کی پیاس نے رسول اللہ ﷺ کو بے چین کر دیا	67	شرح صدر ○ دو عظیم قربانیوں کے سبب.....
107	○ حسینؑ سے محبت رکھنے والا اللہ کا محبوب ہے	69	رو خواب ○ عثمانؓ اور حسینؑ..... شہیدانِ
107	○ امام حسنؑ کے فیصلوں کو نبوی تائید حاصل ہے	73	خلافت ○ روحِ قربانی عشق ہے
109	○ امام حسینؑ کو رسول اللہ ﷺ سے الگ نہیں کیا جاسکتا	75	○ سورۃ العصر کی روشنی میں حسینؑ ”امام العصر“ ہیں
110	○ امام حسینؑ جو انسانِ جنت کے سردار ہیں	76	○ حسینؑ خیر امت ہیں
111	○ حسینؑ نگلشنِ رسالت کے مہکتے پھول ہیں	86	○ ہٹا کہ بنائے لا الہ است حسینؑ
112	○ رسول اللہ ﷺ کو زیادہ پیارا، زیادہ اونچا	88	○ حسینؑ امامِ امت ہیں
113	○ سیدنا علیؑ کا بارگاہِ رسالت میں مقام	91	○ اللہ حسینؑ کے ساتھ ہے
113	○ علیؑ وزیرِ نبی ﷺ	93	○ حسینؑ امامِ الشہداء ہیں
114	○ حبِ علیؑ..... ایمان کی علامت بغضِ علیؑ..... نفاق کی علامت	94	○ جبر و استبداد کے خلاف جدوجہد کے لیے اسوہ امام حسینؑ ہی ہیں
		96	○ امام حسنؑ اور امام حسینؑ خدائی پہرے میں رہے اور منبعِ ذریت بنے
		98	○ امام حسنؑ اور امام حسینؑ میں رسول اللہ ﷺ نظر آتے تھے
		101	○ امام حسنؑ اور امام حسینؑ رسول

132	○ امام حسینؑ کے قتل ناحق پر آسمان بھی رویا	115	○ فاطمہ زہراؑ..... جمل مصطفیٰ ﷺ
135	○ رسول اللہ ﷺ پر کیا گزری ہوگی؟!	115	○ فاطمہ زہراؑ..... پیکر حیا
136	○ اللہ کی عدالت میں اہل بیتؑ کے قتل ناحق کا مقدمہ رسول اللہ ﷺ خود دائر کریں گے	116	○ سیدہ زینبؑ بنت فاطمہؑ کے مزار پر غیبی پہرہ
137	○ علیؑ کی شخصیت میں مسیحؑ کی شخصیت کا پرتو ہے اور حسینؑ کی مظلومی میں مسیحؑ کی مظلومی دکھائی دیتی ہے	117	○ فاطمی نسبت کی ہیبت
139	○ پیغمبروں کی زبان سے قاتلین حسینؑ پر لعنت	118	○ امام حسنؑ اور امام حسینؑ اپنے آباء کرام علیہم السلام کے وارثانِ برحق ہیں
141	○ فرات کنارے ایک ذبیحہ..... بائبل میں ذکر حسینؑ؟	121	○ دہرے پیمانے اہل بیتؑ سے صلح و جنگ
143	○ یزید کی نو خیز امارت پر انجیل میں لعنت	124	○ رسول اللہ ﷺ سے صلح و جنگ ہے ○ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھنے والا اہل بیتؑ سے بھی محبت رکھے گا
145	○ چھ آدمیوں پر اللہ اور رسول ﷺ کی لعنت	124	○ حسینؑ نہ صرف حیاتِ نبوی میں بلکہ وفاتِ نبوی کے بعد بھی آپ ﷺ کے زیرِ تربیت اور زیرِ ہدایت رہے
146	○ امام حسینؑ کے قاتلوں اور گستاخوں سے خدائی انتقام	125	○ امام حسینؑ رسول اللہ ﷺ کے جسمِ اطہر کا ایک ٹکڑا ہیں
147	یزید کا انجام	128	○ امام حسینؑ کی شہادت پر خود رسول اللہ ﷺ غم زدہ ہوئے اور روئے
		129	○ غمِ امامؑ کے ضمن میں ہمارا مجرمانہ رویہ
		131	

○ ”میں قرآن اور اہل بیت تم	148	حکومت چھن گئی
میں چھوڑے جا رہا ہوں“.....	148	نسل مٹ گئی
”قرآن اور اہل بیت ہرگز ایک	149	قاتلین روندے گئے
دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے“	149	خدائی آگ دریا میں بھی نہ بجھی
174 آل محمد ﷺ اور اہل بیت کا	150	پياس نہیں بجھتی تھی
مفہوم قرآن کی روشنی میں	151	مجھے پیاس نے مار ڈالا
180 آل اہل کا مصداق	151	اندھا ہو گیا
185 ذریت کا مصداق	153	چہرہ سیاہ ہو گیا
بیٹی کی اولاد کو اہل بیت میں شامل	153	شکل مسخ ہو گئی
187 فرمانا عظیم سماجی انقلاب ہے	154	سرپاش پاش ہو گیا
188 عترت کا مصداق	155	فقر و شرکاشکار ہو گیا
صلوٰۃ و سلام میں آل محمد ﷺ	155	کوڑھی ہو گیا
188 کا مصداق ازواج و ذریت ہے	156	خدائی چھڑی نے گستاخ امام کا
197 حقیقی اور حکمی اہل بیت	156	بھیجا چاٹ لیا
197 ازواج اور اقربا میں فرق	158	گستاخ اہل بیت کو آج بھی
صلوٰۃ و سلام صرف محمد و آل محمد کا	162	سزا ملتی ہے..... چند مشاہدے
199 حق ہے ﷺ	164	گستاخی کی سزا سانس نبوت سے
صحابہ کرام کے درمیان اہل بیت	166	○ اہل بیت شعائر اللہ میں داخل ہیں
202 مخصوص مقام رکھتے ہیں	167	○ جنت میں اہل بیت کا مقام بلند
صلوٰۃ و سلام کا اعزاز ذریت میں	167	○ پاک نبی پاک گھرانہ ﷺ
203 صرف اتقیا کو حاصل ہوتا ہے		○ رسول اللہ ﷺ کی قیادت
207 ○ جعلی سادات کا فتنہ		میں اہل بیت باطل کے مقابل
212 ○ اصلی سید کی پہچان	171	صف آ رہا ہوتے ہیں

231	○ حبیب ابن حبیب	214	○ قرآن مجید کی روشنی میں مودّت
232	○ سیدنا بلالؓ نے فرمائش پوری کی		اہل بیتؓ ہر مؤمن پر واجب ہے
	○ ابو ہریرہؓ امام حسنؓ کا بطن		مودّت اہل بیتؓ کے بارے
233	مبارک چومتے ہیں		میں صحابہؓ، تابعینؓ، ائمہؓ اور
	○ ابو ہریرہؓ امام حسینؓ کے پاؤں		اولیاء کا طرز عمل
234	جھاڑ رہے ہیں		○ سیدنا ابوبکرؓ کے نزدیک اہل بیتؓ
	○ ابو ہریرہؓ امام حسنؓ کو "سیدی"		کا اکرام رسول اللہ ﷺ کے
234	کہہ کر پکارتے ہیں	224	اکرام میں داخل ہے
	○ میرادل ہمیشہ حسنؓ کی محبت سے		○ ابوبکرؓ علیؓ اور عباسؓ کے لیے
235	لبریز رہا ہے	225	اپنی جگہ چھوڑ دیتے ہیں
	○ عمرؓ بن عبدالعزیزؓ کو احیاء خلافت		○ ابوبکرؓ علیؓ کے چہرہ انور کی طرف
	کی جو سعادت ملی، یہ مودّت	225	کثرت سے دیکھا کرتے تھے
235	اہل بیتؓ کا صلہ تھی		○ ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ سواری سے
	ائمہ اربعہؓ اور اہل بیتؓ	226	اتر جاتے تھے
	○ امام اعظم ابو حنیفہؒ کی سعادت	226	○ ابوبکرؓ و عمرؓ منبر سے اتر آئے
237	وذہانت سیدنا علیؓ کی دعا کا ثمر ہے		○ دور ملوکیت میں اہل بیتؓ سے
	○ امام ابو حنیفہؒ کا علم و فضل اہل بیتؓ	227	نار و اسلوک
238	کا صدقہ ہے		○ سیدنا عمرؓ زمانہ قحط میں سیدنا عباسؓ
	○ امام ابو حنیفہؒ شہید اہل بیتؓ ہیں	229	کے وسیلے سے دعا کرتے ہیں
242	○ امام مالکؒ کا کمال مودّت	230	○ آپؐ کو اجازت کی ضرورت نہیں
244	○ امام احمدؒ کا جمال مودّت	231	○ علیؓ مولا
	○ امام شافعیؒ اہل بیتؓ کی مودّت		○ رسول اللہ ﷺ کی محبت مجھے
244	میں فاتی تھے	231	اپنی محبت سے زیادہ عزیز ہے

257	قطار رو پڑے	247	○ یہ کیسا سنی ہے!
257	○ تم سے تو وہ ہی اچھے		ائمہ اور اولیاء کے نزدیک
258	○ اہل بیتؑ کا جو نامیرا تاج ہے		مودتِ اہل بیتؑ کو سلامتی
	○ اکابر علماء دیوبند نسبتِ اہل		خاتمہ میں بڑا دخل ہے
259	بیتؑ کے حامل تھے	248	○ مجذہ والف ثانی کا ارشاد
	ائمہ اہل بیتؑ راہِ صدق	249	○ امام شافعیؒ کا ارشاد
	وصفا میں بھی امام ہیں	249	○ ایمان افروز رباعی
261	○ ابوالحسن علی بن ابی طالبؑ		○ میرزا مظہر جان جاناں شہیدؒ
262	○ امام حسنؑ	250	کا ارشاد
263	○ امام حسینؑ		○ علامہ فیض الحسن سہارن پوریؒ
264	○ امام زین العابدینؑ	251	کے اشعار
265	○ امام باقرؑ		○ ”مجھے حسینی چادر میں کفنایا جائے“
269	○ امام جعفر صادقؑ	252	اور نگ زیب عالمگیرؑ کی وصیت
	○ ہر زمانے میں قطبِ اہل بیتؑ		○ اور نگ زیب عالمگیرؑ کی سادات
271	سے ہوتا ہے	253	سے مودت
	○ اہل بیتؑ کے بارے میں علامہ		اکابر علماء دیوبند اور
272	آلویؒ کا مسلک		مودتِ اہل بیتؑ
273	نکتہ لطیفہ		○ سارے عالم پر سادات کی
	○ ائمہ اہل بیتؑ ہر دور میں اہل علم	255	تعظیم واجب ہے
274	وایمان کا مرجع رہے		○ میں سیدزادے کے منہ میں
	○ اسماءِ اہل بیتؑ کی برکت سے	255	اپنا العابد نہیں ڈال سکتا
276	جنون دور ہو جاتا ہے	256	○ سید کی اقتداء میرا مرلہ نجات ہے
	○ یزیدی سلوک پر مسیحیوں کا دل		○ مفتی اعظمؒ ذکرِ امامؑ پر زارو

295	○ قبر مبارک سے اذان کی آواز	278	فگار طعنہ
296	○ ایک عجیب حکایت	279	○ امام حسینؑ..... ایک نورانی ستون
296	○ خلافت کے بعد ملوکیت آئے گی	280	○ سر مبارک کے احترام کا صلہ
	○ خلافت علی منہاج النبوت کتنی	281	○ دُنیا رہی نہ دین
298	مدت رہے گی؟		○ شاہ ولی اللہؒ کے حکیمانہ علوم
	○ خلافت و ملوکیت میں کیا	282	امام حسنؑ اور امام حسینؑ کا فیض ہیں
299	فرق ہے؟		○ سید احمد شہیدؒ کی ولایت و عزیمت
299	○ زیت خون میں ڈوب جائے گا	284	بھی اُنہی کا عطیہ ہے
	○ پانی میں نمک کی طرح گھل		○ تمام سلاسل طریقت ائمہ
300	جائے گا	285	اہل بیت کا فیض ہیں
301	○ مسلم بن عقبہ مزی کا انجام	286	○ مسئلہ تفصیل کا حکیمانہ حل
303	○ شر قریب آ گیا		○ صحابہ کرامؓ اور اہل بیت عظامؓ
	○ ان فتنوں سے امت کو کیا	289	کے بارے میں ہمارا عقیدہ
303	نقصان پہنچا؟	290	○ بارہ امامؓ قطب تھے
304	○ کیا یہ لوگ قابل احترام ہیں؟		○ امت میں اہل بیتؓ سفینہ نوح
	امام حسینؑ اپنی ذات میں	291	کی مانند ہیں
	ایک امت تھے، چند سوانحی نقوش		واقعہ کربلا نبوی پیشگوئیوں
305	○ آغوش نبوت میں		کے آئینے میں
306	○ آپؐ حادیثِ ولایت کرتے ہیں	292	○ شرابِ امت..... خیابِ امت
	○ لڑکپن جوانی سیدنا علیؑ کی		○ چند بیوقوف قریشی لڑکوں کے
307	زیر نگرانی اور علمی ذوق و شوق	293	ہاتھوں میری امت ہلاک ہوگی
308	○ کمال علمی ظاہر ہوتا ہے	294	○ میرے اہل بیت کو ستایا جائے گا
310	○ مسندِ ریس کو زینت بخشتے ہیں	295	○ تم پر امتلا آئے گا

323	مولانا محمد قاسم نانوتوی	311	○ تواضع اور انکساری کا نمونہ
324	سید عطاء اللہ شاہ بخاری	311	○ سخاوت آپ کی وراثت
325	مولانا محمد یار	313	○ طبیعت موزون تھی
	○ تاریخ انبیاء علیہم السلام کی	314	○ ذوق عبادت فطری تھا
	سب سے بڑی قربانی.....		○ قلب اطہر پر خوف الہی طاری
326	ایک نفس تحقیق	315	رہتا تھا
330	○ وہ آپس میں رحیم	316	○ شجاعت آپ گھٹی میں ملی
	○ رسول و آل رسول ﷺ کا		○ صحابہ کرام آپ کی تعظیم
332	مقام تسلیم و رضا	316	کرتے تھے
	○ امام حسین کی شخصیت اور موقف	317	○ ہمہ گیر شخصیت
	کو قرآن و حدیث کی روشنی میں		○ امام حسن اور امام حسین صحابی
334	پڑھنا چاہیے	318	بھی ہیں
	○ آیازید منصب خلافت پر فائز		○ رسول اللہ ﷺ نے امام حسن
335	ہو چکا تھا؟	321	اور امام حسین سے خصوصی بیعت لی
	○ خلفائے راشدین کے انتخاب		○ امام حسن اور امام حسین کی
	پر ایک نظر	322	خصوصی گواہی
336	خلیفہ اول کا انتخاب		○ رسول اللہ ﷺ سے خصوصی
337	خلیفہ دوم کا انتخاب	322	قربت
337	خلیفہ سوم کا انتخاب	322	یزیدی سند مردود ہے
339	خلیفہ چہارم کا انتخاب		یزید کے بارے میں چند
339	امام حسن کا انتخاب		اکابر علماء کی آراء
340	حضرت عمر کا اعلان حقیقت	323	شاہ ولی اللہ دہلوی
340	حضرت علی مرتضیٰ کا اظہار حقیقت	323	قاضی ثناء اللہ پانی پتی
341	یزید کا تقرر		

383	○ امام حسنؑ کی امیر معاویہؓ سے صلح	342	ملوکیت اور خلافت میں فرق صحابہؓ سمجھتے تھے
385	○ مناقب اہل بیتؑ کی روایات پر بے جا تنقید		ملوکیت کے جواز پر ایک استدلال کا جواب
388	○ حفظ مراتب تقاضائے شریعت ہے	343	○ کیا یزید پر امت کا اجماع ہو چکا تھا؟
391	○ یہ رشتہ دار	344	○ کیا حضرت حسینؑ نے یزید پر خروج کیا تھا؟
392	○ تابعین کے لقب کا استحصال	347	○ کیا قتل حسینؑ میں یزید کا ہاتھ نہ تھا؟
394	○ کوفہ اور کوفی..... ایک فکر انگیز تحقیق	352	○ یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دینے کا افسانہ..... ایک فکر انگیز تحقیق
399	○ معصوم اور محفوظ میں فرق	355	○ کیا یزید مغفرت کی بشارت میں داخل رہا؟
402	○ بغض صحابہؓ اور بغض اہل بیتؑ کی سزا	360	○ صحابہ کرامؓ کی یزید سے بیعت
402	○ صحابہ کرامؓ پر لعن طعن قیامت کی علامت ہے	364	○ یزیدی سازش کا پول کھلتا ہے
	○ قصاص عثمانؓ کا معاملہ قضا سے تعلق رکھتا ہے اور بہترین قاضی علیؑ ہیں	366	○ سانحہ کربلا میں نصرانی سازش بھی کار فرما تھی
403	○ سیدنا علیؑ کی فراست	369	○ معاویہ بن یزید کا اعتراف حق
404	○ حدیث معادن کا صحیح مفہوم	373	○ مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری!
405	○ یزیدی تلپیس	378	○ امام حسینؑ کا ہر قدم شریعت کے مطابق اٹھا
407	○ امام حسینؑ کی امامت		○ روکنے والوں نے امام حسینؑ کو کیوں روکا؟
408	○ سراب	382	
409	○ غلط تصور		
409	○ فتنہ انگیز کون ہوتا ہے؟		
410	○ ہر شرع سے بے گانہ لوگ		
410	○ جیت، ہار		
411			

425	○ غیرت یا حماقت	411	○ عظمتِ عاشوراً
427	○ فاتح کون رہا؟	411	○ اہل عزیمت ہر دور میں کم رہے
428	○ عزت اور ذلت	412	○ نسبت کا احترام لازم ہے
428	○ صراطِ مستقیم		○ ایذا رسول ﷺ باعثِ لعنت
429	○ خُب اور بغض	413	○ اور سببِ عذاب ہے
430	○ ہمارے سیاسی رہنما	414	○ اس سے بڑا فساد اور کیا ہوگا!
431	○ کلامِ آخر		○ امام حسنؑ اور امام حسینؑ نے
433	○ مصادر	416	○ اپنا حق وصول کیا
437	تاریخِ کربلا	419	○ عظمتِ صحابہ کا نعرہ
439	○ تاریخِ اسلام میں کربلا کا مقام	419	○ کیا عجب ہے
440	○ کربلا کا محل وقوع	420	○ نسب اور نسبت
440	○ کربلا کی عمرانی تاریخ	421	○ حسینی اور یزیدی
443	○ عہدِ موجود کا کربلا	421	○ فکری تضاد
	○ کربلا کی اہم عمارات اور	421	○ افراط و تفریط
	تاریخی مقامات:	422	○ بغض اور ضد
444	(۱) روضہٴ امامؑ کی تاریخ	422	○ آلِ محمد ﷺ
445	○ تکوینی مصلحت	422	○ نہر زدہ لوگ
445	○ ایک قلندر مزارِ امامؑ پر	423	○ جعلی سنی
446	(۲) حصنِ الانبیا	423	○ ہائے بدبختی
448	(۳) عینِ التمر	424	○ حسینیتِ حیات ہے
448	(۴) رزا زہ جھیل	424	○ احترامِ مدینہ
448	○ کربلا کی وجہ تسمیہ..... آٹھ وجوہ	424	○ اگر میں اُس وقت ہوتا
453	○ مصادر	424	○ امام ابوحنیفہؒ کا سکوت
454	○ کلماتِ تحسین		

دیباچہ بار دوم

نہ تنہا من.....

اتنا جانتا ہوں کہ میں کچھ نہیں، میرے پاس کچھ نہیں۔ علم و عمل سے تہی دامن، فن و رابطہ سے نا آشنا، ذوق تشہیر سے محروم، لیکن یہ ”مودت نامہ“ کیا چھپا، ہزاروں چاہنے والے مل گئے، اولیاء نے دعاؤں سے نہال کر دیا، علماً نے، مسلکی عصبیوں اور ذاتی مصلحتوں سے بالا ہو کر، تصویب و تحسین سے نوازا، اہل دانش نے وقت کی ضرورت قرار دیا، علمی مجالس اور جمعہ کے خطبات میں اس کا تذکرہ ہوا، رسائل و جرائد میں تبصرہ ہوا، کئی مقامات پر اجتماعی مطالعہ ہوا، اہل علم نے اپنی تحقیقی کتب اور مضامین میں اس کا حوالہ دیا، اور پہلا ایڈیشن دو ماہ کے قلیل عرصے میں، کسی تشہیری مہم کے بغیر، ہاتھوں ہاتھ نکل گیا، اس سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آئی کہ مودت اہل بیتؑ تمام مسالک اور ارباب فکر و نظر کے درمیان قدر مشترک اور نقطہ اتحاد ہے۔

ان مہربانیوں کو میں انہی کا لطف و کرم یقین کرتا ہوں، جن کی مودت اس کاوش کی جان اور ہمارا سرمایہ ایمان ہے، شکر ہے اُس ذات کا جس نے نور مودت عطا فرمایا! سب نہیں، چند آراء اور ان کی بھی تلخیص نذر قارئین ہے، صرف اس حقیقت اور مسرت کے اظہار کے لیے کہ:

نہ تنہا من دریں مے خانہ مستم

جنید و شبلی و عطار ہم مست!

تمام عناہوں اور محبتوں کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ! مفصل آراء انشاء اللہ الگ شائع کی جائیں گی۔

حضرت سید نفیس الحسینی حفظہ اللہ (کریم پارک، لاہور)

”گزشتہ صدی کے نصف اول میں کراچی سے ناٹھسی دجل و تلپیس کا طوفان اٹھا اور بڑے ساز و سامان سے اٹھا، اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ اس کے پیٹ میں آئے اور آ رہے ہیں، اہل حق نے اس فتنے کے سد باب کے لیے بہت سی کتابیں لکھیں، حال ہی میں حافظ ظفر اللہ شفیق نے زیر نظر کتاب لکھی ہے، جس نے ناٹھسی دجل و فریب کے تار و پود بکھیر دیے ہیں، میں نے یہ کتاب از اول تا آخر پڑھوا کر سنی ہے، مباحث میں تحقیق اور تحریر میں اعتدال ہے، میں نہایت مسرت کے ساتھ اس کتاب کی تصدیق و تائید کرتا ہوں، اہل حق کا موقف سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔“

حضرت مولانا ظفر احمد قادریؒ (رائے ونڈ)

”کتاب پڑھی اور پھر پڑھ رہا ہوں، کیا عرض کروں دوران مطالعہ میں کیا کیفیت ہوتی ہے، ماشاء اللہ احقاق حق خوب ہوا ہے۔“

حضرت ڈاکٹر عبدالمقیم حفظہ اللہ

خلیفہ راشد حضرت مولانا حکیم محمد اختر دامت برکاتہم

”کسی بھی قوم کی زندگی اس کے رہنما اور ہیرو سے ہوتی ہے، قائد اعظم محمد علی جناح کی کردار کشی پاکستان کے استحکام کے خلاف ہے تو جن ہستیوں کو خود اللہ تعالیٰ نے پاک صاف کر کے امت کا امام بنایا، ان کی کردار کشی سے امت کا وجود کیسے برقرار رہ سکتا ہے؟ اس کتاب کے مطالعہ سے مقام اہل بیتؑ سے آگاہی حاصل ہوتی ہے، اور بہت سی الجھنیں حل ہو جاتی ہیں۔ جی چاہا وہ ہاتھ چوم لوں جن سے مودت و الفت میں ڈوبی ہوئی ایسی کتاب لکھی گئی۔“

شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد المجید حفظہ اللہ (جامعہ باب العلوم، کھروڑ پکا)

رسول اکرم ﷺ نے جو فرمایا تھا کہ ایک زمانہ آئے گا جب فتنے یوں برپا ہوں گے جیسے

دھاگا ٹوٹنے سے موتی گرتے ہیں، اپنے زمانے میں فتنوں کی کثرت کو دیکھتے ہوئے ذہن میں یہ خیال غالب ہے کہ وہ زمانہ آچکا اور فتنوں کی کثرت کی وجہ وہی ہے جس کی طرف اس حدیث شریف میں اشارہ فرمایا گیا: دھاگا ٹوٹنا۔ یہ دھاگا درحقیقت رشتہ اور تعلق ہے رسول اکرم ﷺ سے اور آپ کے اہل تعلق سے، جو دین کی لڑی میں پردے ہوئے تھے۔ یہ رشتہ جب کمزور پڑتا ہے اور یہ دھاگا جب ٹوٹتا ہے تو فتنوں میں ابتلا اور وقوع ہوتا ہے، کہیں الحاد و تشکیک کا فتنہ، کہیں رافضیت کا فتنہ، کہیں خارجیت اور ناصبیت کا فتنہ، کہیں بدعات کا فتنہ، ان میں کئی فتنے چھوٹے ہیں، کئی بڑے، کچھ ظاہری ہیں کچھ باطنی اور ان تمام فتنوں سے بچاؤ کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور جن جن کا آپ ﷺ سے محبت، عقیدت اور وفا کا تعلق ہے، ان سے اپنے تعلق کو مضبوط کیا جائے، حضور ﷺ کے پیاروں سے پیار کیا جائے۔

عصر حاضر میں اہل علم میں ایک فتنہ بڑی تیزی سے پھیلا، فتنہ ناصبیت، اور اس کا بنیادی سبب یہ ہوا کہ رافضیت کے رد میں لوگوں نے مقام اہل بیتؑ سے نا آشنائی اور ان کے موقف سے لاعلمی گوارا کیے رکھی۔

اس فتنے کی ایک مدت سے مؤثر تردید کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی، حافظ ظفر اللہ شفیق کی تالیف ”امام حسینؑ اور واقعہ کربلا“ ملی، اول سے آخر تک ایک ایک لفظ پڑھا اور بامعان نظر پڑھا، دل نے گواہی دی کہ ناصبیت کے زہر کا تریاق یہ کتاب ہے۔

استدلال صحیح، استنباط قوی، انداز دلکش، لفظ لفظ میں محبت کی خوشبو، مجھے اس کتاب پر اعتماد ہے اور میں احباب سے اس کے مطالعے کی سفارش کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کو حب آل محمد ﷺ کے نور سے منور فرمائے اور اس محبت کی برکت سے ہمارا خاتمہ ایمان پر ہو۔

داعی الی اللہ حضرت مولانا طارق جمیل حفظہ اللہ

”میں نے آپ کی کتاب پڑھی اور بالاستیعاب پڑھی، مجھے کتب ملتی رہتی ہیں، لیکن مجھے کسی ہدیے سے اتنی مسرت نہیں ہوئی، جتنی آپ کے اس ہدیے سے ہوئی، واللہ میرے پاس الفاظ نہیں کہ اپنی قلبی مسرت کا اظہار کر سکوں۔ اس میں آپ نے جتنی جان کھپائی ہے، دکھائی دے رہی ہے، اتنی محنت ہو نہیں سکتی، جب تک دل جذبہ مودت سے لبریز نہ ہو۔“

اس کتاب کا اسلوب انوکھا، زبان سادہ اور شگفتہ اور مباحث نہایت عمدہ ہیں، اس میں حکمت اور استدلال کے ساتھ دعوت اور نصیحت ہے، اپنے تعلیمی اور تدریسی دور میں، لصاب میں شامل نہ ہونے کی وجہ سے، مجھے مناقب اہل بیتؑ پڑھنے کا موقعہ نہیں ملا، لیکن دعوت و تبلیغ کے نبوی کام سے جڑنے کے بعد جب مطالعہ کیا تو یہ حقیقت کھلی کہ اہل بیتؑ صرف ہماری عقیدت نہیں، ہمارا عقیدہ ہیں، جس دل میں اُن کی مودت نہیں، اُس میں ایمان نہیں، اس معرفت کے بعد میں نے غفلت میں بیتے ہوئے ایام کے لیے استغفار کیا اور ذکر اہل بیتؑ کا اہتمام کیا۔

زیر نظر کتاب کے مطالعہ سے مقام اہل بیتؑ کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور قلوب میں ان کی مودت پیدا ہوتی ہے۔ غور کیجیے تو اس سلسلے میں تمام فتنوں کا تریاق یہی معرفت اور مودت ہے، اس لیے میری رائے میں ہر شخص کو اس کتاب کا مطالعہ کرتے رہنا چاہیے، خود مجھے اس کتاب کے مضامین سے بہت تقویت ملی۔“

حضرت مولانا حافظ عبدالرشید ارشدؒ (مکتبہ رشیدیہ، لاہور)

”مشفق محترم مولانا حافظ ظفر اللہ شفیق نے زیر نظر کتاب لکھ کر باطل کو بے نقاب کیا ہے اور فرض کفایہ ادا کیا ہے انداز تحریر شستہ اور شائستہ ہے، میں نے کئی مقامات سے کتاب سنی، سچی بات ہے مجھے رشک آیا،“

ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی حفظہ اللہ

(سابق پروفیسر بن غازی یونیورسٹی، لیپیا۔ امام ابن سعود اسلامک یونیورسٹی، ریاض، کراچی یونیورسٹی)

”ایک عمدہ تصنیف جس کے بعض مقامات پڑھ کر میری آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ آپ نے جو کچھ لکھا ہے بڑے خلوص قلب اور جذبہ صادق سے لکھا ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو واقعی نسبت اہل بیتؑ عطا فرمائی ہے، آپ کی کتاب کی امتیازی صفت میرے نزدیک یہی ہے کہ اس کے مطالعہ سے اہل بیت اطہارؑ کے ساتھ جذبہ محبت بیدار ہوتا ہے۔ آپ کے مصادر بہت کافی اور خوب ہیں۔“

حضرت مولانا زاہد الراشدی حفظہ اللہ

(جنرل سیکرٹری پاکستان شریعت کونسل، گوجرانوالا)

”اہل بیتؑ سے مودت ہمارا ایمان ہے بلکہ ہماری شان ہے۔ حافظ ظفر اللہ شفیق ہمارے فاضل دوست ہیں اور اس حوالہ سے بہت حساس مزاج رکھتے ہیں۔ افراط و تفریط کے ماحول میں انہوں نے قرآن، حدیث، تاریخ اور دانش کی روشنی میں اہل بیتؑ کا مقام بیان کرتے ہوئے اہل حق کا موقف اور اپنے جذبات کا نہایت خوبی ساتھ اظہار کیا ہے۔“

حضرت مولانا محمد انور اوکاڑوی حفظہ اللہ (جامعہ خیر المدارس، ملتان)

”زہر نظر کتاب میں دور حاضر کے ناصبیوں کے تمام دوسوسوں کا حل صرف قرآن و حدیث سے نہیں بلکہ تاریخ کی معتمد علیہ روایات سے پیش کیا گیا ہے اور پھر عقل و دانش سے اور قرآن مجید کے علاوہ کتب سادہ سے بھی اکابر کے مسلک کے حق ہونے اور نواصب کے شبہات کے باطل ہونے کو اجاگر کیا گیا ہے۔ یہ کتاب زہر ناصبیت کے لیے تریاق ہے۔ اہل السنۃ والجماعۃ اس کتاب کے مطالعہ سے نہ صرف خود مطمئن ہوں گے بلکہ باطل کا مقابلہ کر سکیں گے۔“

حضرت مولانا محمد اسحاق سلفی حفظہ اللہ (فیصل آباد)

”واللہ میں دل سے آپ کے لیے دعا کرتا ہوں، شکر ہے اہل حق میں سے کوئی تو امام مظلومؑ کی نصرت کے لیے اٹھا۔ ہمارے اسلاف ہمیشہ یزید کو پلید کے لقب سے یاد کرتے تھے، ہائے کم بختی کہ ہمارے اخلاف جادۂ حق سے بھٹک گئے، نواسۂ رسول، جگر گوشہ بتول، علیہم الصلوٰۃ والسلام، کا دامن چھوڑ کر ظالموں کے ساتھ مل گئے، انہیں دنیا کی رسوائی کا ڈر ہے نہ آخرت کی رو سیاہی کا، صم بکم عمی فہم لا یعقلون۔“

ڈاکٹر مفتی ضیاء الحبیب کاظمی صابری حفظہ اللہ

(اتفاق ٹاؤن، ملتان روڈ، لاہور)

”اس عاجز مسکین کی دل کی گہرائی سے آرزو ہے کہ میری ذریت کا ہر فرد، عورت ہو یا مرد، اس کتاب کا گہرا مطالعہ کرے بلکہ مطالعہ کرتا رہے۔“ (مزید کچھ آرا کتاب کے آخر میں)

حرفِ دل

کامیاب وہ ہے، جو سیدھی راہ پالے۔

لیکن سیدھی راہ کون سی ہے؟

ہر شخص اپنی اپنی سوچ کے مطابق اس کا معیار تراشتا ہے۔

ایک معیار ہمیں قرآن مجید نے عطا فرمایا ہے، اور یہی حق ہے، کہ صراط

مستقیم نبیوں، صدیقوں، شہیدوں اور نیکوں کی راہ ہے۔

یہ صراط مستقیم دکھلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے ساتھ

اپنا رسول بھیجا، رسول اللہ ﷺ نے اپنی سنت سے صراط مستقیم واضح کر دی۔

لیکن رسول اللہ ﷺ کو بالآخر اس دنیا سے تشریف لے جانا تھا اور

انسانی حیات کے مسائل یقیناً آپ کے بعد بھی رونما ہونے تھے۔

ان نئی پیچیدگیوں اور تازہ فتنوں میں صراط مستقیم کیا ہوگی؟

رسول اللہ ﷺ نے، قرآن ہی کی روشنی میں، دو طبقوں کی نشاندہی فرمائی:

اہل بیت عظام

اور

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

کہ فتنوں کے دور میں یہ حضرات جس راہ پر چلیں گے، وہی صراط مستقیم ہوگی۔

اہل بیت کے بارے میں فرمایا:

”میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں:

کتاب اللہ

اور

اپنی عمرت، اپنے اہل بیت

یہ دونوں ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔“

نیز فرمایا:

”تمہارے اندر میرے اہل بیت سفینہٴ نوحؑ کی مانند ہیں، جو اس سفینے میں سوار ہو گیا، بچ گیا اور جو پیچھے رہا، ہلاک ہوا۔“

اور صحابہ کرامؓ کے بارے میں ارشاد فرمایا:

”میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں، ان میں سے جس کی بھی اقتدا کرو گے، راہ پا جاؤ گے۔“

نیز فرمایا:

”تم پر لازم ہے کہ میری سنت کی پیروی کرو اور میرے خلفاء کی سنت کی، جو سراپا رشد و ہدایت ہیں۔“

اس لیے اہل بیت اور صحابہ رضی اللہ عنہم دونوں سے محبت اور دونوں کا احترام ہی صراطِ مستقیم اور راہِ نجات ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں، دوسرے بہت سے مسائل کی طرح، اس بارے میں بھی لوگ افراط و تفریط کا شکار ہو گئے، کچھ لوگوں نے اہل بیتؑ پرست و شتم کیا تو کچھ لوگوں نے اُن کے جواب میں صحابہ کرامؓ پر تبرا بھیجا..... حالانکہ خود اہل بیتؑ اور صحابہؓ کا باہم سلوک رحمت و مودت اور تعظیم و تکریم کا تھا، توہین و تنقیص کا نہ تھا.....

ثانی الذکر طبقے کا حال تو مشہور و معروف ہے،

اول الذکر فتنے کی سنگینی کا مجھے چند برس پیشتر احساس ہوا، میں لاہور میں ایک اجتماع میں خطاب کے لیے مدعو تھا، میرے بعد جو صاحب آئے، انہوں نے بڑی ادا سے سیدنا صدیق اکبرؓ اور (نام لیے بغیر) سیدنا علیؓ کے قبول اسلام کا واقعہ بیان کیا اور موازنہ کرتے ہوئے سیدنا علیؓ کے قبول اسلام کا مضحکہ اڑایا۔ مجھے تعجب ہوا

جب اس پر عظمتِ صدیقؐ کے نعرے بلند ہوئے۔

میں نے اُن کے بعد آنے والے ایک نامور خطیب کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ اپنے خطاب میں اس کی تردید کریں، لیکن انہیں علم ہی نہ تھا کہ کیا سانحہ ہو گیا ہے! میں نے اُسی مجلس میں عہد کیا کہ اہل بیتؑ کی شخصیات اور خدمات کی مقدور بھرا شاعت کروں گا اور رسول اللہ ﷺ کی رضا حاصل کروں گا۔

اس حوالے سے مطالعہ شروع کیا تو اہل بیتؑ سے بغض و عداوت رکھنے والوں کا نام تاریخ میں کہیں ناصبی، کہیں خارجی اور کہیں یزیدی پایا۔ اپنے ماحول کا جائزہ لیا تو حیرت ہوئی کہ عوام لاعلمی میں انہیں اہل حق سمجھتے ہیں، شاید کسی ایک طبقے کی تردید میں!

مطالعہ میں کچھ اور وسعت پیدا ہوئی تو معتبر اور نامور شخصیتوں کی تحریروں اور تقریروں میں ناصبی جراثیم پائے، حسن ظن ہے کہ یہ لاشعوری طور پر در آئے۔ چند اقتباسات سپرد قلم ہیں، جن سے اس فتنے کی سنگینی اور گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔

واقعہ مباہلہ تاریخ اسلام میں جہاں حق و صداقت کی برہان ہے وہاں اہل بیتؑ کی عظمت و فضیلت کا بھی نشان ہے، بس یہی چیز ایک صاحب کو گوارا نہ ہوئی، چنانچہ لکھتے ہیں:

”اور یہ واقعہ مباہلہ تو کوئی ایسا بڑا واقعہ بھی نہیں“

جس واقعہ کا قرآن اہتمام سے ذکر فرمائے، اس کے اہم ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے، لیکن لکھتے ہیں:

”اب بتائیے اس واقعہ میں غیر معمولی اہمیت کیا ہے؟“

پھر کوشش کی ہے کہ یہ شرف اور فضیلت اہل بیتؑ کے لیے خاص نہ رہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

”رسول خدا ﷺ اس مباہلہ کے لیے بالکل تیار ہو گئے تھے، یہاں تک کہ قبل از وقت آپؐ نے حضراتِ حسنینؑ اور جناب سیدہ فاطمہ زہراؑ کو مباہلہ میں

شریک کرنے کے لیے بلا لیا تھا، بلکہ بعض روایات میں ہے کہ بعض صحابہ کرامؓ بھی اپنی اولاد کو لے کر آ گئے تھے..... چنانچہ روح المعانی کی روایت میں ہے کہ ”آپؐ نے ابو بکرؓ کو ان کی اولاد کے ساتھ، عمرؓ کو ان کی اولاد کے ساتھ، عثمانؓ کو ان کی اولاد کے ساتھ اور علیؓ کو ان کی اولاد کے ساتھ بلا لیا تھا۔“

میں نے روح المعانی کھولی تو بھونچکا رہ گیا، جب یہ پڑھا:

”وهذا خلاف ما رواه الجمهور“ (۱۹۰/۳)

اور جس روایت میں صرف علیؓ و فاطمہؓ اور حسینؓ کو ساتھ لے کر مقابلے میں آنے کا ذکر ہے، اُس کے بارے میں لکھا ہے کہ:

”یہ روایت محدثین کے ہاں قابل اعتماد ہے“ (۱۹۰/۳)

اب اسے کیا کہیے کہ جمہور کے خلاف روایت تو ذکر کی لیکن اس پر علامہ محمود آلوسیؒ کا تبصرہ نقل نہیں کیا اور محدثین کے یہاں قابل اعتماد روایت کو معمولی اور غیر اہم بنا کر پیش کیا۔

مزید کوشش کرتے ہیں کہ اہل بیتؑ کی فضیلت کا دائرہ تنگ ہو جائے، لکھتے ہیں:

”حضرت فاطمہؓ اور حسینؓ کا بلانا تو بلا اختلاف صحیح روایات میں مذکور ہے مگر حضرت علیؓ مرتضیٰؓ کا بلانا اکثر صحیح روایات میں نہیں ہے۔“

اس کے بعد جو روایات ذکر کیں، اُن میں راوی کا اُموی تعصب واضح طور پر جھلک رہا ہے، لیکن انہیں صحیح روایات کے رنگ میں پیش کیا۔

رسول اللہ ﷺ نے امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے بارے میں فرمایا:

”یہ دونوں میرے بیٹے ہیں، میری بیٹی کے بیٹے ہیں۔“ (ترمذی)

آیت مہلبہ نازل ہوئی تو آپؐ نے ”ابناء نا“ کی تفسیل میں حسینؑ ہی کو ساتھ لیا، لیکن لکھا جا رہا ہے:

”ابناء نا سے حضرات حسینؑ مراد لینا لغت عرب اور محاورہ قرآنی

کے خلاف ہے۔“

آیۃ تطہیر نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے اس کی تفسیر میں علیؑ وفا طہؑ اور حسینؑ کریمین کو اہل بیت میں داخل قرار دیا، لیکن لکھتے ہیں:

”اہل بیت زبان عرب میں زوجہ کو کہتے ہیں، اور آیۃ تطہیر میں لفظ اہل بیت سے ازواج نبی ﷺ مراد الہی ہیں، ان کے سوانہ کوئی مراد ہے نہ ہو سکتا ہے!“

لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلیٰ العظیم

ایک صاحب لکھتے ہیں:

”حضرت علیؑ داخل اہل عبا نہیں ہیں اور علوی کو سید نہیں کہہ سکتے.....“

امام حسینؑ ۸ ذی الحجہ کو، جب لوگ حج کے لیے منی روانہ ہو رہے تھے، مکہ سے کوفہ کی جانب روانہ ہوئے، ایک صاحب اس سفر کی حقیقت کو سمجھ نہ سکے اور دلخراش انداز میں لکھا: ”ان سے تو فلاں حکمران کا رویہ بہتر تھا، جو مشکل گھڑی میں مکہ چلا جاتا تھا۔“

ایک اور صاحب لکھتے ہیں:

”میرے خیال میں فضائل اہل بیتؑ کی عوام کو قطعاً ضرورت نہیں“

”ائمہ اہل بیتؑ کے تذکرے کو میں مفاسد کثیرہ، قبیحہ، بدیہہ کی وجہ سے ناجائز سمجھتا ہوں۔“

حالانکہ یہ فضائل قرآن و حدیث میں مذکور ہیں۔

حدیث ثقلین میں اہل بیتؑ کی عظیم منقبت ہے، لیکن عصر حاضر کے ایک علامہ حدیث مذکور کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”انسی تارک فیکم الثقلین میں چونکہ آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو“

وصیت فرمائی ہے، اس لیے وصی رسول صحابہ ہیں نہ کہ اہل بیتؑ!“

”یہ حدیث پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ حضور ﷺ کے نزدیک جانشینی رسول

کا مقام صرف صحابہ کرام کے لیے تھا۔

”یہ پیرایہ بیان بتلا رہا ہے کہ جانشین رسول صحابہ ہی میں سے ہونا تھا، اہل بیت میں سے نہیں۔“

”رہی وصیت، تو وہ یہ تھی کہ قرآن کریم اور اہل بیت تمہارے لیے ماخذ علم ہیں۔ قرآن کریم کا ماخذ علم ہونا ظاہر ہے، اہل بیت کو دوسرے درجے میں رکھا گیا، معلوم ہوا کہ یہ بھی ماخذ علم ہیں نہ کہ ایوان اقتدار!“

دیکھیے کتنی چابکدستی سے حضرت علیؑ کی خلافت کو وصیت نبوی کے خلاف قرار دے کر انہیں خلافت کے لیے نااہل ثابت کیا گیا ہے۔

چنانچہ اسی حوالے سے مزید لکھتے ہیں:

”حضرت عمرؓ نے جو خلافت کمیٹی بنائی، اُس میں سعیدؓ بن زید کو عشرہ مبشرہ میں داخل ہونے کے باوجود شامل نہیں فرمایا، اس لیے کہ یہ حضرت عمرؓ کے چچا زاد بھائی تھے اور رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا زاد بھائی کو خلیفہ نہیں بنایا، تو آپؐ کے پیش نظر سنت نبوی کی پیروی تھی۔“ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ایک اور صاحب حضرت علیؑ کی سیرت اور فضیلت بیان کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں:

”اگر چہ آپؐ اپنی ذاتی حیثیت میں خلیفہ راشد تھے، لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ آپؐ کے عہد خلافت میں باہم اختلاف رہا، امت آپؐ کی خلافت پر مجتمع نہ ہو سکی۔“

ایک اور صاحب بھی یہی بات لکھتے ہیں:

”چوتھے خلیفہ بلا شک خلیفہ راشد تھے، لیکن وہ امت کی قیادت بلا اختلاف نہ کر سکے۔“

یعنی پوری کوشش ہے کہ کسی طرح حضرت علیؑ اور اہل بیتؑ کی شخصیات کو گہنایا

جائے اور انہیں اُن کے مقام سے گرایا جائے۔

یہ ٹو تحریریں ہیں، تقریروں کا حال اس سے بھی بدتر دیکھا، تقریروں میں پہلے تینوں خلفاء راشدینؑ کا ذکر بڑے احترام اور بہت جوش سے، پھر حضرت علیؑ کا ذکر محض برائے وزن بیت، اور وہ بھی جھگڑوں کا حوالہ، فوراً بعد حضرت معاویہؓ کی خلافت کا تذکرہ اس زوردار انداز سے کہ خلافتِ راشدہ کا دور بھی اس کے سامنے ماند نظر آئے۔

ایک مرتبہ تو غضب ہی ہو گیا، ایک مذہبی انجمن کے رفاہی منصوبے کی تقریبِ اساسی تھی، بڑے بڑے علماء سنیج پر موجود تھے، ایک عالم، جو پیرِ طریقت بھی ہیں، آخری خطاب کے لیے تشریف لائے اور موجودہ سیاسی حالات کے پس منظر میں ظالم کے خلاف جدوجہد کے حوالے سے اپنے خطاب کا اختتام اس لطیفے پر کیا:

ایک شاہ جی کے بیٹے نے کسی غریب کے بیٹے کو بری طرح مارا، بیٹے نے باپ کو شکایت کی، اس نے صبر کی تلقین کی، اُس نے دوسرے دن، تیسرے دن پھر مارا، لیکن وہ غریب صبر کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔

کچھ عرصے کے بعد شاہ جی زیارات کے لئے روانہ ہونے لگے تو محلے کے دوسرے لوگوں کے ساتھ اس غریب سے بھی ملنے آئے، اخلاقاً پوچھا: تمہارے لیے کیا تحفہ لاؤں؟

اُس غریب نے کہا: یزید کا کوئی بیٹا مل جائے تو لے آئیے، باقی کام میں خود کر لوں گا!

مجھے حیرانی ہوئی کہ سب علماء اس 'لطیفے' سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور داد دے رہے تھے، کسی نے نہ سوچا کہ اس لطیفے میں امام حسینؑ کی کیا توہین کی گئی ہے؟ کس طرح ظالم کو مظلوم اور مظلوم کو ظالم بنا کر پیش کیا گیا ہے؟

غضب یہ کہ تقریب کے اختتام پر اس لطیفے کی ریکارڈنگ دوبارہ، سہ بارہ سنوائی گئی۔

اس پر میں نے اُن صاحب سے عرض کیا: آپ نے لطیفے کے رنگ میں
ناصبی اور یزیدی جراثیم پھیلانے، نہایت افسوس!

اور ان علماء پر بھی افسوس جو خاموشی سے بیٹھے سنتے رہے!

فرض کیجئے آج یہود کے ظلم و ستم سے مسلمان پریشان ہیں، کوئی ستم رسیدہ یہ
کہے: فرعون کا کوئی بیٹا تلاش کرو، جو ان کا دماغ درست کرے۔ یقیناً آپ اُس کے
خلاف تو ہیں انبیاء علیہم السلام کا فتویٰ صادر کریں گے۔

کسی شخص کو کسی کے پیر و مرشد کے خاندان کے کسی فرد سے تکلیف پہنچے اور وہ
یہ کہے: اُس انگریز کا کوئی بیٹا تلاش کرو جس نے آپ کے پیر کو برف کی سلوں پر لٹایا
تھا، اُس پولیس افسر کا بیٹا ڈھونڈ کر لاؤ جس نے مرشد پر تشدد کیا تھا۔

مجھے یقین ہے یہ بات سن کر پورے حلقہ صوفیاء میں کھلبلی مچ جائے گی اور
اُسے توہینِ اولیاء کا مرتکب قرار دیا جائے گا۔

لیکن امام الاولیاء امام حسینؑ کی آپ توہین کرتے ہیں، سنتے ہیں، امام حسینؑ
کی عظیم قربانی کو آپ لطیفوں میں اڑاتے ہیں، لیکن کوئی تڑپ، کوئی کسک دکھائی نہیں
دیتی، کسی جبین پر تشکن نہیں پڑتی..... وجہ یہ ہے کہ ہماری جماعت میں یزیدی جراثیم
بہت گہرے سرایت کیے ہوئے ہیں، صحابہ کرامؓ کی توہین کے بارے میں تو ہم بہت
حساس ہیں، لیکن اہل بیتؑ کی توہین کی ہمیں خبر تک نہیں ہوتی۔

☆ اہل بیتؑ کی خدمت اور نصرت کا آغاز امام حسینؑ کی شخصیت اور واقعہ کربلا
کے تذکرے سے کر رہا ہوں کہ حال ہی میں اس بارے میں کچھ کتابیں شائع ہوئیں،
جن سے بہت گمراہی پھیلی۔

ابتدا میں میرا ارادہ واقعہ کربلا کے حوالے سے اکابر علماء اور اہل دانش کے
بہترین مقالات اور خیالات جمع کرنے کا تھا، چنانچہ جمع کر لیے گئے، کمپوزنگ بھی ہو گئی،
خیال آیا کہ دس پندرہ صفحات کا ایک مقالہ خود بھی لکھوں کہ انصار میں شمار ہو جاؤں۔

لکھنا شروع کیا تو امام حسینؑ اور کربلا کی نئی نئی جہات روشن ہوتی گئیں، حقائق بولنے لگے، وثائق دکنے لگے، شبہات کے جوابات آنے لگے اور یوں یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا، اب ضخامت اتنی ہو چکی تھی کہ اسے ایک جلد بنانا دشوار تھا، مشورہ ہوا کہ یہ تمام مواد دو مستقل ناموں سے شائع ہو، چنانچہ مجموعہ مقالات انشاء اللہ ”معارف کربلا“ کے نام سے شائع ہوگا۔

☆ زیر نظر کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے:

(۱) واقعہ کربلا

(۲) اسرار کربلا

(۳) تاریخ کربلا

ان ابواب کے بارے میں کچھ باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

(۱) مقتل الحسینؑ کے عنوان سے قدیم و جدید بہت سی کتابیں موجود ہیں، جن میں راویوں نے اس واقعہ ہائلہ کو ایسے انداز میں بیان کیا ہے اور ایسی ایسی باتیں اس میں شامل کر دی ہیں، جن سے اس عظیم الشان قربانی کا اصل مقصود دب گیا اور غیر مقصود میں لوگ الجھ گئے۔

حال ہی میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے ”تحریفات واقعہ کربلا“، یہ دراصل مشہور ایرانی عالم استاد شہید مرتضیٰ مطہری کی چند مجالس ہیں، جو ”ادارہ احیاء تراث اسلامی، کراچی“ نے غنفر حسین بخاری کے اردو ترجمے میں شائع کی ہیں، اس میں استاد مرتضیٰ فرماتے ہیں:

”آج اگر کوئی مصائب امام مظلومؑ بیان کرنا چاہے تو اُسے چاہیے کہ اُن جدید مصائب کا ذکر کرے اور اُس ظلم پر آنسو بہائے جو غلط اور جھوٹی روایات آپ سے منسوب کر کے خود آپ کے منبر سے آپ پر ہو رہا ہے، کیونکہ یہ کربلا میں آپ پر ہونے والے یزیدی مظالم سے کہیں بڑا ہے۔“ (ص: ۲۵)

”حادثہ کربلا میں جو کچھ بھی تحریف ہوئی ہے، بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ دوستوں ہی کے ہاتھوں ہوئی ہے۔“ (ص: ۳۸)

”عاشوراء کے تاریخی حادثے میں، جس کے قوی محرکات بھی ہیں اور بلند اہداف بھی، ہم مسلمانوں نے، شیعیان حسینؑ ابن علیؑ نے جی بھر کر تحریفیں کی ہیں۔“ (ص: ۷۶)

”ہمارے اس طرز فکر اور انداز استدلال نے واقعہ کربلا کی افادیت کھودی“ (ص: ۸۶)

اس المناک صورت حال کی وجہ سے اس کتاب میں واقعہ کربلا کے لیے عمار الدہنی کی روایت سے امام باقرؑ کا بیان شامل کیا جا رہا ہے:

□ ایک تو اس لیے کہ یہ روایت مختصر ہے اور ہمارے پیش نظر اس کتاب میں واقعہ کربلا کی تفصیلات نہیں، بلکہ معارف و اسرار کا اظہار اور شبہات کا ازالہ ہے۔

□ دوسرے اس لیے کہ یہ روایت مستند بھی ہے۔ بیان امام ابو جعفر محمد الباقرؑ کا، جن کے گھر یہ سانحہ رونما ہوا، اور ان سے روایت کر رہے ہیں ابو معاویہ عمار بن معاویہ الدہنی البجلی الکوفی، طبقہ خامسہ کے محدث ہیں، اور بخاری کے علاوہ صحاح خمسہ کے راویوں میں سے ہیں۔ (تقریب التہذیب: ۱۵۲)

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ آپ کے بارے میں فرماتے ہیں: ”صدوق یتشیع“ یعنی بہت سچا راوی تھا اور شیعہ تھا۔ (تقریب: ۱۵۲)

آپ کے تشیع کا اعتدال اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابن معاویہ بھی ہیں اور ابو معاویہ بھی! اس لیے آپ کی روایت معتمد ہونے کے ساتھ قابل وقعت بھی ہے۔

عمار الدہنی کی یہ روایت ابن جریر طبریؒ نے اپنی تاریخ میں بیان کی ہے، اور انداز یہ ہے کہ روایت کے اجزاء مختلف صفحات میں بکھرے ہوئے ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے الاصابة فی تمییز الصحابة میں ان اجزاء کو جمع کیا ہے اور آخر میں لکھا ہے:

ترجمہ: ”متقدمین کی ایک جماعت نے مقتل حسینؑ کے بارے میں کئی کتابیں لکھی ہیں، جن میں رطب و یابس بھرا ہوا ہے، لیکن یہ روایت جو میں نے بیان کی ہے، ان تصانیف سے بے نیاز کر دیتی ہے۔“ (الاصابہ: ۱۷/۲)

ہم نے روایت اصل ماخذ تاریخ طبری سے لی ہے اور ترجمہ، ایک خاص مصلحت سے، پروفیسر سید ابوبکر غزنویؒ، سابق وائس چانسلر، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور، کا لیا ہے، ترجمے کو اصل ماخذ کی روشنی میں دقت نظر سے پڑھا، کہیں کہیں ترمیم و تصحیح کی ضرورت محسوس ہوئی، کچھ عنوانات بڑھائے اور چند وضاحتی قوسیں لکھے۔

(۲) اسرارِ کربلا کچھ مختصر اور کچھ مفصل مقالات کا مجموعہ ہے، ان مقالات میں اہل بیتؑ کا مقام، واقعہ کربلا کے اسرار و مقاصد اجاگر کیے گئے ہیں اور اعتراضات کے جوابات دیے ہیں۔

ان مقالات کے لیے میں نے اصل مآخذ کو کھنگالا، واقعات کے اسباب و علل پر طویل غور و فکر کیا اور نتائج تک پہنچا، بہت دفعہ ایسا بھی ہوا کہ میں ایک رائے قائم کر لیتا، بعد میں مجھے سید محمود آلوسیؒ، ملا علی قاریؒ، ابن حجر عسقلانیؒ، جلال الدین سیوطیؒ جیسے جلیل القدر علماء سے اس کی تائید ملتی تو مجھے انتہائی قلبی مسرت ہوتی کہ میں ٹھیک راہ پر چل رہا ہوں اور میں سرایا تشکر بن کر اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہو جاتا ان تائیدات کو میں موذتِ اہل بیتؑ کا فیض سمجھتا ہوں!

ان مقالات میں میں نے جن لوگوں کی فکری غلطی کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے، ان کی کتابوں کے حوالوں سے قصداً گریز کیا ہے..... اگرچہ میرے پاس ان حوالوں کا تمام ریکارڈ محفوظ ہے..... اس لیے کہ میرا مقصد مناظرہ و مجادلہ نہیں، اصلاح اور نصیحت ہے۔ نام لینے سے کچھ لوگ شخصیت میں الجھ جاتے ہیں، چنانچہ بات بے اثر اور سعی بے ثمر رہ جاتی ہے۔ اس لیے میں نے صرف شبہات کا ذکر کیا ہے، شخص اور

کتاب کا حوالہ نہیں دیا۔

(۳) تاریخ کربلا میں کربلا کی جغرافیائی اور عمرانی تاریخ بیان کی گئی ہے، کربلا کی وجوہ تسمیہ ذکر کی گئی ہیں اور تغیراتِ زمانہ کا تذکرہ ہے۔

☆ واقعہ کربلا کو سمجھنے میں جن لوگوں نے ٹھوکر کھائی اور شبہات کی دلدل میں دھنسے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہوئی کہ ان لوگوں نے امام حسینؑ اور ان کے موقف اور واقعہ کربلا کو، قرآن و حدیث چھوڑ کر، صرف تاریخ کی نگاہ سے پڑھا۔

اگر قرآن مجید کی آیات اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث کی روشنی میں اہل بیتؑ کا مقام ذہن میں رکھ کر اس واقعہ کا مطالعہ کیا جائے تو کوئی الجھن پیدا نہیں ہوتی۔

☆ کسی بھی کتاب کا مقصد اُس کے مجموعی تاثر سے واضح ہوتا ہے، جس کتاب کے مطالعہ سے امام حسینؑ اور اہل بیتؑ کے بارے میں ذہن میں شکوک کلبلانے لگیں، دل شبہات کی آماجگاہ بن جائے اور اہل بیتؑ کا مقام ہلکا نظر آئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب امام حسینؑ کو دوبارہ قتل کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، خواہ اس میں احترام کے کتنے ہی الفاظ استعمال کیے گئے ہوں۔

اس موضوع پر لکھی گئی اکثر کتابوں کا معاملہ یہی ہے۔ کسی مصنف کا دل بغض و عناد سے لبریز ہوتا ہے، کوئی ماڈرن اور روشن خیال کہلوانے کے جنون میں مبتلا ہوتا ہے، عوامی رد عمل کی وجہ سے کھل کر اس کا اظہار تو کر نہیں سکتے، اس لیے حروف شرط و تعوذ کے پردے میں کردار کشی کرتے ہیں۔

ایسے مصنفین اور ایسی کتابوں کے ناشرین قیامت کے دن قاتلینِ امام حسینؑ میں شمار ہوں گے اور رسول اللہ ﷺ کے مدِّ عالیہ ہوں گے۔

☆ زیرِ نظر موضوع پر میں نے بہت سال پہلے کام شروع کیا تھا، لیکن کیا کیجیے ملازمت اور تحقیق و تخلیق کے مزاج میں ہم آہنگی نہیں ہے، اس کے ساتھ رہیں ستم

ہاے روزگار بھی رہا، اس لیے تاخیر ہوئی اور بہت ہوئی۔ لیکن جو لکھا، یقین سے لکھا، شرح صدر سے لکھا، اس اطمینان کے مقابلے میں تاخیر کا مجھے کوئی افسوس نہیں..... تاخیر کے حوالے سے احباب کی محبت بھری باتیں بھی سنتا رہا اور انہیں دعا دیتا رہا کہ ان باتوں سے مجھے اپنی منزل یاد رہی۔

☆ میں نے یہ تمام کاوش ایک امید میں اور ایک مقصد کے لیے کی ہے۔

امید تو یہ کہ اس خدمت کے صدقے میں میرا خاتمہ ایمان پر ہو اور مجھے اللہ کی رحمت یہ بھی امید ہے کہ جو بھی حسن نیت سے یہ کتاب پڑھے، سنے گا، اس کا خاتمہ ایمان پر ہوگا۔

حدیث شریف ہے کہ ”اس دنیا میں جس سے محبت ہوگی، آخرت میں انسان اُسی کے ساتھ ہوگا۔“

اور مقصد یہ کہ قبول حق کا جوہر اگر ابھی فنا نہیں ہوا، دل کی زمین ابھی نرم ہے تو یہ داستانِ حق شاید بھٹکے ہوؤں کو صراطِ مستقیم پر لے آئے اور جو صراطِ مستقیم پر چل رہے ہیں، وہ شرح صدر کے ساتھ چلتے رہیں۔

☆ میری زندگی کی کتنی راتیں کربلا کو سمجھنے میں بسر ہوئیں
کتنی صبحیں اسی پر غور و فکر کرتے گزریں
کتنی شامیں نورِ مودت سے روشن ہوئیں
کچھ معلوم نہیں

محبت کے شب و روز کا حساب کون رکھ سکتا ہے!
اور رکھنا بھی نہیں چاہیے کہ یہی حاصلِ زندگی ہیں!
اس دوران میں خود میں کتنے ہی مصائب سے گذرا
اپنوں کے ہاتھوں کتنی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا
ایسے دل شکن حالات میں جانتے ہو

کس نے میری دلداری کی؟
کس نے میری ڈھارس بندھائی؟
کربلانے!

میں جتنا سوچتا گیا، کربلا کا افق وسیع ہوتا گیا
کوئی سا انفرادی یا اجتماعی مسئلہ درپیش ہوا، کربلا سے رہنمائی ملی
حقیقت یہ ہے کہ میدان کربلا اب صرف ایک میدان نہیں ہے
درسگاہ حیات ہے

واقعہ کربلا ایک واقعہ نہیں، انقلاب ہے
اور حسینؑ امام انقلاب ہیں۔

☆ اس اظہار میں کوئی مضائقہ نہیں کہ یہ کتاب تقریباً حالت اعتکاف میں لکھی
گئی اور اس ڈیسک پر لکھی گئی، جس پر چالیس سال قرآن مجید کی تلاوت ہوتی رہی۔
یہ توفیق بھی اہل قرآنؑ سے مودت کا عطیہ ہے!

☆ یہاں ایک خبر کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے:

”عاشوراً پر کربلا اور بغداد میں بم دھماکوں میں اسرائیلی انٹیلی جنس موساد کا
ہاتھ ہے، مقصد شیعہ، سنی فسادات بھڑکانا اور عراق کی سیاسی و اقتصادی طاقت کا خاتمہ
ہے..... فرقہ وارانہ فسادات اسرائیل اور امریکہ منصوبے کا حصہ ہیں، جن سے امریکہ
اور اسرائیل اپنے مفادات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔“

(نوائے وقت، لاہور، ۸ مارچ ۲۰۰۳ء، سوموار، عرب اخبارات کے حوالے سے)

اس وقت پاکستان میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ بھی اسی منصوبے کا حصہ ہے۔
سورۃ آل عمران سے واضح ہوتا ہے کہ یہود کی یہ سازشیں حضور اکرم ﷺ کے
دور ہی میں شروع ہو گئی تھیں، اور آج تک جاری ہیں، اور اس فساد کا فائدہ سنی کو ہو رہا
ہے نہ شیعہ کو، صرف لادینی عناصر اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

کاش اہل بیتؑ اور صحابہ کرامؓ کے نام لیوا اس حقیقت کو سمجھ جائیں اور اس مبارک ہستیوں کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں الفت و محبت کا نور پھیلائیں!

☆ اُن تمام بزرگوں اور دوستوں کا صمیم قلب سے شکریہ، جن کی دعائیں میری حوصلہ افزائی کرتی رہیں اور جن کے مشورے مجھے آسانی اور آسودگی بخشتے رہے۔

بالخصوص حضرت مولانا ظفر احمد قادری اور مولانا حافظ عبدالرشید ارشد کے لیے سپاس گزار ہوں کہ انہوں نے تحریر اس خدمت کی تقریظ و تحسین فرمائی۔

اور اپنی بیٹیوں عافیہ اور عائشہ کے لیے دعائے موڈت کہ وہ مجھے اس کام کی تکمیل کے لیے اُکساتی رہیں۔

حافظ ظفر اللہ شفیق

شعبۂ اسلامیات، ایچی سن کالج، لاہور

۸/ رمضان المبارک ۱۴۲۵ھ

خطیب مسجد خالد، کیولری گراؤنڈ، لاہور

۲۳/ اکتوبر ۲۰۰۴ء، ہفتہ

مدیر ادارہ صراطِ مستقیم

رکن رابطہ ادب اسلامی عالمی، پاکستان

إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ لَيْسَ لِمَنْ لَوْقَعَتِهَا كَاذِبَةٌ
خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ

واقعہ کربلا

ایک قیامتِ صغریٰ

اس واقعہ نے کتنوں کو پست اور کتنوں کو سر بلند کیا!

بیان

امام ابو جعفر محمد الباقر بن امام علی زین العابدین

بن امام حسین سلام اللہ ورضوانہ علیہم

روایت

عمار الدہنی

محمد بن جریر طبریؒ کہتے ہیں کہ مجھے زکریا بن یحییٰ الضریر نے بیان کیا،
 انہوں نے کہا: ہمیں احمد بن جناب المصیسی نے بیان کیا،
 انہوں نے کہا: ہمیں خالد بن یزید بن اسد بن عبداللہ القسری نے بیان کیا،
 انہوں نے کہا: ہمیں عمار الدہنی نے بیان کیا کہ میں نے (امام حسینؑ کے
 پوتے) ابو جعفرؒ (محمد الباقرؒ) کی خدمت میں عرض کی کہ آپ شہادت حسینؑ کا نقشہ
 میرے سامنے اس طرح کھینچیں گویا میں خود وہاں موجود تھا!

امام حسینؑ سے بیعت کا مطالبہ ہوتا ہے
 اور آپؑ مکہ کی جانب ہجرت کرتے ہیں
 ابو جعفرؒ نے فرمایا:

”معاویہؓ فوت ہو گئے، مدینہ کا والی اُس وقت ولید بن عتبہ بن ابوسفیانؓ
 (امیر معاویہؓ کا بھتیجا اور یزید کا چچا زاد بھائی) تھا، اس نے حسینؑ بن علیؑ کی طرف
 بیعت لینے کی غرض سے قاصد بھیجا،

آپؑ نے فرمایا: ”مجھے سوچنے کی مہلت دو اور جلدی نہ کرو“
 ولید نے ان کو مہلت دے دی، اسی اثنا میں آپؑ مکہ تشریف لے آئے،

اہل کوفہ پیام بھیجتے ہیں

کوفہ والے ان کے پاس آئے اور بعض نے قاصدوں کے ہاتھ پیغامات
 بھیجے کہ ”ہم نے آپؑ کی خاطر اپنے آپ کو بیعت سے روک رکھا ہے، ہم یزید کے والی

کے پیچھے جمعہ نہیں پڑھتے ہیں، آپ ہمارے پاس تشریف لے آئیے۔“
کوفہ کے والی اُس وقت نعمانؓ بن بشیر انصاری تھے۔

مسلمؓ کوفہ روانہ ہوتے ہیں

حسینؓ نے اپنے چچا زاد بھائی مسلمؓ بن عقیل بن ابی طالب سے فرمایا کہ: ”تم کوفہ جاؤ اور حالات کا جائزہ لو، اگر ان کے بیانات سچے ہیں تو ہم کوفہ جائیں گے۔“
مسلمؓ روانہ ہوئے اور مدینہ پہنچے، وہاں سے دور راہبر ساتھ لیے جو انہیں ریگستانی علاقہ سے لے گئے، راستے میں انہیں پیاس لگی اور راہروں میں سے ایک پیاس کی وجہ سے جان بحق ہو گیا، مسلمؓ نے حسینؓ کو خط لکھا کہ مجھے اس خدمت سے سبکدوش کر دیا جائے، مگر حسینؓ نے انہیں جواب دیا کہ آپ کوفہ جائیے۔
مسلمؓ کوفہ روانہ ہوئے اور وہاں پہنچ کر اہل کوفہ میں سے ایک شخص کے ہاں قیام کیا جس کا نام (مسلم) ابن عوسجہ (اسدی) تھا۔

باشندگان کوفہ کی بیعت

باشندگان کوفہ کو جب ان کی آمد کی خبر ملی تو وہ ان کے پاس چوری چھپے آتے اور ان کے ہاتھ پر (امام حسینؓ کے لیے) بیعت کرتے حتیٰ کہ کوفہ کے بارہ ہزار باشندوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

نعمانؓ بن بشیر کی حق گوئی و معزولی

یزید کے ہوا خواہوں میں سے ایک شخص (عبید اللہ بن مسلم بن شعبہ الحضری۔ تہذیب التہذیب: ۲/۳۴۹) نعمانؓ بن بشیر کے پاس گیا اور کہا: یا تو تُو سچ مچ کمزور ہے یا بن رہا ہے، ملک میں فساد پھیلا ہوا ہے!“

نعمانؓ نے اس سے کہا: اُس قوت سے جس میں خدا سے سرکشی ہو، مجھے وہ کمزوری عزیز تر ہے جو مجھے خدا کے حلقہ اطاعت سے باہر نہیں کرتی اور میں ایسا نہیں

کہ جس کا اللہ نے پردہ رکھا ہے میں اس کا راز افشا کروں۔“

اس شخص نے نعمانؑ کی یہ بات یزید کو لکھ بھیجی۔ یزید نے اپنے آزاد کردہ (مسیحی) غلام سرجون کو بلایا، جس سے وہ مشورہ لیا کرتا تھا، اسے حالات سے آگاہ کیا۔ سرجون نے کہا: اگر معاویہؓ زندہ ہوتے تو کیا آپ اُن کا مشورہ قبول کرتے؟ یزید نے کہا: ہاں!

اس نے کہا: تو میرا یہ مشورہ قبول کیجئے کہ کوفہ کا والی بھی ابن زیاد کو بنا دیجئے، کوفہ کے لیے ابن زیاد ہی موزوں ہے۔“

یزید ان دنوں ابن زیاد سے خفا تھا اور بصرہ کی گورنری سے بھی اسے معزول کرنے کا قصد کر رہا تھا..... (لیکن اس مسیحی مشورے کے بعد) یزید نے ابن زیاد کو خط لکھا جس میں اُس سے خوشنودی کا اظہار کیا اور اسے لکھا کہ ”ہم بصرہ کے ساتھ کوفہ کا بھی تجھے والی بناتے ہیں، مسلم بن عقیلؓ کو تلاش کرو، اگر وہ مل جائے تو اسے قتل کر دو“ ابن زیاد کی کوفہ میں آمد

ابن زیاد بصرہ کے کچھ سرداروں کی معیت میں کوفہ آیا، اس نے ڈھانٹا باندھ رکھا تھا، وہ جس مجلس کے پاس سے بھی گزرتا، سلام کرتا تو لوگ اسے جواب میں کہتے: ”علیک السلام یا ابن بنت رسول اللہ“ اے دختر رسولؐ کے فرزند تجھ پر سلام ہو!..... وہ سمجھ رہے تھے کہ حسین بن علیؑ تشریف لے آئے ہیں..... حتیٰ کہ ابن زیاد قصر امارت میں پہنچ گیا۔

مسلم بن عقیلؓ کی تلاش

اس نے اپنے ایک آزاد کردہ غلام (معقل۔ طبری: ۳۶۲/۵) کو تین ہزار درہم دیے اور اس سے کہا: جاؤ اور اس شخص کو دریافت کرو جس کے ہاتھ پر کوفہ والے بیعت کر رہے ہیں اور اس پر یہ ظاہر کرو کہ تم حمص کے باشندے ہو اور بیعت کی غرض سے

حاضر ہوئے ہو اور یہ رقم دے کر اس کی مالی حالت بھی مضبوط کرنا چاہتے ہو۔“

وہ غلام بڑی احتیاط سے کھوج میں لگا رہا حتیٰ کہ وہ کوفہ کے اُس بوڑھے آدمی (مسلم ابن عوجہ، طبری: ۳۶۲/۵) کے پاس پہنچ گیا جو بیعت حسینؑ کے سلسلے میں کام کر رہے تھے۔ اُس نے شیخ سے بات کی تو انہوں نے کہا: تم سے مل کر مجھے خوشی بھی ہوئی ہے اور افسوس بھی، خوشی اس بات کی ہے کہ خدا نے تمہیں سیدھی راہ دکھائی ہے، مگر افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے کام کو ابھی تک استحکام میسر نہیں آیا۔ پھر شیخ اُسے مسلمؑ کے پاس لے گئے، مسلمؑ نے رقم اس سے قبول کر لی اور اسے بیعت بھی کر لیا۔ وہاں سے وہ ابن زیاد کے پاس واپس آیا اور سارا ماجرا سنایا۔ جب ابن زیاد اُس گھر تک پہنچا، جہاں مسلمؑ قیام فرماتے تھے، آپؑ ہانی بن عروہ مرادی کے مکان میں منتقل ہو چکے تھے اور حسین بن علیؑ کو پیغام بھیج چکے تھے کہ کوفہ کے بارہ ہزار باشندے بیعت کر چکے ہیں، آپ تشریف لے آئیے۔

ہانی بن عروہ کی گرفتاری

ابن زیاد نے سردار ان کوفہ سے کہا: کیا بات ہے کہ اور لوگوں کے ساتھ ہانی بن عروہ مجھے ملنے کے لیے نہیں آئے!

اس پر محمد بن اشعث اپنے قبیلے کے چند آدمیوں کے ہمراہ ہانی بن عروہ کے پاس گیا، وہ اُس وقت اپنے گھر کے دروازے پر کھڑے تھے۔ ان لوگوں نے کہا: امیر آپ کا ذکر کر رہے تھے اور ملاقات میں تاخیر کی شکایت کر رہے تھے، آپ کو ان کے پاس جانا چاہئے۔

ان لوگوں کے اصرار پر ہانی بن عروہ سوار ہو کر ابن زیاد کی طرف روانہ ہوئے، وہ سب لوگ بھی آپ کے ساتھ ساتھ چلتے رہے حتیٰ کہ آپ ابن زیاد کے پاس پہنچ گئے۔ قاضی شریحؒ بھی اس وقت ابن زیاد کے پاس موجود تھا۔ ابن زیاد کی نظر جو ہانی پر پڑی تو اس نے شریحؒ سے کہا: ”اس احمق کو اس کی قضا ہمارے پاس کھینچ لائی ہے“

ہانی نے سلام کیا، ابن زیاد بولا: ہانی! مسلم کہاں ہے؟
انہوں نے کہا: مجھے کچھ خبر نہیں۔

ابن زیاد نے کہا: غلام کو حاضر کیا جائے۔

غلام کو دیکھ کر ہائی کو خاموش ہونا پڑا۔ آپ نے ابن زیاد سے کہا: خدا کی سنوار ہوا میر پر! میں نے انہیں اپنے گھر نہیں بلایا تھا بلکہ وہ خود تشریف لائے اور اپنا آپ میرے حوالے کر دیا۔

ابن زیاد نے کہا: اسے میرے پاس حاضر کرو۔

ہانی کہنے لگے: خدا کی قسم اگر وہ میرے پاؤں کے نیچے بھی ہوتے تو میں ان پر سے قدم نہ اٹھاتا۔

ابن زیاد نے حکم دیا کہ ہانی کو میرے قریب کرو۔ لوگ ہانی کو قریب لے گئے تو ابن زیاد نے ان کے ابرو پر چھڑی ماری، ان کا ابرو زخمی ہو گیا، آپ پہرہ دار کی تلوار کی طرف جھپٹے کہ اسے میان سے نکال لیں مگر انہیں پیچھے ہٹا دیا گیا۔

ابن زیاد بولا: اب خدا نے تیرا خون حلال کر دیا ہے، حکم دیا کہ انہیں محل کے فلاں حصے میں قید کر دیا جائے۔ (طبری: ۳۲۹/۵، ۳۲۸، ۳۲۷)

(رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: خون مسلم حلال ہونے کی صرف تین صورتیں ہیں، قصاص، زنا یا ارتداد (مسلم) دور یزید میں یہ چوتھا طریقہ ایجاد ہوا کہ پہلے اشتعال دلاؤ، مارو پھر جب مظلوم اپنی مدافعت میں ہاتھ اٹھائے تو اس کا خون حلال ٹھہرا کر قتل کر دو۔ عصر حاضر کی امریکی سیاست کا انداز بھی یہی ہے۔)

قبیلہ مذحج کا احتجاج

”جونہی یہ خبر قبیلہ مذحج کو ملی، محل کے دروازے پر ایک ہنگامہ مچ گیا۔ ابن زیاد نے شور سنا تو پوچھا: یہ کیا ہو رہا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ قبیلہ مذحج کے لوگ ہیں (جو ہائی کی گرفتاری پر احتجاج کر رہے ہیں)

ابن زیاد نے قاضی شریح سے کہا: ”تم ان لوگوں کے پاس جاؤ اور انہیں بتاؤ کہ میں نے محض تحقیقات کی غرض سے انہیں روک رکھا ہے“ اور ایک غلام کو قاضی پر جاسوس مقرر کر دیا..... شریح ہائی کے قریب سے گزرا تو ہائی نے اسے کہا: ”شریح! خدا سے ڈرو، یہ مجھے قتل کرنے کے درپے ہے۔“

شریح باہر نکلا، محل کے دروازے پر کھڑا ہوا اور لوگوں سے کہا: ہائی کو کوئی خطرہ نہیں ہے، امیر نے محض تحقیقات کی خاطر انہیں روک لیا ہے“ یہ سن کر لوگ منتشر ہو گئے۔

مسلمؓ کا لشکر شاہی محل کے دروازے پر

مسلمؓ کو خبر ملی تو انہوں نے نعرہٴ خاص بلند کیا، کوفہ کے چار ہزار باشندے ان کے گرد اکٹھے ہو گئے، مسلمؓ نے ہراول دستے تیار کئے، پھر میمنہ اور میسرہ کو ترتیب دی، خود لشکر کے قلب کی قیادت کرتے ہوئے ابن زیاد کی طرف روانہ ہوئے۔

مسلمؓ کے ساتھیوں نے بے وفائی کی

ابن زیاد نے کوفہ کے سرداروں کو شاہی محل میں اکٹھا کر لیا، جب مسلمؓ شاہی محل کے دروازے پر پہنچے تو سرداران کوفہ نے اوپر سے جھانکا اور اپنے اپنے قرابت داروں کو سمجھانے بجھانے اور انہیں لوٹ جانے کی تلقین کرنے لگے۔ مسلمؓ کے ساتھی ایک ایک کر کے سرکنے لگے حتیٰ کہ شام کے وقت صرف پانچ سو آدمی رہ گئے اور جب رات کا اندھیرا چھایا تو وہ بھی نکل گئے۔

مسلمؓ نے دیکھا کہ وہ تنہا رہ گئے ہیں تو وہ بھی وہاں سے چل پڑے اور گلیوں میں ادھر ادھر پھرتے رہے حتیٰ کہ ایک گھر کے دروازے پر اترے، ایک عورت باہر آئی، مسلمؓ نے کہا: مجھے پانی پلاؤ، وہ پانی پلا کر چلی گئی، کچھ دیر کے بعد وہ باہر آئی تو کیا دیکھتی ہے کہ وہ دروازے پر ہی بیٹھے ہیں۔

عورت نے کہا: اللہ کے بندے! آپ کے یہاں بیٹھنے سے شک ہوتا ہے،

آپ یہاں سے اٹھ جائیے۔

انہوں نے کہا: میں مسلم بن عقیل ہوں، تیرے ہاں کوئی ٹھکانہ ہے؟

اس نے کہا: ہاں ہے، آپ اندر تشریف لے آئیے۔

اس عورت کا لڑکا محمد بن اشعث کا آزاد کردہ غلام تھا، اسے جو ان کی آمد کی

خبر ہوئی تو اس نے ابن اشعث کو اطلاع کر دی۔

مسلمؑ کی گرفتاری

ابن اشعث نے ابن زیاد کو مطلع کیا، ابن زیاد نے عمرو بن حریث

المخزومی کو توال اور ابن اشعث کے بیٹے عبدالرحمان کو مسلمؑ کی گرفتاری کے

لیے روانہ کیا، مسلمؑ کو خبر بھی نہ ہوئی اور من کے ٹھکانے کا احاطہ کر لیا گیا۔ جب مسلمؑ

نے دیکھا کہ وہ محصور ہو گئے ہیں تو وہ تلوار لے کر باہر آ گئے اور پولیس کے ساتھ

مبارزت کی۔ عبدالرحمان (بن محمد بن اشعث) نے انہیں کہا: آپ میری پناہ میں

ہیں۔ اس کے بعد وہ انہیں ہاتھ سے پکڑ کر ابن زیاد کے پاس لے آیا۔

مسلمؑ اور ہائی کی شہادت

ابن زیاد نے حکم دیا کہ مسلمؑ کو محل کے اوپر لے جا کر اس کی گردن اڑا دو اور

اس کا لاشہ بازار میں پھینک دو اور ہائی کے بارے میں اس نے حکم دیا کہ اسے گھسیٹ

کر ٹکنا مسد (کوفہ میں ایک جگہ کا نام: ابن کثیر، ۸/۱۵۷) لے جایا جائے اور وہاں اسے سولی

پر چڑھا دیا جائے (چنانچہ ایسا ہی ہوا)“ (طبری: ۳۵۰/۵)

امام حسینؑ نظام خلافت کے لیے کوفہ روانہ ہوتے ہیں

”(ادھر) حسینؑ بن علیؑ مسلم بن عقیلؑ کا خط پڑھ کر کوفہ کی طرف روانہ ہو

گئے، حتیٰ کہ جب قادسیہ ان سے تین میل کے فاصلے پر تھا، حرب بن یزید نمیمی آپ

سے ملا اور پوچھا: کہاں کا ارادہ ہے؟

آپؑ نے فرمایا: اس شہر (کوفہ) جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔
 حُزّ نے کہا: آپ لوٹ جائیے، کوفہ کے حالات آپ کے لیے سازگار نہیں ہیں۔
 آپؑ نے واپسی کا ارادہ کر لیا، حضرت مسلمؓ بن عقیلؓ کے بھائی آپ کے
 ہمراہ تھے، انہوں نے کہا: واللہ! ہم واپس نہیں جائیں گے، انتقام لیں گے یا ہم بھی قتل
 ہو جائیں گے۔

اس پر حسینؑ نے فرمایا: تمہارے بعد جی کر مجھے کیا لینا ہے! یہ کہہ کر وہ (کوفہ
 کی سمت) روانہ ہوئے۔

راستے میں ابن زیاد کے ہراول دستے نظر آئے تو وہ کربلا کی طرف مڑ گئے
 اور ایسی جگہ ڈیرے ڈالے جہاں اُن کی پشت پر بانس کا جھنڈ اور جھاڑ جھنکار تھا، تاکہ دشمن
 کا حملہ ایک ہی رخ سے ہو۔ آپؑ کے ساتھ اس وقت پختا لیس سوار اور سو پیادہ تھے۔
 ابن سعد کا تقرر

عمر بن سعدؓ بن ابی وقاص سے ابن زیاد نے دے دی حکومت کا وعدہ کر رکھا
 تھا، (اب اس عہدے کی قیمت لینے کا وقت آیا)۔

ابن زیاد نے ابن سعد سے کہا: اس آدمی کا بندوبست کرو۔
 عمر بن سعد نے کہا: اس خدمت سے مجھے معاف رکھیے۔
 ابن زیاد نے اس کی معذرت قبول نہ کی۔

عمر بن سعد نے درخواست کی: اچھا، مجھے ایک رات کی مہلت دے دو۔
 ابن زیاد یہ بات مان گیا۔ عمر بن سعد رات بھر اس معاملے میں سوچتا رہا (کہ ایک طرف
 حکومت ہے دوسری طرف شقاوت آلود معصیت) بالآخر صبح ابن زیاد کے پاس جا کر اپنی
 آمادگی کا اظہار کر دیا۔

امام حسینؑ کی تجویز

ابن سعد حسینؑ کی طرف روانہ ہوا، وہاں پہنچا تو آپؑ نے اس سے کہا:
دیکھو، ان تین باتوں میں سے کوئی ایک بات مان جاؤ:

(۱) مجھے چھوڑ دو کہ جہاں سے آیا ہوں، وہیں واپس چلا جاؤں

(۲) یا مجھے یزید کے پاس جانے دو

(۳) یا مجھے چھوڑ دو کہ میں کسی سرحد پر چلا جاؤں

سانحہ کربلا کا آغاز ہوتا ہے

عمر ابن سعد نے یہ تجویز قبول کر لی (اور منظوری کے لیے ابن زیاد کو خبر دی)

ابن زیاد نے لکھا: ”نہیں، کوئی عزت نہیں یہاں تک کہ وہ میرے ہاتھ پر
بیعت کر لے۔“

حسینؑ نے فرمایا: ”نہیں واللہ! یہ ہرگز نہیں ہوگا۔“

اس پر ابن سعد نے حسینؑ کے ساتھ جنگ چھیڑ دی۔

حسینؑ کے تمام ساتھی شہید ہو گئے اور ان میں دس سے اوپر ان کے گھرانے

کے نوجوان بھی تھے۔

شیر خوار بیٹے کی شہادت

ایک تیر آیا اور ان کے اُس بیٹے کو لگا جسے وہ آغوش میں لیے ہوئے تھے،

آپؑ اس کا خون پونچھتے جاتے اور فریاد کرتے جاتے تھے: اے اللہ! ہمارے اور ان

کے درمیان تو ہی فیصلہ کر، جنہوں نے ہمیں یہ کہہ کر بلایا کہ ہم تمہاری مدد کریں گے اور

اب وہی ہمارے قتل کے درپے ہیں۔“

امام حسینؑ کی شہادت

پھر ایک یمنی چادر منگوائی، اُسے پھاڑ کر اپنے بدن پر لپیٹا اور ہاتھ میں تلوار لے کر میدان جنگ میں اترے، وہ برابر مبارزت کرتے رہے حتیٰ کہ شہید ہو گئے، خدا کی رحمتیں ہوں اُن پر۔

انہیں جس شخص نے شہید کیا وہ قبیلہ مذحج کا ایک آدمی تھا۔
آپؑ کا سر کاٹ کر وہ ابن زیاد کے پاس لے گیا اور یہ اشعار پڑھے:

اَوْ قَرَّرَ كَابِي فَضَّةً وَ ذَهَباً

فَقَدْ قَتَلْتَ الْمَلِكَ الْمُحِبَّجَا

قَتَلْتَ خَيْرَ النَّاسِ أُمًّا وَأَبَا

وَ خَيْرَهُمْ أَذْيُنُسُونَ نَسَبًا

”میرے اونٹ پر چاندی اور سوٹا لا دو اس لیے کہ میں نے ایسے بادشاہ کو قتل کیا جس تک رسائی مشکل تھی۔ میں نے ایسے انسان کو مارا جس کے ماں باپ ساری مخلوق سے افضل تھے اور حسب نسب کے اعتبار سے جو سب سے برتر تھا“

سر مبارک یزید کے دربار میں

ابن زیاد نے اُسے یزید بن معاویہؓ کے پاس بھیج دیا، حسینؑ کا سر اس کے ساتھ تھا، اس نے آپؑ کا سر یزید کے سامنے رکھ دیا، ابوہریرہؓ الاسلمی اس وقت یزید کے پاس تھے، یزید آپؑ کے وہاں مبارک کو چھڑی سے ٹھوکا دیتا تھا اور کہتا تھا:

يَفْلِقْنَ هَاماً مِنْ رِجَالِ أَعْزَةٍ

عَلَيْنَا وَهُمْ كَانُوا أَعْقًى وَ أَظْلَمًا

”(تلواریں) اُن لوگوں کی کھوپڑیاں چیخ دیتی ہیں جو ہم پر گراں گزرتے

ہیں اور وہ بڑے ہی سرکش اور ظالم تھے“

ابو بوزہؓ نے کہا: چھری دہان مبارک سے اٹھاؤ، خدا کی قسم میں نے بارہا دیکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنا دہن مبارک اس دہن پر رکھا اور اسے چوما!“

خواتین اور بچے یزید کے دربار میں

ادھر ابن سعد نے آپؐ کے اہل و عیال کو ابن زیاد تک پہنچا دیا، حسینؑ بن علیؑ کے گھرانے کا صرف ایک ہی فرزند بچا تھا جو بیماری کے باعث خواتین کے پاس تھا (یہ امام زین العابدینؑ تھے، جو زیر نظر روایت کے ماخذ امام ابو جعفرؑ کے والد ماجد ہیں)

ابن زیاد نے حکم دیا کہ انہیں بھی قتل کر دیا جائے لیکن (پھوپھی) زینبؑ ان سے لپٹ گئیں اور فرمانے لگیں: خدا کی قسم! یہ ہرگز قتل نہیں ہوگا، پہلے مجھے قتل کرو۔

یہ دیکھ کر ابن زیاد کچھ نرم پڑ گیا اور ان کے قتل سے رک گیا۔ پھر ابن زیاد نے ان عورتوں اور بچوں کو یزید کے پاس بھیج دیا۔

یزید نے دربار عام کیا، ان خواتین اور بچوں کو دربار میں لایا گیا، لوگوں نے یزید کو فتح کی تہنیت دی۔

ایک درباری نے جس کی آنکھیں نیلی تھیں اور چہرہ سرخ تھا، ان میں سے ایک نو عمر لڑکی پر نگاہیں جمادیں اور کہنے لگا: اے امیر المؤمنین! یہ لڑکی مجھے بخش دیجئے۔

زینبؑ نے فرمایا: نہیں واللہ! تجھے اس کا حق ہے نہ اُسے مگر یہ کہ وہ اللہ کے دین سے نکل جائے۔

اُس نیلی آنکھوں والے نے اپنی بات دہرائی تو یزید نے کہا: خاموش رہو! پھر اس قافلے کو اپنے گھر بھیج دیا، انہوں نے سفر کی تیاری میں ان کی مدد کی اور انہیں مدینہ روانہ کر دیا۔

(ابن جریر طبریؒ نے یہ دل فگار واقعہ دوسری سند کے ساتھ تفصیل سے نقل کیا ہے، آپ لکھتے ہیں:

”فاطمہ بنت علیؑ سے مروی ہے کہ جب ہم یزید کے سامنے بٹھائے گئے تو اس نے ہم پر

ترس کھایا، ہمیں کچھ دینے کا حکم دیا، بڑی مہربانی سے پیش آیا، اسی اثنا میں ایک سرخ رنگ کا شامی کھڑا ہوا اور کہنے لگا: امیر المؤمنین! یہ لڑکی مجھے عنایت کر دیجیے اور میری طرف اشارہ کیا، اس وقت میں کمن اور خوبصورت تھی، میں خوف سے کانپنے لگی کہ شاید یہ ان کے لیے جائز ہے، میں نے اپنی بہن زینب کی چادر پکڑ لی، وہ مجھ سے بڑی تھیں، زیادہ سمجھ دار تھیں، جانتی تھیں کہ یہ بات ہو نہیں سکتی، انہوں نے پکار کر کہا: ”تو کمینہ ہے، نہ تجھے اس کا اختیار ہے، نہ اسے (یزید) اس کا حق ہے!“ اس جرأت پر یزید کو غصہ آ گیا کہنے لگا: ”تو جھوٹ بکتی ہے، واللہ مجھے یہ حق حاصل ہے، اگر چاہوں تو ابھی کر سکتا ہوں“ زینبؑ نے کہا: ”واللہ! ہرگز نہیں، خدا نے تمہیں ہرگز یہ حق نہیں دیا، یہ دوسری بات ہے کہ تم ہماری ملت سے نکل جاؤ اور ہمارا دین چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کر لو“۔ یزید اور بھی خفا ہوا، کہنے لگا: ”میرے سامنے تم یہ کہتی ہو، دین سے تیرا باپ (علیؑ) اور تیرا بھائی (حسینؑ) نکل چکا ہے۔“ زینبؑ نے بلا تامل جواب دیا: ”اللہ کے دین سے، میرے نانا کے دین سے، میرے باپ کے دین سے، میرے بھائی کے دین سے تو نے، تیرے باپ نے، تیرے دادا نے ہدایت پائی ہے۔“

یزید چلایا: ”اے دشمن خدا، تو جھوٹی ہے“

زینب بولیں: ”تو زبردستی حاکم بن بیٹھا ہے، ظلم سے گالیاں دیتا ہے، اپنی قوت سے مخلوق کو دبا رہا ہے۔“

فاطمہ بنت علیؑ کہتی ہیں، یہ گفتگوں کر شاید یزید شرمندہ ہو گیا، کیونکہ پھر کچھ نہ بولا، مگر وہ شامی پھر کھڑا ہوا اور وہی بات کہی۔ اس پر یزید نے غضب ناک آواز میں اسے ڈانٹ پلائی: ”دور ہو، کمبخت! خدا تجھے موت کا تحفہ بخشے!“ (طبری: ۴۶۲/۵، ۴۶۱)

اس واقعے سے جہاں خانوادہ نبوت کی جرأت و شجاعت ظاہر ہوتی ہے، وہاں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یزید اقتدار و قوت کے نشے میں کتنا بدمست تھا اور اس نے اپنے ارد گرد کیسے کیسے بے حیا اور بد کردار لوگ اکٹھے کیے ہوئے تھے۔

سوچیے اور اپنے ایمانی جذبات کو تازہ کر کے سوچیے کہ اہل بیت اطہارؑ کی عزت و عصمت پر اٹھنے والی بے شرم نگاہیں، ان کی شان اقدس پر حرف گیری کرنے والی بے باک اور ناپاک زبانیں کیا امت محمدؐ میں شمار ہونے کے قابل ہیں!)

قافلہ واپس مدینہ پہنچتا ہے

”جب یہ قافلہ مدینہ پہنچا تو بنو عبدالمطلب کی ایک خاتون، بال بکھیرے ہوئے اور اپنی آستین سر پر رکھے ہوئے، اُن کے سامنے آئی، وہ روتی تھی اور یہ شعر پڑھتی تھی:

مَاذَا تَقُولُونَ إِنْ قَالَ النَّبِيُّ لَكُمْ

مَاذَا فَعَلْتُمْ وَأَنْتُمْ آخِرُ الْأُمَمِ!

بَعَثْتَنِي وَبِأَهْلِي بَعْدَ مُفْتَقِدِي

مِنْهُمْ أَسَارِي وَ قَتْلِي ضَرْجُوا بَدَمِ

مَا كَانَ هَذَا جَزَائِي إِذْ نَصَحْتُ لَكُمْ

أَنْ تُخْلِفُونِي بِسَوْءٍ فِي ذَوِي رَحْمِي!

”تم کیا جواب دو گے اگر پیغمبر ﷺ نے تم سے پوچھا کہ تم نے آخری

امت ہو کر میری وفات کے بعد میرے گھرانے کے ساتھ کیا سلوک کیا! ان میں سے

کچھ قیدی ہیں اور کچھ خون میں لتھڑے ہوئے مقتول ہیں، میں جو زندگی بھر تمہیں

نصیحتیں کرتا رہا تو اس کی یہ جزا نہ تھی کہ تم میرے قرابتداروں کے ساتھ ایسی بدسلوکی

کرو!“ (طبری: ۵/۳۹۰، ۳۸۹۔ روایت ختم ہوئی۔)

(خاتون محترمہ نے ان اشعار میں وہی وصیت یاد دلائی ہے، جو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ و

التسلیم نے اپنی امت کو فرمائی اور زید بن ارقم نے ہم تک پہنچائی:

”دیکھو! میں تم میں دو ایسی چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر تم نے انہیں تھامے رکھا تو

گمراہ نہیں ہو گے، ان میں ایک دوسری سے عظیم تر ہے:

(۱) کتاب اللہ، یہ وہ رستا ہے جو آسمان سے زمین تک لٹک رہا ہے۔

(۲) میری عترت، میرے اہل بیت۔

یہ دونوں ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہیں ہوں گے، یہاں تک کہ حوض پر میرے پاس

آ پہنچیں گے تو خیال رکھنا کہ میرے بعد تم ان سے کیسا سلوک کرتے ہو!“ (رداۃ الترمذی: مشکوٰۃ، ۵۶۹)

افسوس اس امت کے امراء و ملوک نے قرآن سے اچھا سلوک کیا نہ اہل بیتؑ سے

لفضلو و اضلو۔)

امام حسینؑ کا سر کہاں دفن ہوا؟

مؤرخین کے ہاں اس میں اختلاف ہے کہ امام حسینؑ کا سر کہاں دفن ہوا؟

۱۔ محمد بن سعد کہتے ہیں کہ یزید نے امام حسینؑ کا سر مدینہ کے والی عمرو بن سعید کے پاس بھیجا اور اس نے جنت البقیع میں آپ کی والدہ ماجدہ کے پاس اسے دفن کیا۔ (ابن کثیر: ۲۰۴/۸)

۲۔ ابن ابی الدنیا کا بیان ہے کہ یزید بن معاویہ کی وفات تک آپ کا سر یزید کے خزانے میں محفوظ رہا، اس کی موت کے بعد سر مبارک کو کفنایا گیا اور دمشق میں باب الفردیس کے اندر اسے دفن کیا گیا۔ (ابن کثیر: ۲۰۴/۸)

ابن ابی الدنیا نے یہ روایت عثمان بن عبدالرحمان سے کی ہے اور عثمان نے محمد بن عمر بن صالح سے۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہ دونوں راوی ضعیف ہیں۔

۳۔ ابن عساکر اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ یزید نے امام حسینؑ کا سر تین دن تک دمشق میں لٹکائے رکھا، پھر خزانے میں رکھ دیا۔ سلیمان بن عبدالملک کے زمانے میں اسے نکالا گیا تو محض ایک سفید ہڈی باقی رہ گئی تھی۔ سلیمان بن عبدالملک نے اسے کفنایا، خوشبو لگائی، اس پر نماز پڑھی اور مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کر دیا۔ (ابن کثیر: ۲۰۴/۸)

اکثر علماء کا رجحان اس طرف ہے کہ آپ کا سر مبارک مدینہ میں جنت البقیع میں دفن ہوا، امام ابن تیمیہؒ کی تحقیق بھی یہی ہے۔ (رائس الحسین: ۲۷)

امام حسینؑ کا مزار

جہاں تک آپ کے جسد مبارک کا تعلق ہے، مؤرخین متفق ہیں کہ وہ نہر کربلا کے پاس طف کے مقام پر دفن ہوا:

شدیم خاک و لیکن ز بوئے تربت ما
تواں شناخت کزیں خاک مردی خیزد
”ہم خاک ہو گئے، لیکن ہماری تربت کی خوشبو سے ہمیں پہچانا
جاسکتا ہے کہ اس خاک سے بھی مردانگی پھوٹ رہی ہے!“
یہ بھی قدرت کی بواجبی ہے کہ اس پرستارِ حق کا سر کہیں دفن ہوا اور دھڑ کہیں دفن ہوا!
من شاء فلینظر الیٰ فمظری
نذیر الیٰ من ظنّ انّ الهویٰ سهل
”جو یہ خیال کرتا ہے کہ کارِ محبت آسان ہے، اُسے چاہیے کہ پہلے مجھے دیکھ
لے کہ میرا پیکرِ خاک کی انجامِ محبت کی زندہ تصویر ہے۔“
یہ ہے وہ صلہ جو پرستارِ ان حق کو دنیا والوں نے دیا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ
اربابِ جاہ اپنی طاغوتی نخوت کی پیاس ہمیشہ حق پرستوں کے خون سے بجھاتے رہے
اور پرستارِ ان حق بھی ہمیشہ سچائی کی قربان گاہ پر اپنی جانوں کو حقیر ترین متاع سمجھ کر بے
درلغ نچھاور کرتے رہے، حق ان کی نگاہ میں جان سے عزیز تر ہوتا ہے:
آنکس کہ ترا خواست جاں را چہ کند
فرزند و عیال و خان و ماں را چہ کند
دیوانہ کنی، ہر دو جہانش بخشی
دیوانہ تو ہر دو جہاں را چہ کند
”اے محبوبِ حقیقی! تیرے چاہنے والے کو جان کی کیا پروا،
اہل و عیال اور گھریلو کی کیا پروا، آپ دیوانگی کا صلہ دو جہان
عطا فرماتے ہیں، لیکن تیرے دیوانے کو دو جہان کی کیا پروا،
وہ تو آپ کا طلبگار ہے!“

شہیدانِ حق کی دنیا میں امام حسینؑ کا مقام ایک اعتبار سے بہت ہی ابھرا ہوا ہے، کسی نے حق کی خاطر خود زہر کا پیالہ پی لیا، کوئی قید و محن کی سختیاں زندگی بھر جھیلنا رہا، کوئی تنہا پھانسی پر لٹک گیا..... مگر حسینؑ کا معاملہ ان سب سے مختلف ہے۔

اس نے اپنے گھرانے کا ایک ایک فرد اپنی آنکھوں کے سامنے کٹوا دیا، اس نے اپنے بچوں کے لاشے خاک و خون میں تڑپتے ہوئے دیکھے، اس کی پیاسی اور بلکتی ہوئی بچیوں کی آوازیں اس کے سامعہ سے ٹکرار ہی تھیں، مگر وہ صبر و ضبط کا پیکر،

وہ ثبات و استقلال کا ہمالیہ،

وہ عزت و ناموس کا سراپا،

دشمن کے سامنے گردن جھکانے پر آمادہ نہ ہوا۔

وہ دشمنوں کے جم غفیر میں تنہا رہ گیا مگر اس کے صبر و وقار کا دامن یکسر بے داغ رہا۔

وہ دشمنوں کی صفوں پر ٹوٹ پڑا اور بے جگری سے لڑتا ہوا شہید ہوا:

فی مقعد صدق عند ملیک مقتدر۔

”بادشاہِ ذی اقتدار کے دربار میں آپ بلند مقام پر فائز ہوئے۔“

تم اعتراف کرو یہ ایک رُلا دینے والی بدبختی ہے کہ پیغمبر ﷺ کا گھرانہ

خود اس کی امت کے ہاتھوں ویران ہوا!

اسرارِ کربلا

ان مقالات میں واقعہ کربلا کے اسرار و معارف کو
اُجاگر کیا گیا ہے اور اس بارے میں شبہات کے
جوابات دیے گئے ہیں۔

قربانی اور خلافت کا سفر

سفر!

دوسفر!

عظمتوں کے سفر!

رفعتوں کے سفر!

ولولوں کے سفر!

جذبوں کے سفر!

اجالوں کے سفر!

کتاب دہر کے سنہرے سفر!

امتوں کے مایہ ناز سفر!

تاریخ کے دھاروں کا رخ پھیرنے والے سفر!

الفاظ کو نئے معانی بخشنے والے سفر!

اور معانی کو نئی وسعتوں سے آشنا کرنے والے سفر!

عمل کی جبین پر نئے عنوان رقم کرنے والے سفر!

ایک قربانی کا سفر ہے اور دوسرا خلافت کا سفر

قربانی!

محبت کی قربانی، چاہت کی قربانی، الفت کی قربانی، ذات کی قربانی، وطن کی قربانی، تن کی قربانی، من کی قربانی، دھن کی قربانی، قربت کی قربانی، قرابت کی قربانی، رفاقت کی قربانی، وجاہت کی قربانی، قیادت کی قربانی، سیادت کی قربانی.....
”الا للہ“ کی قربان گاہ پر ”لا“ کی شمشیر سے ہر ”الہ“ کی قربانی!

قربانی کا یہ سفر ہابیل سے شروع ہوا اور کئی مرحلوں سے گزرتا ہوا منیٰ میں پہنچا۔ میدان منیٰ میں ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی قربانی سے قربانی کو زندگی ملی، تابندگی ملی، اعتبار ملا، قرار ملا..... لیکن حقیقت فدیے کے پردے میں مستور رہی، قربانی کا معنی تو پایا گیا لیکن اس معنی کو ظاہر کا لباس نہ ملا۔ کیونکہ ایک طرف جذبہ قربانی کا فرما تھا تو دوسری طرف دعائے ابراہیمؑ اپنا کام کر رہی تھی: ”ربنا واجعلنا مسلمین لک ومن ذریتنا امة مسلمة لک“ اور ”ربنا وابعث فیہم رسولا منہم“

اسماعیلؑ پہلے ذبح قرار پائے اور قربانی کا سفر جاری رہا

”الا للہ“ کی چوکھٹ پر دوسری عظیم قربانی ابراہیمؑ و اسماعیلؑ ہی کے فرزند عبدالمطلب نے اپنے بیٹے عبد اللہ کی دی، لیکن یہ قربانی بھی معنی کی تہہ سے ابھر کر ظاہر کی سطح پر نہ آ سکی، کیونکہ ابھی دعائے خلیل جلوہ گر نہ ہوئی تھی۔ سیدنا عبد اللہ اس سلسلے کے دوسرے ذبح ٹھہرے۔ آپ فرمایا کرتے تھے: ”انا ابن الذبیحین“ (میں دو ذبیحوں کا فرزند ہوں)

پھر دعائے خلیل علیہ السلام اپنی پوری رعنائیوں اور زیبائیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوئی اور قربانی کا سفر جاری رہا۔

ایک وقت آیا کہ اسلام کے سیاسی نظام کو آلودہ کیا گیا۔ امت کے امتی ڈھانچے کو اموی ڈھانچے میں بدلنے کی کوشش کی گئی، عوام کی آزادی کو سلب کیا گیا اور شاہ خدا بننے لگا تو اب حقیقت کے ظہور کا وقت آ پہنچا!

قربانی معنی کی تہہ سے ابھری کہ اب فکر معنوی الہ سے تھی!

ظاہر کا لباس پہنا اور ملوکیت کا بت پاش پاش کر ڈالا!

یوں میدان منیٰ سے قربانی کا یہ سفر سیکڑوں منزلوں سے گزرتا ہوا ہزاروں برس بعد میدان کربلا میں ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کے فرزند امام حسینؑ اور اہل بیتؑ کی قربانی پر نقطہ کمال کو پہنچا اور اس شان سے پہنچا کہ اب قیامت تک یہی قربانی حق و صداقت کا

معیار قرار پائی اور نئے مسافروں کے لیے یہی قربانی نشان منزل ٹھہری۔
 اخلاص جتنا زیادہ ہو، قربانی اتنی ہی مقبول ہوتی ہے اور مقصد جتنا اعلیٰ ہو،
 قربانی اتنی ہی اعلیٰ اور اولیٰ ہوتی ہے۔ تاریخ انسانی کی شہادت ہے کہ قربانی مرقی
 نہیں بلکہ امر ہو جاتی ہے، قربانی سے فنا نہیں، بقا حاصل ہوتی ہے، کیونکہ:

فنا فی اللہ کی تہہ میں بقا کا راز مضمر ہے

جسے مرنا نہیں آتا، اسے جینا نہیں آتا

اور اہل جہاں آج بھی اپنی آنکھوں سے اس حقیقت کا مشاہدہ کر رہے ہیں:

کشتگانِ خنجر تسلیم را

ہر زماں از غیب جانے دیگر است

آئیے! اب ایک نظر خلافت کے سفر پر!

خلافت!

خدا کی زمین پر خدا کا نظام

دنیا میں دین اور دیانت کا نظام

امن، ایمان اور امانت کا نظام

سلم، سلام اور اسلام کا نظام

حریت، اخوت اور مساوات کا نظام

عبادت، امامت اور شہادت کا نظام

صداقت، شجاعت اور عدالت کا نظام

خلافت کا یہ سفر اس زمین پر انسان اول کے روز اول سے شروع ہوا، ہر نبی

اور رسول اپنے دور میں اسی نظام کے قیام اور استحکام کی دعوت دیتے رہے۔

یہاں تک حضرت ختمی مرتبت محمد رسول اللہ ﷺ پر نبوت و رسالت اپنے نقطہ کمال

پر پہنچ کر ختم ہو گئی اور نظام خلافت کے قیام و انصرام کی ذمہ داری امت پر آن پڑی۔

امت کی سطح پر نظام خلافت کا یہ سفر سیدنا صدیق اکبرؓ کی خلافت راشدہ سے شروع ہوا اور فاروقی، عثمانی اور علوی ادوار سے گزرتا ہوا سیدنا امام حسنؑ تک پہنچا۔

اصلاح امت کی مصلحت نے خلافت کو صلح کے ذریعے امام حسنؑ کے ہاتھ سے لے کر دوسرے ہاتھوں میں منتقل کر دیا۔ ہاتھ بدلنے سے رفتہ رفتہ نظام بدل گیا، طرز اہتمام بدل گیا، مزاج بدل گیا، منہاج بدل گیا، خلافت دب گئی اور ملوکیت چھا گئی۔ امام حسینؑ نے اسی مرحلے پر خلافت کی بقا اور احیا کے لیے قربانی دی۔ نظام خلافت تو قائم نہ ہو سکا لیکن دائرہ خلافت ضرور متعین ہو گیا، حدود واضح ہو گئیں، مزاج خلافت سے سب آشنا ہو گئے، منہاج خلافت سب کے لیے روشن ہو گیا۔

یہ مسئلہ ہے کہ قربانی رائیگاں نہیں جاتی، نظام خلافت کے لیے دی گئی یہ عظیم قربانی بھی رائیگاں نہیں ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے، خلافت کے محفوظ، متعین اور مقرر نظام کا سفر جاری ہے۔ سیکڑوں برس گذر چکے اور نہ معلوم کتنے اور گذریں گے، لیکن..... ایک وقت ضرور آئے گا اور نبی صادق و مصدق ﷺ کی پیشگوئی کے مطابق آئے گا، جب انہی کی اولاد سے..... جن کے ہاتھ سے خلافت لی گئی اور جنہوں نے خلافت کی بقا کے لیے قربانی دی..... ایک عظیم شخص پیدا ہوگا، نبی آخر الزمان ﷺ کا ہم نام ہوگا، اُس کے والدین ماجدین آپ کے والدین کریمین کے ہم نام ہوں گے، اس نسبی عظمت کے ساتھ نسبی رفعت کا حامل ہوگا، سراپا ہدایت ہوگا، جس کی وجہ سے 'مہدی' کے لقب سے پکارا جائے گا، اُس وقت حالات مجبور ہو کر اُس کے ہاتھ پر بیعت کریں گے بلکہ یوں کہا جائے کہ حالات نے جس ہاتھ سے خلافت لی، حالات ہی مجبور ہو کر اُس کی اولاد کو، گویا اُسی کو، خلافت واپس کریں گے! جب امانت اپنے صحیح مقام پر پہنچے گی اور حق دار کو اس کا حق ملے گا تو پھر ایک مرتبہ روئے زمین پر نظام خلافت برپا ہوگا اور وہ قرن آخر میں قرن اول کی طرح حالات کی اصلاح کرے گا۔

یوں نبوتِ (محمدی) کی تصدیق کے ساتھ صدیق اول الزمان (ابوبکرؓ) سے شروع ہونے والا خلافت کا یہ سفر نبوت (عیسوی) ہی کی تصدیق کے ساتھ صدیق آخر الزمان (مہدیؑ) پر نقطہ کمال کو پہنچے گا اور دنیا آیہ اظہار اور آیہ استخلاف کا ایک عالمگیر منظر اپنی آنکھوں سے دیکھے گی:

عقل ہے تیری سپر، عشق ہے شمشیر تری
مرے درویش! خلافت ہے جہانگیر تری
ماسوا اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تیری
تو مسلمان ہو تو تقدیر ہے تدبیر تیری

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں
صلی اللہ علیہ وآلہ وبارک وسلم

ملوکیت کے خلاف قیام میں امام حسینؑ کی سبقت قابلِ تعجب نہیں

چاروں طرف کفر و شرک کے اندھیرے چھائے ہوئے تھے، ظلم و جور کا راج تھا، ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی امانت بت خانہ بن چکی تھی، رسوم و اہام کی تاریکیاں اتنی گہری اور سیاہ کہ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہ دیتا تھا، اس گھمبیر ماحول اور بھیاں تک فضا میں ایک آواز گونجتی ہے:

لا الہ الا اللہ!

صرف ایک آواز، تنہا لیکن پر عزم آواز! یہ حسینؑ کے جدا مجد محمد رسول اللہ ﷺ کی آواز تھی۔ اس آواز پر سب سے پہلے ایک بچہ کان دھرتا ہے، محمد رسول اللہ ﷺ کی آغوشِ رحمت میں پلا ہوا بچہ، آپ کی شفقتوں اور محبتوں کا مرکز بچہ، یہ بچہ لا الہ الا اللہ کی آواز سن کر سب سے پہلے اسے تسلیم کرتا ہے اور مسلم اول ہونے کا اعزاز حاصل کرتا ہے۔ یہ سابق الی الاسلام حسینؑ ہی کے پدربزرگوار علیؑ ہیں۔ یوں تو سبھی قرابت دار بیٹھے ہوئے ہیں، جہاں دیدہ، فہیدہ، گرم و سرد چشیدہ، رسالت اپنی رفاقت کی دعوت دے رہی ہے اور اس پر بشارت سنار ہی ہے۔ لیکن جواب میں ایک خاموشی ہے، ایک سناٹا ہے، بڑی معنی خیز خاموشی، نہت مصلحت آمیز سناٹا! اس سناٹے کو ایک ہی آواز توڑتی ہے اور رفاقت و معیت کی بشارت سے سرفراز ہو جاتی ہے۔ اس حلقے کی یہ پہلی اور آخری آواز حسینؑ ہی کے بابا علیؑ کی آواز تھی! دشمن نے گھر گھیرا ہوا ہے، تلواروں کی چمک دکھائی دے رہی ہے، قتل کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں، ایسے میں ایک شخص تنہا، رسول اکرم ﷺ کے امر سے، بستر رسالت پر بے خوف و خطر لیٹ جاتا ہے،

کس لیے؟

رسول صادق و امین ﷺ کی امانتوں کی حفاظت کے لیے، امانتوں کو
حقداروں تک پہنچانے کے لیے،

رسول امین ﷺ کی امانتوں کے یہ امین اول اور محافظ اول
حسینؑ ہی کے بابا تھے سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ وارضاه!
بدر کا میدان ہے، یوم الفرقان ہے، ایک سے ایک بڑھ کر وفادار اور جان
نثار بہادر موجود ہیں، لیکن سب سے پہلے جو دشمن سے مبارزت طلب ہوئے،
وہ حسینؑ ہی کے بابا علیؑ تھے!
احد میں رسول اللہ ﷺ کی آواز پر سب سے پہلے دشمنان اسلام پر لپکنے اور جھپٹنے کا
اعزاز جسے حاصل ہوا،

وہ حسینؑ ہی کے بابا علیؑ تھے!
احزاب متحدہ محاذ بنا کر مدینے کو گھیرے ہوئے ہیں، ایک زلزال شدید کی
کیفیت طاری ہے، عرب سور ماعمر و بن عبدود خندق عبور کرنے کی کوشش کرتا
ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے امر عالی سے خندق میں اتر کر دشمن کو جس نے ٹھکانے لگایا
اور احزاب کے حوصلے جس نے پست کر دیے،

یہ پہلا بہادر علیؑ ہی تھا، حسینؑ کا بابا!
خیبر فتح نہیں ہو رہا، محاصرہ طویل ہوتا جا رہا ہے، آوازِ نبوت بلند ہوتی ہے:
”کل میں جھنڈا ایک ایسے شخص کو دوں گا جس کے ہاتھ پر اللہ فتح دے گا اور جو اللہ
اور رسول سے محبت کرتا ہے اور اللہ اور رسول اس سے محبت کرتے ہیں۔“

اگلی صبح نگاہِ نبوت کا شرفِ انتخاب جسے حاصل ہوا اور اپنی نوعیت کے پہلے
اور تنہا اعزاز یافتہ جو قرار پائے،

وہ حسینؑ ہی کے بابا علیؑ تھے!

مرحب جیسے شہ زور کو ایک وار میں زیر کرنے اور خیر کا بھاری درتہا اکھیڑنے کی سعادت جسے حاصل ہوئی،

وہ حسینؑ ہی کے بابا علیؑ تھے!
دوشِ نبوت پر سوار ہو کر کفر و شرک کی علامات سے اللہ کا گھر پاک کرنے کی کرامت سے جو مکرم ہوا،

وہ حسینؑ ہی کے بابا علیؑ تھے!
”من كنت مولاه فعلي مولاه“ کا طرہ امتیاز

حسینؑ ہی کے باباؑ کے سر سجا!
”انت مني بمنزلة هارون من موسى“ کی قربت

حسینؑ ہی کے باباؑ کو ملی!
لسانِ نبوت سے ”سيدة نساء اهل الجنة“ ہونے کا شرف

حسینؑ ہی کی اماں فاطمہ الزہراءؑ کو حاصل ہوا!
یوں تو عبادت اور عفت و عصمت کے نور سے منور بہت سے جنازے اٹھے،
لیکن جنازہ لکڑی کے ڈولے میں ڈھانپ کر لے جانے اور شب کی تاریکی میں دفنانے کی، شرم و حیا سے معمور، وصیت

سب سے پہلے حسینؑ ہی کی اماں جان سیدہ فاطمہؑ نے کی
اور غالباً اسی کے صلے میں اور اس حیا کی لاج رکھتے ہوئے قیامت کے دن
یہ اعزاز صرف حسینؑ ہی کی اماںؑ کے حصے میں آئے گا کہ سراپردہ جلال سے ایک
پکارنے والا پکارے گا: ”محشر میں جمع ہونے والو! اپنی نگاہیں نیچی رکھو یہاں تک کہ محمد
کی بیٹی فاطمہؑ گذر جائیں۔ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!

رسول اکرم ﷺ نے اپنی ذات اقدس کو جن کی سواری بنایا،
وہ صرف حسنؑ اور حسینؑ ہی تھے!

”سید اشباب اهل الجنة“ کا تمغہ رسولِ رحمت ﷺ نے خود جن کے سینے پر سجایا، وہ صرف حسنؑ اور حسینؑ ہی تھے! لشکرِ جرار ہونے کے باوجود امت کے مفاد کی خاطر اقتدار سے دستبردار ہونے کی اولین مثال

حسینؑ ہی کے بھائی حسنؑ نے قائم کی! سبقتوں، خصوصیتوں اور اعزازوں کے اس طویل اور تابناک پس منظر میں ملوکیت کا خطرہ اگر حسینؑ نے سب سے پہلے بھانپا، اُس کے انسداد کے لیے اگر حسینؑ نے سب سے پہلے قیام فرمایا، خلافت کے احیاء کے لیے اگر حسینؑ نے سب سے پہلے قدم اٹھایا اور ملوکیت کی بنیادوں کو بے مثال قربانی دے کر اگر حسینؑ نے سب سے پہلے ہلایا تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں سبقت حسینؑ کے دو دمان والا شان کی ریت تھی! سوچیے! بابا کی طرح رسول اللہ ﷺ کی امانت کی حفاظت حسینؑ نہ کرتے تو کون کرتا؟ بابا کی طرح دین کی نصرت کے لیے سب سے پہلے حسینؑ نہ بڑھتے تو کون بڑھتا؟ اپنے جد امجد ﷺ کی طرح اس ظلمت میں لا الہ الا اللہ کا جلال حسینؑ نہ بکھیرتے تو کون بکھیرتا؟ اُس وقت حسینؑ جیسا کون تھا؟

کوئی نہ تھا! کوئی نہ تھا!

اس لیے ملوکیت کے خلاف قیام میں شرفِ سبقت بجا طور پر حسینؑ ہی کی قسمت بنا! اور ارشادِ ربانی ہے:

”وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ، أُولَئِكَ الْمُقَرَّبُونَ، فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ“
(الواقعة: ۱۰-۱۲)

”یہ جو آگے رہنے والے ہیں نا آگے رہنے والے، نعمتوں بھری جنتوں میں بھی یہی آگے آگے (مقربین) ہوں گے۔“

عزم حسینی عزم صدیقی کا نمونہ ہے

امت کی زندگی میں دو وقت بہت کڑے اور نازک آئے۔

پہلا وقت رسول اللہ ﷺ کی وفات حسرت آیات کا تھا،

ایک طرف امت صدے سے نڈھال تھی، دوسری طرف فتنوں کا دروازہ کھل گیا۔ کہیں ارتداد کی وبا پھوٹ پڑی، کہیں نبوت کے مقدس عنوان سے مہم جوئیاں ہونے لگیں، رہی سہی کسر منع زکوٰۃ کے فتنے نے پوری کر دی۔ یہ لوگ کلمہ تو پڑھتے تھے، لیکن خلافت کو زکوٰۃ دینا لازم نہیں سمجھتے تھے، اور کچھ لوگ سیاسی گھاگ تھے، انتظار کر رہے تھے کہ پانسہ کس طرف پلٹتا ہے۔

تیسری طرف لشکر اسامہؓ کی روانگی کا معاملہ تھا، رسول اللہ ﷺ اسے روانگی کا حکم دے چکے تھے، لشکر ابھی روانہ نہ ہوا تھا کہ آپؐ اس دنیا سے روانہ ہو گئے، اس بدلی ہوئی صورت حال میں یہ لشکر بھیجا جائے یا مدینے کی حفاظت اور مرتدین کے مقابلے کے لیے روکا جائے؟!

اس گھمبیر صورت حال میں سب پریشان تھے، کچھ سمجھ نہ آتا تھا، البتہ ایک شخصیت تھی جو ان تمام مراحل میں حوصلہ مند، پر عزم اور ثابت قدم رہی، اور یہ سیدنا ابوبکر صدیقؓ کی شخصیت تھی!

وفات کے صدے میں فرمایا: سنو! جو محمد (ﷺ) کی عبادت کرتا تھا، تو محمد (ﷺ) وفات پا گئے، اور جو اللہ کی عبادت کرتا تھا تو اللہ زندہ ہے، کبھی نہیں مرے گا۔“

اس حوصلہ افزا اور ایمان افروز جملے سے ڈھارس بندھی، حوصلے قائم ہوئے۔ لشکر اسامہؓ کے بارے میں بلند مرتبت صحابہؓ نے مشورہ دیا کہ اسے روانہ نہ کیا جائے، صورت حال بہت نازک اور خطرناک ہے۔

فرمایا: ”قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، اگر مجھے یہ بھی معلوم ہو جائے کہ درندے مجھے اس قریے میں آ بھنبھوڑیں گے، تو بھی میں اُس لشکر کو روانہ کر کے رہوں گا، جس کی روانگی کا رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا تھا، اور جو پرچم رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے باندھا، میں اسے ہرگز نہیں کھولوں گا۔“

مرتدین اور مدعیان نبوت کے خلاف جہاد کا معاملہ تو واضح تھا، لیکن مانعین زکوٰۃ کے خلاف اقدام میں حضرت عمرؓ جیسی شخصیت کو بھی اس وجہ سے تردد تھا کہ یہ تو لا الہ الا اللہ کے قائل ہیں!

فرمایا: ”اللہ کی قسم! جو صلوة اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا، میں اُس سے ضرور قتال کروں گا، زکوٰۃ مال کا حق ہے، اگر یہ زکوٰۃ میں رسول اللہ ﷺ کو بھیڑ کا بچہ دیتے تھے اور اب مجھے نہیں دیں گے تو میں اس پر بھی ان سے قتال کروں گا۔“

یہ بھی مشورہ دیا گیا کہ لوگوں سے نرمی برتے، اس سال کی زکوٰۃ چھوڑ دیجئے!

فرمایا: ”وحی بند ہو چکی، دین پورا ہو چکا، اب دین میں کمی ہو اور میں زندہ رہوں؟“ یہ نہیں ہو سکتا۔

عمرؓ فرماتے تھے: ”اللہ کی قسم ابو بکرؓ کا یہ عزم دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ اللہ نے قتال کے معاملے میں ابو بکرؓ کا شرح صدر فرما دیا ہے اور انہیں کی رائے حق ہے۔ اللہ کی قسم! مرتدین کے ساتھ قتال کے باب میں ابو بکرؓ کا ایمان پوری امت کے ایمان پر بھاری رہا۔“

(صحیح بخاری: باب وجوب الزکوٰۃ۔ مختصر سیرۃ الرسول ﷺ ص: ۴۷۲، ۴۷۳)

یہ پہلا کڑا وقت تھا، ایک طرف تنہا ابو بکرؓ، دوسری طرف پوری امت اور امت بھی خیر القرون!

لیکن آئندہ حالات و واقعات نے ثابت کر دیا کہ انہی کا عزم مبارک تھا، انہی کی رائے برحق تھی، انہی کی سوچ صحیح سمت میں کام کر رہی تھی، انہی کی عزیمت اور اپنی عزم نے فتنوں کا سد باب کیا، انہیں بروقت اور صحیح شرح صدر ہوا یہاں تک کہ

پھر سب کو اس بارے میں شرح صدر ہو گیا۔

امت پر دوسرا کڑا وقت وہ تھا، جب امت کے سیاسی نظام کا کاٹنا بدلا گیا اور گاڑی کو خلافت کی پٹری سے اتار کر ملوکیت کی پٹری پر ڈالنے کی ارادی اور شعوری کوشش کی گئی، یہ بڑی بھیانک سیاسی بدعت تھی..... ہر شعبے کی بدعت کا اپنا خاص رنگ ہوتا ہے اور ہر شخص ہر بدعت کو کہاں سمجھ سکتا ہے! چنانچہ سب سے پہلے اس پر جو اصحاب کرام معترض ہوئے، یہ وہ تھے جو امت کا سیاسی نظام سمجھتے تھے، خلافت کی آغوش میں پلے تھے، خلافت راشدہ کے مزاج شناس تھے، رسول اللہ ﷺ کی قربت، صحبت، شفقت اور تربیت سے مشرف تھے، علم و شعور اور تقویٰ و ورع کے اوصاف حسنہ سے آراستہ تھے، یہ تھے ابوبکرؓ کے بیٹے عبدالرحمنؓ، عمرؓ کے بیٹے عبداللہؓ، علیؓ کے بیٹے حسینؓ، زبیرؓ کے بیٹے عبداللہؓ، عبداللہ بن عباسؓ بھی انہی کے ہم نوا تھے..... جب یزید کی بیعت کا وقت آیا تو عبدالرحمن بن ابی بکرؓ اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن عباسؓ نے رخصت کی راہ اپنائی، عبداللہ بن زبیرؓ کا اپنا ایک انداز تھا، جلیل القدر صحابہؓ اپنے مولا کے حضور پہنچ چکے تھے، چند گئے چنے صحابہؓ جو باقی تھے، وہ بڑھاپے کی آخری منزلیں طے کر رہے تھے..... خود امام حسینؓ جو تمام صحابہؓ میں کم عمر تھے، ۵۶ برس سے تجاوز کر چکے تھے..... پھر امیر المومنین حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان خونریز جنگوں میں امت کا جو بے پناہ نقصان ہوا، وہ ان حضرات کے سامنے تھا، اس لیے ان قدسی صفات نے نہایت نیک نیتی سے امت کو ایک اور جنگ سے بچانے کے لیے سکوت اور رخصت پر عمل کیا۔

ان حالات میں تنہا امام حسینؓ تھے، جنہوں نے ملوکیت کے مفاسد کا فوری ادراک کیا، عزیمت کی راہ اپنائی اور اس کے انسداد کے لیے بروقت قیام فرمایا، اور قیام بھی اس شان سے کہ امت کو جنگ و جدال کی تباہی سے بھی بچایا اور خود اپنی اور اپنے گھرانے کی قربانی دے کر خلافت و ملوکیت اور حق و باطل کے

درمیان فرق بھی امت کو سمجھا دیا، چنانچہ میدان کربلا میں امام حسینؑ اقدام نہیں کرتے بلکہ تادم آخرو دفاع میں تلوار اٹھاتے ہیں کہ مقصود اس حکم ربانی کی تعمیل تھی:

”لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ“
(البقرة: ۴۲)

(ترجمہ) ”حق کو باطل کے ساتھ خلط نہ کرو (اور نہ خلط ہونے

دو) اور جانتے بوجھتے حق مت چھپاؤ۔“

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانہ حق و باطل نہ کر قبول
اس موقع پر پرکشش پیشکش بھی ہوئی، لیکن آپؑ نے قرآن مجید کے اس حکم کی عملی تفسیر کی:

”لَا تَطْعَمُ الْمَكْذِبِينَ، وَدَوَالُو تَدَهْنُ فَيَدَهْنُونَ“ (القلم: ۸-۹)

(ترجمہ) ”ان حق جھٹلانے والوں کا کہنا مت مان، یہ تو چاہتے

ہیں کہ کسی طرح تو نرم پڑ جائے تو یہ بھی نرم ہوں۔“

چنانچہ آپؑ نے رخصت اور سمجھوتے کی راہ اختیار نہیں کی اور ایسے بے مثال انداز سے حق و باطل میں تفریق کر دی کہ اب قیامت تک اس میں التباس نہیں ہو سکتا۔

تاریخ اسلام کے اس کڑے مرحلے میں آپؑ تنہا تھے، لیکن آپؑ کو ویسا ہی

شرح صدر ہوا، جیسا ابوبکرؓ کو ہوا تھا اور آئندہ حالات و واقعات نے تصدیق کر دی

کہ آپؑ کا قیام بجا اور آپؑ کا شرح صدر بروقت تھا، یہی وجہ ہے کہ صلحاء امت میں

سے کسی نے آپؑ کے قیام کو غلط نہیں کہا!

آپؑ کی قربانی کے بعد امت میں بیداری کی لہر دوڑ گئی، ملوکیت سے نفرت

گہری ہو گئی، لا الہ الا اللہ کے مفہوم کی وسعت لوگوں پر آشکارا ہو گئی اور چند ہی برس

میں اس کا مثبت نتیجہ بھی سامنے آ گیا۔

اور آج جب شعور کی آنکھ کھلی ہے، عوام کو اپنے حقوق کا احساس ہوا ہے، آمریت و ملوکیت کا جوا لوگ اپنے کندھوں سے اتار کر پھینک رہے ہیں اور جبر و استبداد کی بیڑیاں توڑ رہے ہیں تو ہر قوم پکار رہی ہے:

حسینؑ ہمارے ہیں

الغرض عہد اوّل میں دو کڑے وقت آئے، ایک میں عزم صدیقی نے سنبھالا دیا، دوسرے میں عزم حسینیؑ کام آیا، حقیقت یہ ہے کہ آپؑ کا عزم عزم صدیقی ہی کا عکس صادق تھا۔

اقبال آپؑ کے عزم و استقلال کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

عزم او چوں کو ہساراں استوار
پائدار و تندیر و کامگار

امام حسینؑ کی اولوالعزمی اور جرأت کے حوالے سے لوگ اب جو باتیں بنا رہے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی نگاہ میں حسینؑ ہار گئے! ان کی کوتاہ بین نگاہیں شہادت کو شکست دیکھتی ہیں! حقیقت یہ نہیں، اہل حق مؤمن تو ہر حال میں کامیاب ہے، غازی ہو یا شہید، منزل تک پہنچ جائے یا راہ میں کام آئے!

یہ لوگ ابوبکرؓ کی تعریف و توصیف آج اس لیے کر رہے ہیں کہ وہاں ظاہری اعتبار سے بھی فتح ہوئی۔ اگر بالفرض وہاں صورت حال برعکس ہوتی تو یہ کج فہم اور ظاہر پرست آج ابوبکرؓ کے بارے میں بھی باتیں بنا رہے ہوتے کہ انہوں نے اتنے عظیم المرتبت صحابہؓ کی بات نہ مانی اور من مانی کی، اس لیے امت کو اتنا نقصان اٹھانا پڑا.....

اللہ تعالیٰ نے سورہ آل عمران، نساء اور توبہ میں کچھ لوگوں کا ذکر کیا ہے، جو فتح حاصل ہونے پر تعریف کے ڈونگرے برساتے تھے اور موجود نہ ہونے کے باوجود

اپنی موجودگی دکھاتے تھے اور نقصان کی صورت میں اپنی غیر حاضری کو اپنی سیاسی دانش اور دور اندیشی کے ثبوت میں پیش کرتے تھے۔

حسینی عزم پر آج اعتراض کرنے والوں کو اپنا دامن دل ٹٹولنا چاہیے، کہیں اسی مرض نے وہاں انڈے بچے نہ دے رکھے ہوں!

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشاے لبِ بام ابھی

سیدنا ابوبکرؓ اور سیدنا حسینؑ کا شرح صدر

تاریخ اسلام کے ان دو کڑے وقتوں میں صرف ابوبکرؓ اور صرف حسینؑ کو

شرح صدر ہوا، یہ سعادت کسی اور کو نصیب نہ ہوئی! یہ سوچنے کی بات ہے!

غور کیجیے تو سمجھ آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جیسے اپنی ظاہری اور دنیوی حیات میں کارِ امت انجام دیتے تھے، مشکلات میں رہنمائی فرماتے تھے اور پریشانیوں میں دلداری کرتے تھے، وفات کے بعد برزخی حیات میں بھی آپؐ کا فیض جاری ہے، آج بھی آپؐ کسی نہ کسی رنگ میں کسی نہ کسی ذریعے امت کی رہنمائی فرماتے ہیں۔

مذکورہ دو کڑے وقتوں میں ابوبکرؓ اور حسینؑ کا شرح صدر درحقیقت رسول اللہ ﷺ کا فیض ہدایت اور آپؐ کی روحانی نصرت تھی، جو ان دو صحابیوں کے وسیلے سے امت کو حاصل ہوئی، جو اپنے اپنے عہد میں رسول اللہ ﷺ کے سب سے زیادہ مقرب اور محبوب تھے۔

سیدنا ابوبکرؓ کی قربت اور محبت محتاج بیان نہیں

اور سیدنا حسینؑ کے دور میں حسینؑ کے سوا کون تھا

جس کے پاس رسول اللہ ﷺ کی محبتوں کا خزانہ ہو،

نبوی فراست جس کی آنکھوں میں دمک رہی ہو،

علیؑ کی شجاعت جس کے کردار میں چمک رہی ہو،
فاطمہؑ کی تربیت جس کی سیرت میں مہک رہی ہو،

یہ صرف حسینؑ ہی تھے..... اس لیے انہی دونوں کو اپنے اپنے دور میں
شرح صدر ہوا، اور پھر وقت کی کسوٹی نے ثابت کر دیا کہ یہی اس کام کے اہل تھے،
ابوبکرؓ نے جو کیا، وہ انہی کا حصہ تھا، حسینؑ نے جو قدم اٹھایا، وہ انہی کے لائق تھا، ابوبکرؓ
کے اقدام کے بعد ارتداد، بغاوت اور ادعاے نبوت کے فتنے دم توڑ گئے اور حقیقت
کھل گئی، اسی طرح حسینؑ کے اقدام کے بعد آمریت کو عزت اور ملوکیت کو کبھی ثبات
حاصل نہ ہو سکا اور خلافت و ملوکیت کی حقیقت عالم آشکارا ہو گئی:

خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

دو عظیم قربانیوں کے سبب..... دو خواب

تاریخ انسانی کی دو قربانیاں نہایت عظمت و اہمیت رکھتی ہیں، ایک ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی قربانی اور دوسری امام حسینؑ کی قربانی۔

ابراہیمؑ قربانی کرنے پر اور اسماعیلؑ قربان ہونے پر کیسے آمادہ ہوئے؟

اس کا سبب ایک خواب تھا۔

قرآن کا بیان ہے:

(ترجمہ) ”پھر جب وہ (لڑکا) اُس کے ساتھ دوڑنے بھاگنے کی عمر کو پہنچا تو کہا: میرے پیارے بیٹے! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں، سو دیکھ سوچ تیری کیا رائے ہے؟“

اس نے کہا: میرے پیارے ابا! کر گزریے جو آپ کو حکم ملا ہے، آپ بہت

جلد مجھے انشاء اللہ صابروں سے پائیں گے“ (الصافات: ۱۰۲)

چنانچہ دونوں نے سر تسلیم جھکا دیا اور یوں خواب کی تعبیر میں ایک عظیم قربانی

وجود میں آئی۔

دوسری عظیم قربانی کا سبب بھی ایک خواب تھا۔

علی بن الحسین بن علی، سلام اللہ و رضوانہ علیہم، سے روایت ہے کہ جب

روکنے والوں نے روکا تو امام حسینؑ نے سب باتوں کے جواب میں ایک بات فرمائی:

”انسی رأیت رسول اللہ ﷺ فی المنام وقد امرنی

فیہا بأمر وانا ماض لہ، علیٰ کان اولیٰ“

”میں نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا ہے، آپ نے

تاکید کے ساتھ اس میں مجھے ایک کام کا حکم دیا ہے اب بہر حال

میں یہ کام کروں گا، مجھے نقصان ہو یا فائدہ“

پوچھنے والوں نے پوچھا: ”وہ خواب کیا ہے؟“

فرمایا: ”ماحدثت بها حداً و ماأنا محدث بها حتى القى ربي عز وجل“
”ابھی تک کسی کو نہیں بتلایا اور نہ ہی بتلاؤں گا یہاں تک کہ اپنے
رب عز وجل سے جا ملوں گا۔“

(طبری: ۳۸۸/۵، البدایہ والنہایہ: ۱۶۸/۸)

سیدنا ابراہیمؑ کو بھی خواب میں حکم ملا، امام حسینؑ کو بھی خواب میں حکم ملا، سیدنا
اسماعیلؑ نے جو جواب دیا تھا امام حسینؑ کے جواب میں بھی اُسی عزم اور صبر و رضا کی
جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

اس طرح امام حسینؑ کا یہ خواب اور جواب ”ذریۃ بعضہا من بعض“
(آل عمران: ۳۳) کی ایک اور برہان ہمیں فراہم کرتا ہے!
یہ خواب ایک اور پہلو سے بھی قابل غور ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: ”جس نے خواب میں مجھے دیکھا، اس نے
مجھے ہی دیکھا، اس لیے کہ شیطان میری مثال میں نہیں آ سکتا“ (مشکوۃ: باب الرؤیا)
شیطان آپؐ کا سراپا تو اختیار نہیں کر سکتا، لیکن کوئی بھلی سی، من موہنی صورت
تو اپنا سکتا ہے اور ایک عام شخص جس نے حیات دنیوی میں آپؐ کی زیارت نہ کی ہو، وہ
اس کے فریب میں آ سکتا ہے، اس لیے غیر صحابی کو جب خواب میں زیارت ہو تو
صرف ظن غالب کے درجے میں ہے، خواب میں نظر آنے والا سراپا، شائل کی روایات
کے مطابق ہو اور ارشاد شریعت کے مطابق ہو تو قبول ہے ورنہ نہیں۔

حدیث مذکور کا مصداق کامل صحابہ کرامؓ ہیں، جب کوئی صحابی خواب میں
آپؐ کی زیارت کرتا ہے تو وہ آپؐ ہی کی زیارت کرتا ہے، اور صحابی کو خواب میں جو
کچھ فرمایا جائے وہ یونہی ہے گویا حیات میں فرمایا گیا ہے، اور آپؐ کے حیات دنیوی
کے حکم کی حیثیت یہ ہے کہ آپؐ کا فرمان اللہ کا فرمان ہے اور آپؐ کی اطاعت اللہ کی

اطاعت ہے، کیونکہ آپؑ اپنی خواہش سے نطق نہیں فرماتے تھے بلکہ آپؑ کا کلام وحی الہی ہوتی تھی۔ اسی لیے شاہ عبدالقادر دہلویؒ سورۃ احزاب: ۶ کی توضیح میں فرماتے ہیں: ”نبی نائب ہے اللہ کا، اپنی جان و مال میں اپنا تصرف اتنا نہیں چلتا، جتنا نبی کا چلتا ہے، اپنی جان دہکتی آگ میں ڈالنا روا نہیں، نبی حکم دے دے تو فرض ہو جائے۔“ (فوائد عثمانی)
تو امام حسینؑ کو خواب میں جو امر ملا وہ درحقیقت امر الہی تھا اور اس کی تعمیل فرض عین، غالباً یہی وجہ ہے کہ آپؑ نے جواب میں لقائے رسول ﷺ کا نہیں بلکہ لقائے الہی کا ذکر کیا ہے!

یہ خواب کیا تھا؟ مکہ سے کربلا کا پورا سفر اس کی تعبیر ہے اور امام حسینؑ کی اپنے خانوادے کے ساتھ شہادت اس روایت کی اسنادی حیثیت پر مہر تصدیق ثبت کر رہی ہے۔
ابراہیمؑ کے خواب کی تعبیر دس ذوالحجہ کو پوری ہوئی اور حسینؑ کا خواب دس محرم کو تعبیر آشنا ہوا، دونوں خوابوں کی تعبیر قربانی تھی، اس لیے کہنے کو تو یہ دو خواب ہیں، لیکن فی الحقیقت ایک ہی خواب ہے، دس ذوالحجہ کو میدان منیٰ میں یہ خواب اپنے ظاہر میں رونما ہوا اور دس محرم کو سرزمین کربلا پر اپنی باطنی حقیقت کے ساتھ جلوہ گر ہوا، یوں باپ نے جس طرز قربانی کا آغاز کیا تھا، بیٹے نے پوری تابانیوں کے ساتھ اس عظیم سنت کو مکمل کیا:

اللہ اللہ اللہ بے بسم اللہ پدر

معنی ذبح عظیم آمد پسر

آپؑ کی قربانی کی تابانی تو دیکھیے!

اب تک کسی نے وطن کی قربانی دی، کسی نے اولاد قربان کی، کوئی مال کا نذرانہ لے کر حاضر ہوا، کسی نے اقتدار پر لات ماری، کوئی اعزہ و اقارب سے چھوٹا، کوئی صرف خود قربان ہوا، لیکن حسینؑ نے وطن، اولاد، اعزہ و اقارب، دولت و جاہت، جذبات اور

خود اپنی ذات کی قربانی پیش کی!

حسینؑ سے پہلے گل قربان ہوتے تھے، حسینؑ نے گلشن قربان کیا!
اسماعیلؑ سے جس سنت کی ابتدا ہوئی تھی، حسینؑ پر اس کی انتہا ہوئی!
ابراہیمؑ نے خواب سچ کر دکھلایا تو جزا کیا ملی؟

قرآن کہتا ہے: ہم نے آنے والی نسلوں کے دل میں ڈال دیا کہ انہیں یوں
خراج تحسین پیش کریں:

”سلام علی ابراہیم“ (الصافات: ۱۰۸، ۱۰۹)

حسینؑ نے خواب سچ کر دکھایا تو آج مشرق و مغرب سے، شمال و جنوب
سے، زمین و آسمان سے یہ صدا بلند ہو رہی ہے:

سلام علی حسین

حسین	تیری	جرات	کو	سلام
حسین	تیری	صداقت	کو	سلام
حسین	تیری	شجاعت	کو	سلام
حسین	تیری	قیادت	کو	سلام
حسین	تیری	امامت	کو	سلام
حسین	تیری	استقامت	کو	سلام
حسین	تیری	شہادت	کو	سلام
اللہم صل علی سیدنا محمد وآلہ وبارک وسلم				

عثمانؓ اور حسینؑ..... شہیدانِ خلافت

اسلامی سیاست کا مقصود نظامِ خلافت ہے، رسول اللہ ﷺ نے اسی کی تربیت اور وصیت فرمائی اور اس نظام کے تحفظ کا عہد لیا۔

عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ”عثمان! ہو سکتا ہے کہ اللہ تجھے ایک قمیص پہنائے، لوگ اگر تجھ سے یہ قمیص اتر وانا چاہیں تو ان کی خاطر یہ قمیص نہ اتارنا۔“ (مشکوٰۃ، مناقب عثمانؓ، عن الترمذی وابن ماجہ)

عائشہؓ ہی سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا:

”میرے ایک صحابی کو بلاؤ!

میں نے کہا: ابو بکر کو؟

فرمایا: نہیں۔

میں نے کہا: عمر کو؟

فرمایا: نہیں

میں نے کہا: آپ کے ابنِ عم کو؟

فرمایا: نہیں

میں نے کہا: عثمان کو؟

فرمایا: ہاں

جب عثمان آئے تو آپؐ ذرا ایک طرف ہٹ گئے اور انہیں اپنے بائیں بٹھالیا، (پھر

آپؐ ان سے کچھ سرگوشی کرنے لگے) اس دوران میں ان کا رنگ بدل رہا تھا!

بہت عرصے بعد شورش کے دنوں میں جب آپؐ اپنے گھر میں محصور کر دیے

گئے تو ہم (اصحاب) نے عرض کیا:

امیر المؤمنین! آپؐ قتال کیوں نہیں کرتے؟

فرمایا: نہیں، رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے ایک عہد لیا تھا، میں سختی سے اس پر قائم ہوں۔“

(مرقاۃ المفاتیح: ۱۱/۳۲۹، حوالہ مسند احمد، یہ واقعہ حضرت عثمانؓ کے غلام ابو سہلہؓ کی روایت سے الفاظ کے کچھ تغیر کے ساتھ مشکوٰۃ میں بھی ترمذی اور بیہقی کے حوالے سے مذکور ہے)
یہ عہد کیا تھا؟

روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ عہد تھا ناموس خلافت کے تحفظ کا، مرکز خلافت کی حرمت کا۔

اور حضرت عثمانؓ نے خلیفہ برحق ہونے کی حیثیت میں یہ عہد وفا کیا۔
خلافت پر جب پھر ابتلا آیا تو رسول اللہ ﷺ نے خواب میں امام حسینؑ سے ایک عہد لیا۔
(تاریخ ابن کثیر: ۸/۱۶۸)

خیال رہے کہ کسی صحابی کو رسول اللہ ﷺ خواب میں کوئی حکم دیں تو وہ یونہی ہے گویا بیداری میں حکم دیا۔

امام حسینؑ کے اقدام سے واضح ہوتا ہے کہ یہ حدودِ خلافت کے تعین و تشخیص کا عہد تھا..... اور آپؐ نے وارثِ رسول ﷺ اور امام امت ہونے کی حیثیت میں اپنا عہد خوب نبھایا۔ عثمانؓ اور حسینؑ دونوں نے اپنی جان پر کھیل کر خلافت کی حرمت کو بچایا۔ اس طرح یہ دونوں حضراتؓ قدسی صفات درحقیقت شہیدانِ خلافت ہیں۔

روح قربانی عشق ہے

اسلام نام ہے وفا شعار کی اور چاں سپاری کا، مسلم وہ ہے جو اپنے مالک حقیقی کے ہر حکم کے سامنے اپنا سر جھکا دے اور اس کی تعمیل میں اپنا تن، من، دھن قربان کر دے۔
متاع زندگی کی یہ ہمہ جہت قربانی سوزِ عشق اور جذبہٴ وفا کے بغیر ممکن نہیں۔
تو اسلام کی روح قربانی ہے اور قربانی کی روح عشق ہے!
قربانی جب عشقِ الہی سے سرشار ہوتی ہے تو شہادت بن جاتی ہے!
شہادت اللہ کے آلہ ہونے پر

شہادت اُسی کے مالک و خالق ہونے پر

شہادت اُسی کے حاکم و مختار ہونے پر

شہادت اُسی کے موجود و محبوب ہونے پر

مومن کا مقصود زندگی شہادت ہے

اور مومن سے مطلوبِ الہی بھی شہادت ہے:

چناں خود را نگہ داری کہ با ایں بے نیازی ہا
شہادت برو جو دِ خود ز خونِ دوستاں خواہی
مقامِ بندگی دیگر، مقامِ عاشقی دیگر
زنوری سجدہ می خواہی، ز خاکِ بیش ازاں خواہی

(کلیات اقبال: ۴۳۵)

صفحہ دہر پر جب کوئی شہادت جلوہ گر ہوتی ہے تو اس کے نور سے جہان روشن ہو جاتا ہے اور پورا چمن اس کی خوشبو سے مہک اٹھتا ہے اور خود شہید امر ہو جاتا ہے، سب کے لیے فنا ہے لیکن ذاتِ حی و قیوم کے عشق میں قربان ہونے والے کے لیے فنا نہیں!
ابراہیم و اسماعیل اور حسین، علیہم السلام، کی قربانیوں میں یہی جذبہٴ عشق و محبت کار فرما تھا، اسی لیے یہ قربانیاں آج تک زندہ ہیں اور قیامت تک زندہ رہیں گی۔

سورۃ العصر کی روشنی میں حسینؑ "امام العصر" ہیں

دنیا پرستوں کی نگاہ میں کامیابی چار چیزوں سے حاصل ہوتی ہے:

(۱) دولت (۲) قوت (۳) وجاہت (۴) حکومت

دولت کا نتیجہ وجاہت ہے اور قوت سے حکومت ملتی ہے۔

دولت اور قوت کا تعلق اپنی ذات سے ہے اور وجاہت و حکومت کا انبائے جنس سے۔

اہل دنیا کے یہاں حاصل زندگی یہی چار چیزیں ہیں۔

لیکن اللہ تعالیٰ سورۃ العصر میں عصر کی قسم اٹھا کر اور تاریخ عصر کو شاہد بنا کر فرماتا ہے کہ سب انسان ناکام، دولت والے بھی ناکام، قوت والے بھی ناکام، وجاہت والے بھی ناکام، حکومت والے بھی ناکام، سب خسارے میں، کامیاب صرف وہ ہیں جن میں چار اوصاف پائے جائیں، اور یہ چار اوصاف مادی اوصاف کے مقابل اور اسی ترتیب سے ہیں:

(۱) ایمان

اللہ تعالیٰ کے معبود مطلق اور حاکم مطلق ہونے پر ایمان، اللہ کی قدرتوں اور قوتوں کا یقین، اللہ کے خزانوں کا یقین۔

(۲) عمل صالح

ایمان کی کیفیت صرف دل میں نہ رہے، بلکہ اعضاء و جوارح اور ان سے صادر ہونے والے اعمال و افعال اس کے مطابق ڈھل جائیں، ایمان و یقین کا نور ظاہری اعمال سے جھلکتا دکھائی دے۔

اسلام کے عملی ارکان اربعہ: نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، اسی ایمان کی تکمیل و حفاظت کے لیے ہیں، اور ایمان کا بیج جب دل میں جڑ پکڑ لیتا ہے تو اعمال صالحہ کے برگ و بار لاتا ہے۔

ان دو چیزوں یعنی ایمان اور عمل صالح کا تعلق تکمیل ذات ہے۔
لیکن مکمل کامیابی صرف تکمیل ذات ہی سے نہیں ہوتی جب تک تکمیل
ذوات یعنی تکمیل معاشرہ کی کوشش نہ کی جائے، جو ہدایت خود پائی ہے اُسے دوسروں
تک نہ پہنچایا جائے، جس نور سے خود منور ہوا ہے، اُس کے اجالے سے جب تک
ماحول روشن نہ ہو جائے تو کامیابی کیسی؟

اس مکمل کامیابی کے لیے اللہ تعالیٰ نے دو چیزیں ارشاد فرمائیں:

(۳) تو اسی بالحق

ایک دوسرے کو حق کی وصیت، حق کی نصیحت، ایمان اور عمل صالح کی زندگی
اختیار کرنے کی تاکید، اس بارے میں فکری، نظری، علمی شبہات کے ازالے کی کوشش۔

(۴) تو اسی بالصبر

ایک دوسرے کو صبر کی وصیت و نصیحت، ایمان اور عمل صالح پر بہر حال
کار بند رہنے کی تاکید، شہوات اور لذات کے پھندوں سے بچتے رہنے کی تلقین، حق کی
راہ میں مشکلات و مصائب برداشت کرنے کی حوصلہ افزائی۔

جس معاشرے میں حق اور صبر کی ان باہم وصیتوں کا چلن ہو، اللہ تعالیٰ کی
نظر میں بس وہی معاشرہ کامیاب ہے۔

ان میں تو اسی بالحق کا ایمان سے گہرا تعلق ہے اور تو اسی بالصبر کا عمل صالح
سے، جیسے وجاہت دولت کا نتیجہ ہے اور حکومت قوت کا ثمر۔ اس سے معلوم ہوا کہ
اصل چیزیں دو ہیں، ایمان اور عمل صالح، جیسے مادی اعتبار سے دولت اور قوت
بنیادی چیزیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ العصر میں جو چار عناصر فلاح ذکر فرمائے ہیں، یہ مذکورہ
چار مادی عناصر کے لیے بہترین اصلاح اور کارگر علاج ہیں۔

دولت کا مقابلہ ایمان سے کیا جائے اور قوت کا مقابلہ عمل صالح سے،
وجاہت کی چالوں کو تو اسی بالحق سے ناکام کیا جائے اور حکومت کی قہر سامانیوں کو
تو اسی بالصبر سے ندامت آلود کر دیا جائے!

یہ چاروں مادی عناصر اگر چاروں عناصر فلاح کے تابع ہو کر ان کے فروغ
و استحکام کے لیے استعمال ہوں تو یہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں، لیکن عناصر فلاح سے
مجرد یہ مادی عناصر انسان کو ناکامی، دائمی ناکامی اور ابدی خسران سے بچا نہیں سکتے۔
قرآن نے عصر کی قسم اٹھا کر صرف دعویٰ ہی نہیں کیا، بلکہ تاریخ عصر سے
اس کی شہادتیں بھی پیش کی ہیں۔

آئیے! صحیفہ ہدایت کی روشنی میں کامیاب اور ناکام لوگوں کا مختصر سا
جائزہ لیتے ہیں:

(۱) قانبل نے قوت کے بل بوتے پر ہانبل کو قتل کیا، ہانبل نے شرافت اور عمل
صالح کا دامن نہ چھوڑا، قتل ہانبل ہوا، لیکن قرآن کہتا ہے: ”فاصبح من
الخاصرین“ (المائدہ: ۳۰) خسارے میں قانبل رہا!

سچ ہے ایمان اور عمل صالح کے بغیر: ”ان الانسان لفی خسر“!

(۲) نوح اور قوم کی کشمکش میں بھی قوت، وجاہت ہار گئی، نوح اور ان کے رفقاء
یعنی ایمان اور عمل صالح کی جیت ہوئی۔

پہاڑ یعنی غیر اللہ کا سہارا لینے والا ڈوب گیا، کیونکہ: ”انہ عمل غیر صالح“ (ہود: ۴۶)

کشتی یعنی ایمان اور عمل صالح کی پناہ میں آنے والے بچ گئے۔

جو لوگ تو اسی بالحق اور تو اسی بالصبر کرتے رہے، کامیاب ہوئے جن لوگوں

نے ان وصیتوں پر کان نہ دھرے، اندھے، بہرے بنے رہے، ناکام ہوئے: ”انہم

کانوا قوماً عمین“ (اعراف: ۶۴، نوح، ۷)

(۳) ہوڈ ایمان اور عمل صالح کی دعوت دیتے رہے، تو اسی بالحق اور تو اسی بالصبر

کرتے رہے، جن لوگوں نے مانا، کامیاب رہے، جن لوگوں نے نہ مانا قوت و طاقت کے باوجود ناکام رہے۔ (اعراف: ۷۲)

(۴) صالحؑ بھی ایمان اور عمل صالح کی طرف بلا تے رہے، لیکن ثمود اپنی قوت اور ہنر کے نشے میں مست رہے۔ صالحؑ کی نصیحتوں کو ذرہ برابر خاطر میں نہ لائے: ”نصحت لكم ولكن لاتحبون النصحين.“ (اعراف: ۷۹)

پھر تاریخ قرآنی بتلا رہی ہے کہ ایمان اور عمل صالح کی جیت ہوئی اور قوت اور ہنرمندی کچھ کام نہ آئی۔ (اعراف: ۷۸)

(۵) لوطؑ اور ان کی قوم کی کشمکش میں بھی ایمان اور عمل صالح بالآخر کامیاب رہا، کفر اور عمل سوء تباہ و برباد ہوا۔ (اعراف: ۸۳، ۸۴)

(۶) شعیبؑ ایمان اور عمل صالح کی طرف بلا تے تھے، اہل مدین صرف دولت ہی کو اپنا حاصل زندگی بنائے ہوئے تھے، اور جن خوش نصیبوں نے حضرت شعیبؑ کی بات مانی، انہیں کہتے تھے کہ تم خسارے میں رہو گے: ”لئن اتبعتم شعيباً انکم اذا لخاسرون“ (اعراف: ۹۰) لیکن انجام کار ”کانوا هم الخاسرين“ (اعراف: ۹۲) جھٹلانے والے ہی خسارے میں رہے۔ شعیبؑ اور ان کے پیروکار اللہ کی رحمت سے نجات پا گئے۔

(۷) ابراہیمؑ دور میں ابراہیمؑ یعنی ایمان اور عمل صالح کامیاب رہے اور ان کے مقابلے میں دولت، قوت، وجاہت، حکومت سب ناکام رہے: ”وارادوا به کیداً فجعلناهم الاخسرین“ (الانبیاء: ۷۰)

(۸) موسیٰؑ دور میں فرعونؑ حکومت ناکام، ہامانی قوت و وزارت ناکام، سامری وجاہت ناکام، قارونی دولت ناکام، انجام کار کامیاب ہوئے تو کون؟ موسیٰؑ اور ان کے قبیعین، جنہوں نے ایمان اور عمل صالح کی دعوت قبول کی اور تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کرتے۔ (طہ، القصص، الاعراف)

(۹) عیسیٰ کامیاب ہوئے اور مذہبی وجاہت کے بل بوتے پر سازشیں کرنے والے ناکام۔ (النساء: ۱۵۷، ۱۵۸)

(۱۰) اب تاریخ انبیاء اپنے آخری دور میں داخل ہو گئی، آخری رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ مبعوث ہوئے، آپؐ نے بھی ایمان اور عمل صالح کی دعوت دی آپؐ کی دعوت کو ناکام کرنے کے لیے دولت، قوت، وجاہت، حکومت کا ہر حربہ آزمایا گیا، لیکن کامیابی محمد رسول اللہ ﷺ یعنی ایمان اور عمل صالح کو حاصل ہوئی۔

ابولہب کی دولت اسے ناکامی سے بچانہ سکی: ”ما اغنیٰ عنہ مالہ وما کسب“ (اللہب: ۲)

ولید بن مغیرہ کی دولت، قوت اُس کے کچھ کام نہ آئی۔ (المدثر: ۱۷)
ابو جہل کی ریاست، وجاہت اس کا ساتھ چھوڑ گئی اور تکبر کا یہ پتلا ذلت اور خسارے کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا۔

محمد رسول اللہ ﷺ کو مٹانے والے اپنی آرزوؤں سمیت مٹ گئے: ”ان شانتک هو الابر“ (الکوثر: ۳)

لیکن چار دانگ عالم آج آپؐ کے ذکر سے گونج رہے ہیں: ”ورفعنا لک ذکرک“ (الانشراح: ۴)

درحقیقت یہ جیت ایمان اور عمل صالح کی جیت ہے، یہ کامیابی تو اسی بالحق اور تو اسی بالصبر کی کامیابی ہے۔

گذشتہ تفصیل سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ کامیابی صرف انبیاء کرام ہی کا مقدر ہے، نہیں، قیامت تک جو انسان بھی عناصر فلاح اپنائیں گے اور انبیاء کی راہ پر چلیں گے، کامیابی ان کے قدم چومے گی۔ فوز و فلاح کے یہ اصول انسان کے لیے ہیں، صرف انبیاء کے لیے نہیں، انبیاء تو نمونہ اور اسوہ ہیں۔

چنانچہ خلافت راشدہ کے بعد جب امت پر کڑا وقت آتا ہے تو اللہ تعالیٰ

حقیقی کامیابی کا ایک اور نمونہ پیش فرماتا ہے، عناصر فلاح کے حسین مجموعے حسینؑ کو کھڑا کیا جاتا ہے اور انبیاء کے بعد قیامت تک کے لیے انہیں حق و صداقت کا معیار قرار دے دیا جاتا ہے۔

امام حسینؑ کی کامیابی کو سمجھنے کے لیے سورہ العصر کے بیان کردہ اصول اربعہ کی روشنی میں آپؑ کی حیات طیبہ کا مختصر سا جائزہ لیتے ہیں:

(۱) ایمان

جس نے علیؑ وفا طمہ کے گھر جنم لیا ہو،

جس کے کان میں پہلی آواز اللہ اکبر کی پڑی ہو، اور وہ بھی لسان رسالت سے،
جسے گھٹی میں لعاب نبوت ملا ہو،

جس کی تربیت آغوش رسالت اور دامن ولایت میں ہوئی ہو،

اُس کی ایمانی کیفیت کا کون اندازہ کر سکتا ہے؟!

(۲) عمل صالح

آپؑ کا بچپن اور جوانی مسجد نبوی کے پر نور ماحول میں گزرے، رسالت و ولایت کی عنایتوں کے ساتھ تمام صحابہ کرامؓ کی محبتوں اور عقیدتوں کا مرکز تھے۔ ذوق عبادت فطری تھا، نماز گھٹی میں پڑی تھی، روزے کے دلدادہ تھے..... شہادت کے روز بھی روزے سے تھے اور زندگی کی آخری عبادت نماز تھی..... زکوٰۃ و صدقات میں رغبت اتنی تھی کہ تین دفعہ اپنا تمام اثاثہ اور گھربار اللہ کی راہ میں خیرات کیا..... حج کے اتنے شائق تھے اور احترام بیت اللہ اس قدر تھا کہ سواری ہونے کے باوجود پچیس مرتبہ پیدل حج کیا!

ایمان اور عمل صالح کے عناصر سے جب آپؑ کی تکمیل ذات ہو جاتی ہے اور امت کی قیادت کی ذمہ داری آپؑ کے کندھوں پر آ پڑتی ہے تو تو اسی بالحق اور تو اسی بالصر کا نور آپؑ کی شخصیت سے پھوٹتا ہے:

(۳) تو اسی بالحق

امام حسینؑ کی تو اسی بالحق آپؑ کے خطبات میں نظر آتی ہے، یہ خطبات آپؑ کے قیام کے اسباب بھی بیان کرتے ہیں اور آپؑ کے موقف کی ترجمانی بھی۔
کوفہ کی راہ میں مقام بیضہ پر دوستوں اور دشمنوں سب سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

”لوگو! رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو کوئی ایسے حاکم کو دیکھے جو ظلم کرتا ہے، اللہ کی قائم کی ہوئی حدود کو پامال کرتا ہے، عہد الہی توڑتا ہے، سنت کی مخالفت کرتا ہے، بندگان خدا پر گناہ اور سرکشی سے حکومت کرتا ہے اور دیکھنے والا دیکھنے کے بعد اپنے فعل سے اُس کی مخالفت کرتا ہے، نہ اپنے قول سے، تو ایسے لوگوں کو اللہ اچھا ٹھکانہ نہیں بخشے گا۔

دیکھو! یہ لوگ شیطان کے پیرو بن گئے ہیں، رحمان سے سرکش ہو گئے ہیں، ہر طرف فساد ہے، حدود الہی معطل ہیں، مال غنیمت پر ناجائز قبضہ ہے، اللہ کے حرام کو حلال اور حلال کو حرام ٹھہرایا جا رہا ہے۔

ان حالات میں ان کی سرکشی کو حق و عدل سے بدل دینے کا میں سب سے زیادہ حق دار ہوں“ (طبری: ۴۰۳/۵)

ذی حُسم میں ایک اور خطاب میں فرمایا:

”افسوس! تم دیکھتے نہیں کہ حق پس پشت ڈال دیا گیا ہے، باطل پر علانیہ عمل کیا جا رہا ہے،

وقت آ گیا ہے کہ مؤمن راہ حق پر چلتے ہوئے لقاے الہی کی

خواہش کرے!

میرے نزدیک موت شہادت کی موت ہے۔

اور ظالموں کے ساتھ حیات بجائے خود ایک جرم ہے۔“

(طبری: ۴۰۴/۵)

(۴) تو اسی بالصبر

یوں تو سارا سفر کربلا صبر و رضا کا مرقع ہے، لیکن درج ذیل واقعے سے امام حسینؑ کے مقام صبر کا اندازہ ہوتا ہے:

”امام علی بن حسین زین العابدینؑ بیان کرتے ہیں کہ جس رات کی صبح کو میدان شہادت گرم ہونے والا تھا، عین اسی شب کا قصہ ہے کہ میں بیمار پڑا تھا، میری پھوپھی زینبؓ میری تیمارداری میں مصروف تھیں، میرے اباؑ اصحاب کے ساتھ اپنے خیمے میں چلے گئے، ابوذر غفاریؓ کا غلام حُویؓ آپؑ کی تلوار کو صیقل کر رہا تھا، اور آپؑ چند اشعار پڑھ رہے تھے، میں سمجھ گیا کہ آپؑ کا ارادہ کیا ہے؟

میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے اور مجھے یقین ہو گیا کہ ہم پر ابتلاء الہی نازل ہو گئی ہے اور اب اس سے چارہ نہیں۔

پھوپھی جان نے بھی اشعار سن لیے، وہ ضبط نہ کر سکیں، کیونکہ عورتیں قدرتی طور پر نرم دل ہوتی ہیں، وہ چلا اٹھیں: ”ہائے بد نصیبی! کاش مجھے موت آ جاتی، آج لقاں فاطمہ، ابا علی اور بھائی حسن کی (پھر) موت ہو رہی ہے!“

حسینؑ اُن کے پاس گئے اور فرمایا:

”پیاری بہن! حلم کا دامن تھامے رکھو“

لیکن زینبؓ شدت غم و حزن سے بے قرار تھیں، وہ دیکھ رہی تھیں کہ آنے والی صبح کیسی خونیں صبح ہے، فرط غم میں چہرہ پیٹ لیا اور واویلا، واحسرتا پکارتی ہوئی بے ہوش ہو کر گر پڑیں۔

حسینؑ ان کی جانب بڑھے، ان کے چہرے پر پانی ڈالا، جب ہوش میں آئیں تو فرمایا:

”پیاری بہن! اللہ سے ڈرو اور اللہ کے فرمان کے مطابق عزا کا جو طریقہ ہے، اُسے اختیار کرو، اور خوب سمجھ لو کہ زمین والے بھی مرجائیں گے اور آسمان والے بھی باقی نہیں رہیں گے، ہر شے ہلاک ہونے والی ہے، باقی رہنے والی ذات صرف اللہ کی ہے، جس نے اپنی قدرت سے زمین کو پیدا کیا اور مخلوق کو دوبارہ پیدا کرے گا۔

تبا، لتاں، بھائی سب مجھ سے بہتر تھے۔ (وہ نہ رہے، میں بھی نہیں رہوں گا)

میرے لیے، اُن کے لیے اور ہر مسلم کے لیے (ہر معاملے میں) رسول اللہ ﷺ بہترین اُسوہ ہیں۔ (طبری بہ اختصار: ۵/۴۲۰، ۴۲۱)

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

”لیس منا من ضرب الخدود و شق الجيوب و دعى بدعوى الجاهلية“

”(غم کے موقع پر) جس نے رخسار پیٹے، گریبان پھاڑے اور جاہلی جملے کہے وہ ہم میں سے نہیں“

(متفق علیہ عن عبد اللہ بن مسعود، مشکوٰۃ: ص ۱۵۰)

نیز فرمایا:

”انا برئاً ممن حلق و صلق و عرق“

”جس نے (غم کی وجہ سے) سرمٹا ایا، چیخا، چلایا اور لباس

پھاڑا، میں اس سے بری اور بیزار ہوں“

(متفق علیہ عن ابی بردہ، مشکوٰۃ: ص ۱۵۰)

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے ان ارشادات کی روشنی میں امام حسینؑ نے اسی موقعہ پر وصیت کی:

”پیاری بہن! میں تمہیں قسم دیتا ہوں، اور میری قسم پوری کرنا، جب

میں شہید ہو جاؤں تو گریبان نہ پھاڑنا، چہرہ نہ چھیلنا اور ہائے مصیبت، وائے نصیب نہ پکارنا“ (۴۲۱/۵)

حق کی خاطر اپنی اولاد اور اعزہ کی قربانیاں پیش کرنے کے بعد خود اپنی شہادت پر امام حسینؑ نے جس انداز میں صبر کیا، اس سے اولوا العزم انبیاء کی سنت زندہ ہوئی، ہابیل کی باتیں یاد آئیں، مسیحؑ کی مظلومی اور بے کسی کے دردناک مناظر سے سر زمین کربلا لرزاٹھی، عثمانی صبر و رضا، حلم و حیا کا ایک عظیم نمونہ دنیا نے پھر اپنی آنکھوں سے دیکھا اور سورۃ العصر کا تاریخی دعویٰ ایک مرتبہ پھر اپنی حقیقتوں کے ساتھ یوں ثابت ہوا کہ:

ایمان	غالب	رہا	طغیان	مغلوب	ہوا
عمل	صالح	جیتا	فسق	و فجور	ہارا
حق	باقی	رہا	باطل	فنا	ہو گیا
صبر	بامراد	ہوا	جبر	نامراد	ہوا

حسینؑ اب بھی زندہ ہے اور عزت کے ساتھ زندہ ہے، یزید زندگی میں مر گیا اور ذلت کی موت مرا، یزید کی دولت، قوت، وجاہت، حکومت سب کچھ ہار گئی، حسینؑ کی بے چارگی، بے کسی اور کمزوری جیت گئی،

اس لیے کہ حسینؑ کے شب و روز سورۃ العصر کے سایے میں بسر ہوتے تھے، سورۃ العصر آپؐ کے رگ وریشے میں سرایت کیے ہوئے تھی، بلکہ آپ کے خمیر میں گندھی ہوئی تھی!

اور امام العصر وہی ہو سکتا ہے، سورۃ العصر جس کے خمیر میں گندھی ہو! شہادتِ امامؑ کو صدیاں بیتیں اور نہ معلوم کتنی اور بیتیں گی، لیکن سورۃ العصر شہادت دے رہی ہے کہ:

عصر حاضر کے امام حسینؑ ہیں۔

حسینؑ خیر امت ہیں

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(ترجمہ) ”تم بہترین امت ہو، جسے لوگوں کے لیے بھیجا گیا ہے، تم بھلائی کی تلقین کرتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو“ (آل عمران: ۱۱۰)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو امت کا خیر خواہ ہو، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہو اور اللہ پر ایمان رکھتا ہو، وہ امت میں بہترین ہے۔

حذیفہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، تم بھلائی کی تلقین اور برائی سے روک ٹوک ضرور کرتے رہو، ورنہ بہت جلد اللہ تم پر اپنا عذاب بھیجے گا، پھر تم دعائیں کرو گے، لیکن قبول نہ ہوں گی“ (ترمذی)

ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”تم میں جو شخص برائی دیکھے، اسے اپنے ہاتھ سے بدلے، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو اپنی زبان سے، اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو اپنے دل سے، اور یہ کمزور ترین ایمان ہے“ (مسلم)

60ھ میں خلافت کی بساط لپیٹ دی گئی اور ملوکیت کی بنیادیں رکھی

گئیں تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر لازم ہو گیا۔ اس سنگین دور میں یہ سعادت امام حسینؑ کا مقدر ٹھہری کہ آپؑ ایمانی جذبے سے کھڑے ہوئے اور اس برائی کے انسداد کے لیے جو آپؑ سے بن پڑا، آپؑ نے کیا۔

آپؑ کے قیام سے، حدیث نبوی کے مطابق، سب سے اللہ کا عمومی عذاب ٹل گیا۔

آپؑ کے قیام سے لوگوں کو شعور ملا، جذبہ حریت پیدا ہوا، خلافت کی حدود کا تعین ہوا۔

اگر امام حسینؑ قیام نہ فرماتے تو حقیقت یہ ہے کہ آج تک حقیقت مشتبہ ہی رہتی، کچھ پتہ نہ چلتا کہ خلافت کیا ہے اور ملوکیت کیا؟ ہمیں کونسا نظام اپنانا ہے اور کس نظام سے بچنا ہے؟

اگر امام حسینؑ قیام نہ فرماتے تو ملوکیت کو سند جواز مل جاتی، جیسے موسیٰ قیام نہ فرماتے تو فرعونیت قائم رہتی۔

اقبالؑ شاید اسی لیے شبیرؑ و یزیدؑ کا ذکر موسیٰؑ و فرعونؑ کے ساتھ فرماتے ہیں:

موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید

ایں دو قوت از حیات آمد پدید

اس اعتبار سے مکہ سے آپؑ روانہ ہوتے ہیں تو موسیٰؑ کی جھلک نظر آتی ہے

اور کربلا میں فروش ہوتے ہیں تو مسیحؑ کا نمونہ دکھائی دیتا ہے۔

یہ تاریخی فرض ادا کرنے پر امام حسینؑ بجا طور پر خیر امت ہیں۔

حقاً کہ بنائے لا الہ است حسینؑ

پورے دین کا حاصل لا الہ الا اللہ ہے۔ دین تو حضور ﷺ پر پورا ہو گیا لیکن اس کی تفسیر و توضیح حسب ضرورت خلفاء راشدینؑ اور صحابہ کرامؓ کے دور میں ان کے قول و عمل سے ہوتی رہی۔

اب تک لا الہ الا اللہ کے یہ مفہیم سامنے آئے تھے:

لا معبود الا اللہ

لا مسجود الا اللہ

لا مقصود الا اللہ

لا مطلوب الا اللہ

لا محبوب الا اللہ

لا خالق الا اللہ

لا رازق الا اللہ

لا حی الا اللہ

لا قیوم الا اللہ

اب تک جو روجھا کا دور ہی نہیں آیا تھا، اب جو حکومت نے خدائی کاروپ دھارا اور حاکم خدا بننے لگا تو امام حسینؑ نے لا الہ الا اللہ کا کلمہ حق بلند کیا۔

اس سے لا الہ الا اللہ کا یہ مفہوم عالم آشکار ہوا کہ:

لا حاکم الا اللہ

لا ملک الا اللہ

”ان الحکمہ لا اللہ، امر الایعبدوا الا ایاہ، ذلک الدین

القیم، ولکن اکثر الناس لا یعلمون“ (یوسف: ۴۰)

”حکم کسی کا نہیں مگر اللہ کا، اُس کا امر ہے کہ عبادت نہ کرو مگر اُسی کی، یہی سیدھا دین ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔“

معلوم ہوا کہ جو آلہ ہے، وہی حاکم ہے اور اُسی کا حکم تسلیم کرنا داخل عبادت ہے، لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے اور حاکم اور آلہ کے جدا جدا ہونے کو دین میں قابل برداشت خیال کرتے ہیں، حالانکہ دین قیم میں ہرگز اس کی اجازت نہیں۔

امام حسینؑ نے اپنی بے مثال قربانی سے لا الہ الا اللہ کا یہ مفہوم اجاگر کیا! اس لیے جس نے بھی کہا، سچ کہا:

شاہ است حسینؑ، بادشاہ است حسینؑ
 دین است حسینؑ، دین پناہ است حسینؑ
 سرداد نہ داد دست در دست یزید
 حقا کہ بنائے لا الہ است حسینؑ

اقبالؑ بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

بہر حق در خاک و خون غلطیدہ است
 پس بنائے لا الہ گردیدہ است

امام حسینؑ کی پوری جدوجہد کا حاصل لا الہ الا اللہ ہے:

وہ جبر و قہر کی تپتی فضاؤں میں سجدے
 برستے تیروں کی مہلک ہواؤں میں سجدے
 کیے امامؑ نے نیزوں کی چھاؤں میں سجدے

پیام کرب و بلا لا الہ الا اللہ
 حسینیت کی صدا لا الہ الا اللہ

حصارِ ظلم کی شدت کا جس نے توڑ دیا
ظلمِ کبر و رعونت کا جس نے توڑ دیا
غرورِ فسق کی ظلمت کا جس نے توڑ دیا

وہ روشنی، وہ ضیا لا الہ الا اللہ

حسینیت کی صدا لا الہ الا اللہ

کوتاہ فہم کہہ دیتے ہیں کہ امامؑ کا موقف تو درست تھا، لیکن وقت کا انتخاب
مناسب نہیں تھا، وہ نہیں جانتے کہ:

یہ نغمہ فصلِ گلِ ولالہ کا نہیں پابند

بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں

مجھے ہے حکمِ ازاں لا الہ الا اللہ

ہر دور میں ہر طرح کے مسائل و مشاغل کا حل لا الہ الا اللہ اور جذبہٴ حسینی ہے:

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے

صنمِ کدہ ہے جہاں لا الہ الا اللہ

حسینؑ امام امت ہیں

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(ترجمہ) ”اور یقیناً ہم تمہیں آزمائیں گے کچھ خوف اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے، اور بشارت دے دیجیے اُن صبر کرنے والوں کو کہ جب انہیں کوئی مصیبت پہنچے تو کہیں: ہم تو بس اللہ ہی کے ہیں اور ہم اُسی کی طرف لوٹنے والے ہیں، انہی لوگوں پر ان کے رب کی عنایتیں اور رحمت ہے اور یہی لوگ ہیں ہدایت یافتہ“ (البقرہ: ۱۵۵-۱۵۷)

آیت کریمہ بتلا رہی ہے کہ یہ مصائب و بلا یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائشیں ہوتی ہیں، اور جو لوگ ان آزمائشوں میں سرخ رو ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی خاص نظر عنایت اور خصوصی محبت اُن کے شامل حال رہتی ہے، پھر، حدیث نبوی کے مطابق، وہ خلقِ خدا کے بھی محبوب بن جاتے ہیں۔

قرآن مجید نے اس کی ایک بہترین مثال بھی ہمارے سامنے رکھی ہے: ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے چند باتوں (کلمات) میں آزمایا، آپ ان آزمائشوں میں پورا ترے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”انی جاعلک للناس إماماً“

”میں (بطور انعام) تجھے سب لوگوں کا امام بنارہا ہوں“

ابراہیمؑ نے عرض کیا:

”ومن ذریعتی“

”اور میری ذریت سے بھی (امام ہوگا)؟“

فرمایا:

”لاینال عہدی الظالمین“

”میرا عہد (امامت) ظالموں کو (اپنے دائرے میں) نہیں لے گا“
(البقرہ: ۱۲۴)

ابراہیمؑ امتحان میں کامیاب ہوئے تو تاج امامت سے سرفراز ہوئے! حسینؑ انہی کی ذریت سے ہیں، آپؑ کا بھی کڑا امتحان ہوا، ظالموں نے منصب خلافت پر قبضہ کیا تو آپؑ نے کلمہ عدل بلند کیا، تحفظ خلافت کی خاطر آپؑ پر خوف، بھوک اور مالوں، جانوں اور پھلوں کے نقصان کی تمام آزمائشیں آئیں، ان تمام مراحل میں آپؑ کی زبان مبارک پر ایک ہی کلمہ تھا: ”انا للہ وانا الیہ راجعون“۔
ذریت ابراہیمیؑ میں انبیاء کے بعد کون ہے جس نے حسینؑ کے انداز میں کلمہ عدل کہا ہو؟

اور کون ہے جس پر ویسے ”کلماتِ ابتلا“ آئے ہوں جیسے حسینؑ پر آئے؟
اور ذریت ابراہیمیؑ میں کوئی ایسا ظالم ہوا جس نے یزید جیسے مظالم کے ہوں اور یزید کی طرح حرماتوں کو پامال کیا ہو؟

اس لیے ابراہیمؑ نے اپنی ذریت میں جس امام کی درخواست کی، تاریخ کی روشنی میں انبیاء کے بعد اس کا سب سے بڑا مصداق سیدنا حسینؑ قرار پاتے ہیں!
ذریت ابراہیمیؑ کا یہ گل سرسبد اپنے جد امجد سیدنا ابراہیمؑ کی طرح تمام ”کلماتِ ابتلا“ میں پورا اترتا تو اللہ تعالیٰ کی عنایت و رحمت نے، حسب عہد، آپؑ کو اپنی آغوش میں لے لیا اور ہدایت و استقامت میں آپؑ کو ”امام امت“ بنا دیا!
اور اللہ تعالیٰ نے جن ظالموں کو دائرہ امامت سے باہر رکھنے کا عہد کیا، اپنے اعمال کی وجہ سے یزید اس کا سب سے بڑا مصداق بنا، اس لیے یزید کو امیر، امام، خلیفہ کہنا درست نہیں!

غالباً یہی وجہ ہے کہ جب ایک شخص نے عمر بن عبدالعزیزؒ کے سامنے یزید کو ”امیر المؤمنین“ کہا تو آپؑ نے اسے بیس کوڑے مارنے کا حکم دیا! (الصواعق المحرقة: ۲۲۱)

اللہ حسینؑ کے ساتھ ہے

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(ترجمہ) ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! (مصیبت کی گھڑی میں) صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو، یقیناً اللہ صابروں کے ساتھ ہوتا ہے۔“ (البقرة: ۱۵۳)

صبر کا مفہوم برائی برداشت کرنا نہیں، بلکہ معروف پر ڈٹ جانا اور اس کی خاطر مصائب جھیلنا صبر ہے۔

حسینؑ راہ معروف پر چلے، پھر آپ پر وہی کچھ گذرا، جو اس راہ پر چلنے والوں پر گذرتا ہے۔

حسینؑ نے نازک لمحات میں، ارشاد ربانی کے مطابق، جیسا صبر کیا، اس پر صبر کو بھی رشک آتا ہے!

رہی نماز! تو آپ سجدے ہی کی راہ سے اپنے مولا کے حضور پیش ہوئے۔
آپؑ نے ارشاد ربانی کی تعمیل کی، اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کیا اور آپ کو اپنی معیت سے سرفراز فرمایا!

یہ اللہ کی معیت ہی کا تو اثر ہے کہ دشمن آپ کو مٹانے کی کوشش میں خود مٹ گیا اور آپ کی عزت، آپ کی حرمت دن بہ دن بڑھتی چلی جا رہی ہے!

سچ ہے: ”ان الله لا يخلف الميعاد“

حسینؑ امام الشہداء ہیں

ابوسعید خدری اور طارق بن شہابؓ بجلی رسول اللہ ﷺ کا ارشاد روایت فرماتے ہیں:

”افضل جہاد ظالم سلطان کے سامنے کلمہ حق..... ایک روایت میں ہے: کلمہ عدل..... کہنا ہے۔“ (نسائی، ترمذی)

امام حسینؑ نے دور ظلم و جور میں جس شان سے افضل جہاد کیا، تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی، اور جو پہلا افضل جہاد کرتے ہوئے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرے، یقیناً وہی امام الشہداء ہے۔

کچھ لوگ حسینؑ کو امام الشہداء یا سید الشہداء کہتے ہوئے اس بنا پر ہچکچاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سید الشہداء حضرت حمزہؓ کو کہا ہے۔ سوچنا چاہئے کہ حضرت حمزہؓ سید الشہداء کیسے قرار پائے؟

شہداء کے درمیان جو سلوک شہید حمزہؓ کی نعش سے ہوا، ایسا درد انگیز رویہ کسی اور شہید کے ساتھ نہیں برتا گیا۔

حضرت حمزہؓ کو رسول اللہ ﷺ سے نسبت کا تعلق بھی تھا اور نسب کا بھی، اس لیے فطری طور پر آپؐ کو حضرت حمزہؓ کی شہادت پر جو غم ہوا، وہ کسی اور کی شہادت پر نہیں ہوا۔ ان وجوہ سے حضرت حمزہؓ کو سید الشہداء ہونے کا شرف حاصل ہے۔ امام حسینؑ کا معاملہ بھی اس سے کچھ مختلف نہیں:

آپؐ کی نعش مبارک کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا، اسے سن کر آج بھی کلیجہ پھٹتا ہے۔

آپؐ کو بھی رسول اللہ ﷺ سے نسبت اور نسب کا شرف عظیم حاصل ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ صحابہ کرامؓ کو آپؐ کی شہادت پر خواب میں نہایت

غمر وہ دکھائی دیے، اس کی روایات موجود ہیں۔

لہذا جس بنیاد پر حضرت حمزہؓ سید الشہداء ہیں اُسی بنا پر حضرت حسینؑ بھی امام الشہداء ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ حضرت حمزہؓ مشرکین کے ہاتھوں شہید ہوئے اور امام حسینؑ اپنوں کے جو رجفہ کا نشانہ بنے، اس اعتبار سے آپؑ کی شہادت کو ایک گونہ فضیلت حاصل ہے۔

تاہم اس تقابل سے قطع نظر ایک کی فضیلت دوسرے کی فضیلت کے لیے رکاوٹ نہیں، شہادتوں کے یہ دو الگ الگ سلسلے ہیں، مشرکین کے ہاتھوں شہداء کے سبب حمزہؓ ہیں اور ظالمین کے ہاتھوں شہداء کے امام حسینؑ ہیں!

اضافہ: کتاب کی اشاعت کے بعد ایک حدیث ملی، جو مضمون بالا کے لیے نص صریح ہے اور اس بارے میں تمام شبہات کے لیے قاطع ہے اور لطف یہ ہے کہ اسے عظیم حنفی فقیہ ابوبکر احمد بن علی رازی البصاص (المتوفی ۷۰۳ھ) نے اپنی سند سے امام ابوحنیفہؒ سے روایت کیا ہے۔

اور امام ابوحنیفہؒ اپنی سند سے ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

”سید الشہداء حمزہ بن عبدالمطلب ورجل قام الی امام جائز

فامرہ و نہاہ فقتلہ“

ترجمہ: ”سید الشہداء حمزہ بن عبدالمطلب ہیں اور وہ مرد مومن ہے جو کسی ظالم سربراہ کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اسے نیکی کی تلقین کی اور برائی سے روکا، تو اُس نے اُسے مار ڈالا۔“ (احکام القرآن: ۴۱/۱، آل عمران: ۱۱۰ کی تفسیر میں، المطبعة البہیہ، مصر)

فبائی حدیث بعدہ یؤمنون!

جبر و استبداد کے خلاف جدوجہد کے لیے

اسوہ امام حسینؑ ہی ہیں

دنیا میں خیر و شر کی کشمکش روز اول سے جاری ہے۔ شر و فساد کے دور میں کیا رویہ اپنایا جائے اور اشرار سے کیسے نمٹا جائے؟ اس کے لیے ہمیں اختیار سے رہنمائی ملتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے خیر القرون کو ہمارے لیے نمونہ اسی لیے قرار دیا۔

استبدادی حالات اور ظلم و جور کی حکومت میں امام حسینؑ کا اقدام ہمارے لیے قیام کی سنت قائم کرتا ہے۔ جو لوگ جبری بیعت کی بنیاد پر یزید کی جابرانہ حکومت کو جائز قرار دیتے ہیں، ان کے پاس جبر و استبداد کے خلاف جدوجہد کا کیا جواز ہے؟ انہیں ہر جبر کے زیر سایہ خاموشی سے زندگی بسر کرنی چاہیے، وہاندلی کے نتیجے میں قائم ہونے والی ہر حکومت کو خوشدلی سے تسلیم کر لینا چاہیے!

جو لوگ امام حسینؑ کے قیام کو غلط کہتے ہیں وہ آمریت کی مخالفت کیوں کرتے ہیں؟

افغان جہاد اور کشمیری جدوجہد کو درست کیوں کہتے ہیں؟

شام، لبنان، فلسطین، عراق پر تشدد کو کیوں ناپسند کرتے ہیں؟

ایسے حالات کے لیے ان کے پاس خیر القرون سے کوئی نظیر ہے؟

سچ یہ ہے کہ اگر امام حسینؑ کا اسوہ حسنہ ہمارے سامنے نہ ہو، تو جبر و استبداد

کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھ سکتا، ظلم کے خلاف کوئی تحریک نہیں چل سکتی۔

حسینؑ کو تاریخ سے الگ کر دیا جائے، آپؑ کے موقف کو تسلیم نہ کیا جائے تو

پھر آمریت و ملوکیت ہمیشہ کے لیے آپؑ پر مسلط ہو جائے گی۔

ہماری تاریخ میں حریت کی شان حسینؑ ہیں
اظہار حق و عدل کی جان حسینؑ ہیں
غیرت و حمیت کا نشان حسینؑ ہیں
حقوق انسانی کے پاسبان حسینؑ ہیں:
انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

امام حسنؑ اور امام حسینؑ

خدائی پہرے میں رہے اور منبع ذریت بنے

”ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ حسنؑ اور حسینؑ کو یوں پناہ میں دیا کرتے تھے:

”أَعِيذُكُمْ بِكَلِمَاتِ اللَّهِ التَّامَّةِ مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ وَهَامَّةٍ
وَمِنْ كُلِّ عَيْنٍ لَآمَةٍ“

”میں تم دونوں کو اللہ کے پورے پورے کلمات کی پناہ میں دیتا ہوں ہر شیطان اور زہریلے کیڑے مکوڑے سے اور ہر شرارتی اور
بری نگاہ سے“

اور فرماتے تھے کہ تمہارے ابا (ابراہیمؑ) اسماعیلؑ اور اسحاقؑ کو
انہی کلمات کی پناہ میں دیا کرتے تھے۔

(بخاری، مشکوٰۃ: باب عیادة المریض)

”کلمات اللہ“ سے مراد ہیں اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ اور اللہ تعالیٰ کی نازل
کردہ کتب۔

مقصود یہ ہے کہ تم اسماء حسنیٰ کے پہرے اور سایے میں رہو اور تمہاری زندگی
صحیفہ ہدایت و رحمت کی روشنی میں گزرے اور کوئی شیطان تمہارے قریب آنے نہ پائے!
سوچو! جنہیں خود رسول اللہ ﷺ نے کلمات اللہ کی پناہ میں دیا ہو، کیا
اُن کے قدم قرآن کے خلاف اٹھ سکتے ہیں؟

ہماری اولاد کے لیے کوئی پیر کوئی بزرگ دعا کر دے تو ہم فخر سے پھولے
نہیں سماتے اور زندگی بھر اُس کا ذکر کرتے رہتے ہیں، یہاں فخر الرسل ﷺ دعا کر
رہے ہیں اور ایک مرتبہ نہیں بار بار دعا کر رہے ہیں (کان یعود) لیکن بیمار ذہن پھر

بھی شک و ریب کی بیماری میں مبتلا ہیں۔

امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے موقف کے برحق ہونے میں آج شک اور تذبذب انہی دلوں میں پیدا ہوتا ہے، جو قرآن مجید کے بارے میں بھی شک و ریب رکھتے ہیں، اگرچہ اس کا اظہار نہ کریں، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے حسنینؑ کو قرآن کی پناہ میں دے کر یہ فرما دیا: ”لن يتفرقا“ قرآن اور اہل بیتؑ ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی جو شفقتیں، محبتیں، عنایتیں اور دعائیں امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے حصے میں آئیں، اگر ان کا کروڑواں حصہ بھی کسی اور کے نصیب میں ہو، تو لوگ اُس کی عظمتوں اور رفعتوں کے گیت گائیں! لیکن کیا کیا جائے، بغض، کینہ، تعصب اور حسد ایسے پردے ہیں، جن سے سورج بھی دکھائی نہیں دیتا۔

آخر دنیا میں اب تک ایسے لوگ بھی تو موجود ہیں جو قرآن کے بارے میں شکوک و شبہات رکھتے ہیں!

ہمارے یہاں دو طبقے ہیں:

ایک وہ ہے جو حبِ اہل بیتؑ کا دعویدار ہے، لیکن قرآن کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

دوسرا وہ ہے جو قرآن کو کتابِ حق سمجھتا ہے لیکن اہل بیتؑ کو خطا وار گردانتا ہے۔ یہ دونوں جادہ حق سے ہٹے ہوئے ہیں۔

راہ حق یہ ہے کہ قرآن اور اہل بیتؑ لازم و ملزوم ہیں، دونوں سے محبت اور دونوں کی حرمت تقاضاے ایمان ہے۔

اور یہ جو فرمایا: ”تمہارے ابا اسماعیلؑ و اسحاقؑ کو انہی کلمات کی پناہ میں دیا کرتے تھے“

اس پر ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں: (ترجمہ) ”اس میں اشارہ ہے کہ حسنؑ اور حسینؑ آپؑ کی ذریت کا منبع ہیں، جیسا کہ اسماعیلؑ اور اسحاقؑ ابراہیمؑ کی ذریت کا معدن ہیں۔“ (مرقاۃ: ۳/۳۵۴)

منبع ذریت ہونے کے علاوہ امام حسنؑ کی زندگی میں حضرت اسحاقؑ کی جھلک دکھائی دیتی ہے اور امام حسینؑ ذبیح اور مہاجر ہونے میں حضرت اسماعیلؑ سے مشابہت رکھتے ہیں۔

نکتہ: امام احمد بن حنبل نے خلق قرآن کے عقیدے کے خلاف اس روایت کو بھی اپنی حجت قرار دیا ہے، فرمایا: ”اگر کلمات اللہ مخلوق ہوتے تو رسول اللہ ﷺ حسینؑ کو ان کو پناہ میں نہ دیتے، اس لیے کہ مخلوق سے استعاذہ جائز نہیں“ (مرقاۃ: ۳/۳۵۴)

امام حسنؑ اور امام حسینؑ میں رسول اللہ ﷺ نظر آتے تھے

حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

”سینے سے سر تک حسنؑ رسول اللہ ﷺ کے شبیہ ہیں اور اس سے نیچے حسینؑ

نبی ﷺ کے مشابہ ہیں“ (ترمذی، مشکوٰۃ: مناقب اہل بیتؑ)

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد عشاق رسول ﷺ

صرف حسنؑ اور حسینؑ کی زیارت نہیں کرتے تھے بلکہ اس آئینے میں خود رسول اللہ ﷺ

کا رخ انور دیکھتے تھے، حسینؑ میں آپؐ کی گفتار، آپؐ کی رفتار، آپؐ کے اطوار اور

آپؐ کا سراپا تلاش کرتے تھے!

محبت جہاں بھی ہو، اس کے احوال یہی کچھ ہوتے ہیں!

امری القیس بن حجر بن عمر الکندی کہتا ہے:

من آل لیلیٰ واین لیلیٰ؟

وخیر مامت ماینال

”لیلیٰ کہاں؟ آل لیلیٰ سے سکون حاصل کرتا ہوں اور بہترین مقصود وہ ہے

(شعر العرب: ص ۴۴)

جو مل جائے۔“

یہی وہ حسنی چہرہ تھا، جسے دیکھ کر سیدنا ابو بکرؓ پکارا ٹھے:

”بابی شبیہ بالنبی لیس شبیہا بعلی“

”میرا باپ قربان، نبی کا شبیہ ہے، علی کا شبیہ نہیں“، صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

(بخاری: ۵۳۰۱ عن عقبہ بن الحارثؓ)

رسول اللہ ﷺ نے حسنؑ اور حسینؑ کو اپنا بیٹا یونہی قرار نہیں دے دیا تھا!

اور جسے آپؑ خود اپنا بیٹا قرار دیں، کون ہے جو ان کے نسب پر بحث کرے؟ آج کے ماہرین انساب کیا رسول اللہ ﷺ کو علم انساب سے ناواقف خیال کرتے ہیں؟! اور غور کیجئے! حسنؑ اور حسینؑ کی رسول اللہ ﷺ سے یہ مشابہت صرف ظاہر تک محدود نہیں رہی، بلکہ باطن تک سرایت کیے ہوئے ہے:

حسنؑ کو روئے سیادت ملا، حسینؑ کو پائے استقامت ملا۔

حسنؑ نور و جاہت سے منور ہوئے، حسینؑ مقام ثبات سے سر بلند ہوئے۔

حسنؑ کے نصیب میں جمالِ امن آیا تو کمالِ شجاعت حسینؑ کا حصہ قرار پایا۔

اور زہر دینے والوں نے صرف حسنؑ کو زہر نہیں دیا، رسول اللہ ﷺ کی زندہ تصویر کو زہر دیا اور امت کو آپؑ کے دیدار سے محروم کیا!

اور گھوڑے دوڑانے والوں نے صرف حسینؑ کے جسم پر گھوڑے نہیں دوڑائے، بلکہ رسول اللہ ﷺ کے نقش پا کو مٹایا، آپؑ کی رفتار اور اندازِ کار کو پامال کیا! حسینؑ کے چہرے پر چھڑی مارنے والوں نے صرف حسینؑ کی گستاخی نہیں کی بلکہ رسول اللہ ﷺ کی گستاخی کی، حضرت انسؓ کی تڑپ بلا وجہ نہیں تھی۔

اور یہ بھی کیا عجب ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو بھی زہر دیا گیا اور جو آپؑ کے رخ انور کا شبیہ تھا، اسے بھی زہر دیا گیا!

دشمنانِ اسلام نے ہمیشہ رسول اللہ ﷺ کے نقشِ قدم (سنت) کو مٹانے کی کوشش کی ہے،

کربلا کے میدان میں، خلافت کے باب میں جس نقشِ قدم کو روند ا گیا، یہ رسول اللہ ﷺ کے نقشِ قدم کا شبیہ تھا، حسی شبیہ بھی اور معنوی بھی!

ان ظالموں نے کتابِ بڑا ظلم کیا، کاش انہیں اس کا اندازہ ہوتا!

امام حسنؑ اور امام حسینؑ رسول اللہ ﷺ کے

خاص تربیت یافتہ ہیں

ابی ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حسن بن علیؑ نے صدقے کی ایک کھجور اٹھائی اور منہ میں رکھ لی، نبی ﷺ نے فوراً فرمایا: ہونہ، ہونہ، تاکہ اسے پھینک دیں، پھر فرمایا: کیا تجھے معلوم نہیں کہ ہم صدقہ نہیں کھاتے؟“

(متفق علیہ، مشکوٰۃ، باب من لا تحل لہ الصدقۃ)

یہ بالکل بچپن کا قصہ ہے، جنہیں رسول اللہ ﷺ نے بچپن میں حلال و حرام کا شعور و دیت کیا ہو اور کھجور جتنے حرام سے بھی بچایا ہو، کیا وہ حکومت اور امت کے معاملے میں کسی حرام کا ارتکاب کر سکتے ہیں؟

امام حسنؑ اور امام حسینؑ کا لڑکھڑانا اور گرنا

رسول اللہ ﷺ کو گوارا نہ ہوا

بریدہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں خطبہ دے رہے تھے کہ حسنؑ اور حسینؑ آگئے۔ ان دونوں پر سرخ (دھاری دار) قمیصیں تھیں، چلتے تھے اور لڑکھڑا کر گر پڑتے تھے، رسول اللہ ﷺ منبر سے اتر آئے، دونوں کو اٹھایا اور اپنے سامنے بٹھالیا پھر فرمایا:

اللہ نے سچ فرمایا ہے کہ ”تمہارے اموال اور تمہاری اولاد بس آزمائش ہیں“ میں نے ان بچوں کو دیکھا کہ چلتے ہیں اور لڑکھڑا کر گر جاتے ہیں، مجھے یہ برداشت نہ ہوا، یہاں تک کہ میں نے اپنی بات کائی اور ان دونوں کو (اپنے پاس) اوپر اٹھالیا“ (ترمذی، ابوداؤد، نسائی، مشکوٰۃ: مناقب اہل بیتؑ)

آپؑ نے حسنؑ اور حسینؑ کے لڑکھڑانے اور گرنے کو اس لیے برداشت نہیں

کیا کہ آپؑ کے یہ بیٹے آپؑ کے شبیہ تھے اور مستقبل میں ان کے کندھوں پر امت کی عظیم ذمہ داری پڑنے والی تھی۔ ان ذمے داریوں میں ان کا لڑکھڑانا اور گرنا خود حضور ﷺ کا لڑکھڑانا تصور ہوتا، اس لیے حضور ﷺ نے کسی دوسرے کو نہیں کہا، بلکہ خود اتر کر انہیں اٹھایا اور سنبھالا اور پھر کہیں صف میں نیچے نہیں بٹھایا بلکہ اپنے ساتھ اوپر بٹھایا۔ یہاں آپؑ نے ”رَفَعْتُهُمَا“ کا لفظ استعمال کیا ہے، اب جنہیں حضور ﷺ رفعت عطا فرما رہے ہوں اور انہیں منبر پر اپنے ساتھ بٹھا رہے ہوں، ان کا مرتبہ کون گھٹا سکتا ہے؟ کون انہیں نیچا دکھا سکتا ہے؟

یہ حضرات اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی رفیع المرتبت ہیں اور اللہ کی مخلوق کے دلوں میں بھی بلند مقام رکھتے ہیں، اور:

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا!

حسینؑ کی پیاس نے رسول اللہ ﷺ کو بے چین کر دیا

طبرانی نے ثقہ راویوں کی سند سے روایت کیا ہے کہ:

”حضرت ابو ہریرہؓ کی آخری بیماری کے ایام میں مروان عیادت کے لیے حاضر ہوا۔ باتوں باتوں میں کہا: ہماری آپ کی جتنا عرصہ صحبت رہی، مجھے آپ کی کسی بات پر غصہ نہیں آیا لیکن آپ کی صرف ایک بات مجھے ہمیشہ بری لگی اور وہ ہے حسن اور حسین سے آپ کی محبت!

اس پر ابو ہریرہؓ سیدھے ہو بیٹھے اور فرمایا:

میں شہادت دیتا ہوں کہ ایک مرتبہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے۔ راستے میں کسی جگہ رسول اللہ ﷺ نے حسن اور حسین کے رونے کی آواز سنی، یہ دونوں اپنی اماں جان کے پاس تھے، آپ سواری تیز کر کے ان کے قریب پہنچے، پھر میں نے آپ کو یہ فرماتے سنا:

”میرے بیٹوں کو کیا ہوا؟“

حضرت فاطمہؓ نے عرض کیا: ”پیاس!“

رسول اللہ ﷺ پانی لینے کے لیے جلدی سے ایک مشکیزے کی جانب بڑھے، لوگ زیادہ تھے اور پانی اُن دنوں کہیں کہیں ملتا تھا، آپ نے زور سے پکارا:

”کیا کسی کے پاس پانی ہے؟“

ہر شخص نے اپنے اپنے مشکیزے میں ہاتھ ڈالا، لیکن کسی کو بھی ایک قطرہ پانی نہ ملا۔

اس پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہؓ سے فرمایا:

”ان میں سے ایک مجھے پکڑاؤ“

انہوں نے پردے کے نیچے سے ایک آپ کو پکڑا دیا، آپ نے اُسے اپنے

سینے سے چمٹا لیا، وہ آپؐ کی گود میں چھپ رہا تھا، چپ نہیں ہو رہا تھا، آپؐ نے اپنی زبان نکالی اور اُسے چُسمانے لگے، آہستہ آہستہ اُس کا رونا تھم گیا اور اُسے سکون ہو گیا، جبکہ دوسرا مسلسل رو رہا تھا، آپؐ نے فرمایا:

”یہ دوسرا بھی مجھے دے دو“

چنانچہ دوسرے کو بھی آپؐ نے اپنی زبان چسائی اور وہ بھی چپ ہو گیا۔
مجھے بتلاؤ حسنؑ اور حسینؑ سے رسول اللہ ﷺ کی اتنی محبت دیکھنے کے بعد بھی میں ان سے محبت نہ کروں!“

(در السحابہ: ۳۰۶)

یہ واقعہ کھول کھول کر بیان کر رہا ہے کہ امام حسنؑ اور امام حسینؑ سے محبت درحقیقت رسول اللہ ﷺ سے محبت ہے۔ لیکن جن لوگوں نے اسلام سے صرف جاہ و اقتدار کا فائدہ اٹھایا، وہ محبت کی ان نزاکتوں کو کیا سمجھیں! یزیدی اور مروانی قلوب اہل بیتؑ کی محبت سے خود تو خالی ہیں ہی، دوسروں کے دل میں بھی اہل بیتؑ کی مودت کو برداشت نہیں کر سکتے۔

اور اتنے بغض کے ساتھ ایمان کہاں جمع ہو سکتا ہے!

اور جس حسینؑ کی ذرا سی پیاس رسول اللہ ﷺ سے برداشت نہ ہوئی، ظالموں نے اُسی حسینؑ کو پورے گھرانے سمیت کئی دن پیاسا رکھ کر شہید کیا !

فانا لله وانا اليه راجعون

حسینؑ سے محبت رکھنے والا اللہ کا محبوب ہے

اسامہ بن زیدؓ سے روایت ہے کہ ”میں ایک رات کسی کام کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپؐ باہر تشریف لائے تو آپؐ کسی چیز کو لپیٹے ہوئے تھے، مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ کیا ہے؟

جب میں اپنے کام سے فارغ ہوا تو میں نے عرض کیا کہ آپؐ کس چیز کو لپیٹے ہوئے ہیں؟

آپؐ نے چادر ہٹائی تو حسنؑ اور حسینؑ آپؐ کی پشت سے چمٹے ہوئے تھے، آپؐ نے فرمایا:

”یہ میرے بیٹے ہیں، میری بیٹی کے بیٹے ہیں، اے اللہ! میں ان سے محبت رکھتا ہوں تو بھی ان سے محبت فرما اور جو ان سے محبت رکھے، اُس سے بھی محبت فرما“
(ترمذی، مشکوٰۃ: مناقب اہل بیتؑ)

امام حسنؑ کے فیصلوں کو نبوی تائید حاصل ہے

(۱) ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ ”رسول اللہ ﷺ حسنؑ بن علیؑ کو اپنے کندھے پر اٹھائے ہوئے تھے، ایک شخص نے دیکھا تو کہا:

لڑکے! تجھے خوب سواری ملی ہے!

اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”سوار بھی تو خوب ہے!“

(ترمذی، مشکوٰۃ: مناقب اہل بیتؑ)

اس میں مستقبل کی طرف بھی اشارہ ہے کہ آئندہ زندگی میں امام حسنؑ نبوت کے راستے پر چلیں گے اور ان کا بوجھ رسول ﷺ خود اٹھائیں گے۔

(۲) معاویہؓ سے روایت ہے کہ ”رسول اللہ ﷺ حسنؑ کی زبان چوستے تھے،

اور جس زبان کو رسول اللہ ﷺ نے چوسا ہو، اسے اللہ کبھی عذاب نہیں دے گا۔“

(احمد، مرقاة: ۱۱/۳۸۰)

اُس زبان کو بھی عذاب نہیں دے گا اور اُس زبان سے کبھی عذاب کا فیصلہ بھی نہیں ہونے دے گا۔

(۳) ابی بکرہ ثقفیؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ ”رسول اللہ ﷺ منبر پر تشریف فرما ہیں، حسنؑ بن علیؑ آپ کے پہلو میں بیٹھے ہیں، رسول اللہ ﷺ کبھی لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور کبھی حسنؑ کی طرف، اور فرما رہے ہیں:

”میرا یہ بیٹا سید ہے، مجھے امید ہے کہ اللہ اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو عظیم گروہوں کے درمیان صلح کرائے گا“ (بخاری: ۵۳۰/۱)

امام حسینؑ کو رسول اللہ ﷺ سے الگ نہیں کیا جاسکتا

یعلیٰ بن مرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں،

اللہ اُس سے محبت کرے جو حسین سے محبت کرے،

حسین ایک پورا قبیلہ ہے۔“

(ترمذی، مشکوٰۃ: مناقب اہل بیتؑ)

اس سے معلوم ہوا کہ امام حسینؑ کی شخصیت رسول اللہ ﷺ سے الگ نہیں

ہے۔ آپؐ کی سوچ رسول اللہ ﷺ کی سوچ میں ڈھلی ہوئی اور آپؐ کا عمل رسول

اللہ ﷺ کے عمل میں ڈھلا ہوا ہے، آپؐ کا ہر قدم رسول اللہ ﷺ کے نقش قدم پر

اٹھا اور آپؐ کا ہر فیصلہ رسول اللہ ﷺ کی رضا کے مطابق ہوا۔

جو امام حسینؑ کی اس شخصیت کو تسلیم کرے، رسول اللہ ﷺ کی زبان

مبارک سے اُس کے لیے محبوب الہی ہونے کی بشارت ہے۔

دشمنوں نے کربلا میں آپؐ کے خاندان کا نام و نشان مٹانا چاہا لیکن رسول

اللہ ﷺ نے فرمادیا تھا کہ حسینؑ ایک پورا قبیلہ ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی

پیشگوئی پوری ہو کر رہی اور اب:

ہر عہد میں ہے زندہ جاوید شہید

ہر دور ہے ظالم کے لیے مرگِ جدید

شبیرؑ کے فرزند تو لاکھوں ہیں مگر

ڈھونڈو بھی تو ملتی نہیں اولادِ یزید

سچ ہے: ”ان شانک هو الأبر“

حسینؑ جو انانِ جنت کے سردار ہیں

ابی سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
 ”حسنؑ اور حسینؑ جنتی جوانوں کے سردار ہیں“

(ترمذی، مشکوٰۃ: مناقب اہل بیتؑ)

امام حسنؑ اور امام حسینؑ دونوں جوانی کی عمر کے بعد شہید ہوئے، تو کیا وجہ ہے کہ انہیں جنتی جوانوں کا سردار قرار دیا؟

بات یہ ہے کہ ان حضرات قدسی صفات نے ادھیڑ عمری اور بڑھاپے میں وہ عظیم کارنامے کر دکھلائے، جو جوانوں کو بھی نصیب نہ ہوئے۔

اس لیے ان حضراتؑ کو عالم شباب میں شہادت کی راہ سے جنت میں داخل ہونے والوں کی سیادت عطا کی گئی۔

رسول اللہ ﷺ تو امام حسنؑ اور امام حسینؑ کو جوان شہداء کا سردار بنائیں اور کچھ لوگوں کو ان کی شہادت ہی میں شبہ ہو!

لاحول ولا قوة الا بالله العلیٰ العظیم.

حسینؑ گلشن رسالت کے مہکتے پھول ہیں

عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
 ”حسنؑ اور حسینؑ دونوں میری دنیا کے مہکتے پھول ہیں“

(بخاری: ۵۳۰۱/۱)

انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: اپنے اہل بیت
 میں آپؐ کو سب سے زیادہ پیارا کون ہے؟
 فرمایا: ”حسن اور حسین“

آپؐ فاطمہؓ سے فرمایا کرتے تھے: ”میری خاطر میرے بیٹوں کو بلاؤ،
 (جب وہ آتے) تو آپؐ انہیں سونگھا کرتے اور اپنے ساتھ چمٹا لیتے“

(ترمذی، مشکوٰۃ: مناقب اہل بیتؑ)

یقیناً ان پھولوں سے شہادت اور جنت کی خوشبو آتی ہوگی، جیسا کہ رسول
 اللہ ﷺ انہیں سونگھا کرتے تھے اور انہیں اپنے ساتھ چمٹا کر سکون حاصل کیا کرتے تھے۔
 شامل میں ہے کہ ”حضور اکرم ﷺ کو کدو پسند تھا“۔

اس تذکرے میں اگر کوئی شخص کہے کہ مجھے تو پسند نہیں!

فتویٰ ہے کہ یہ شخص کافر ہو جائے گا، اس لیے کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کی

پسند کو حقیر جانا۔

سوچیے! کدو کو حضور ﷺ سے جو نسبت حاصل ہے، اس کی توہین تو کفر ہو
 اور جو گلشن رسالت کے پھولوں سے نہ صرف بغض رکھے بلکہ انہیں مسل دے، وہ کیسے
 مسلمان رہ سکتا ہے!

رسول اللہ ﷺ کو زیادہ پیارا، زیادہ اونچا

حضرت عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ ”میں نے اسامہ بن زیدؓ کا وظیفہ ساڑھے تین ہزار مقرر کیا اور اپنے بیٹے عبد اللہؓ کا تین ہزار۔“

عبد اللہؓ نے کہا: آپ نے اسامہ کو مجھ پر فضیلت کیوں دی، واللہ وہ کسی معرکہ میں مجھ سے آگے نہیں رہا!

میں نے کہا: اس لیے کہ اُس کا باپ رسول اللہ ﷺ کو تیرے باپ سے زیادہ پیارا تھا اور وہ خود رسول اللہ ﷺ کو تجھ سے زیادہ پیارا تھا، تو میں نے رسول اللہ ﷺ کے پیارے کو اپنے پیارے پر ترجیح دی۔“ (ترمذی، مشکوٰۃ: مناقب اہل بیت) فاروق اعظمؓ کے اس فیصلے پر کسی کو اعتراض ہے تو بولے!

محبت کی وجہ سے اسامہؓ کا یہ مقام ہے تو امام حسنؓ اور امام حسینؓ کا کیا مقام ہو گا؟ اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

سیدنا علیؑ کا بارگاہ رسالت میں مقام

سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
 ”علی! میرے ہاں تیرا وہی مقام اور مرتبہ ہے، جو موسیٰ کے ہاں
 ہارونؑ کو حاصل تھا، مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں“
 (متفق علیہ، مشکوٰۃ: مناقب علیؑ)

ہارونؑ حضرت موسیٰ کے بھائی تھے، علیؑ بھی رسول اللہ ﷺ کے بھائی
 تھے، طور پر جاتے ہوئے موسیٰ نے ہارونؑ کو اپنا خلیفہ بنایا تھا، تبوک جاتے ہوئے
 رسول اللہ ﷺ نے بھی علیؑ کو اپنا خلیفہ بنایا، لیکن ہارونؑ حضرت موسیٰ کے ساتھ مقام
 نبوت پر بھی فائز تھے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے معاوضات فرمادی، تاکہ پہلے
 ارشاد سے کوئی کج فہم غلط استدلال نہ کر سکے۔

علیؑ وزیر نبی ﷺ

قرآن مجید میں ہے کہ حضرت موسیٰ کو جب رسالت عطا ہوئی تو انہوں نے
 ایک دعا یہ کی:

”اور میرے گھرانے سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنا
 دے، اس کے ذریعے میری کمر مضبوط کر دے اور اسے میرے
 کام میں شریک کر دے، تاکہ ہم مل کر کثرت سے تیری پاک
 شان بیان کریں اور کثرت سے تیرا ذکر کریں، یقیناً تو ہمارے
 حال کو خوب دیکھنے والا ہے“
 (طہ: ۲۹-۳۵)

رسول اللہ ﷺ صرف نام بدل کر یہی دعا حضرت علیؑ کے لیے کرتے تھے۔
 اسماء بنت عمیسؓ (زوجہ سیدنا ابی بکرؓ) سے روایت ہے کہ ”میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ
 کہتے ہوئے سنا: اے اللہ! میں بھی وہی دعا کرتا ہوں، جو دعا میرے بھائی موسیٰؑ نے کی تھی:

”اللهم اجعل لی وزیراً من أهلی، علیاً اخی، اشد دبه
أزری، وأشر که فی أمری، کی نسبحک کثیراً
ونذکرک کثیراً، انک کنت بنا بصیراً“

(مسند احمد، مرقاة: ۱۱/۳۳۷)

زہے نصیب، جسے یہ دعا نصیب ہوئی!

حبِ علیؑ..... ایمان کی علامت
بغضِ علیؑ..... نفاق کی علامت

عبداللہ بن حنطب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
”لوگو! میں تمہیں اپنے قرابت دار، اپنے بھائی اور اپنے ابن عم علی
سے محبت کی وصیت کرتا ہوں، کیونکہ علی سے محبت بس مؤمن رکھتا
ہے اور علی سے بغض صرف منافق رکھتا ہے۔ جس نے اس سے
محبت کی، اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے اس سے بغض
رکھا، اس نے مجھ سے بغض رکھا“

فاطمہ زہراؑ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”پورا پورا اور حقیقی سعادت مند بس وہ ہے جو علی سے محبت رکھے،

اُس کی زندگی میں بھی اور اس کی موت کے بعد بھی“ (مسند احمد، مرقاة: ۱۱/۳۳۸)

فاطمہ زہراؑ..... جمال مصطفیٰ ﷺ

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: ”میں نے چال ڈھال، بول چال، نشست و برخاست میں کسی کو فاطمہؑ سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ سے مشابہ نہیں دیکھا.....“

(ترمذی، ابوداؤد، مرقاة: ۱۱/۳۷۷)

حضرت عائشہؓ ہی کا بیان ہے: ”میں نے فاطمہ کے ابا (ﷺ) کے سوا کسی کو فاطمہ سے زیادہ سچا نہیں دیکھا۔“

(مرقاة: ۱۱/۳۷۷)

فاطمہ زہراؑ..... پیکر حیا

سیدہ فاطمہ زہراؑ کی پوری سیرت شہادت دیتی ہے کہ آپؑ سراپا حیا تھیں، ایسا لگتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا وصف حیا پیکر زہراؑ میں مجسم ہو گیا تھا!

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بھی آپؑ کی حیا کی لاج رکھی کہ شب کی تاریکی میں اپنے پاس بلایا، آخرت میں بھی آپؑ کی حیا کی لاج رکھے گا۔

ابن حجر مکیؒ الصواعق: ۱۹۰ پر حضرت ابویوبؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے اور ابن اثیر جزریؒ اسد الغابہ: ۵۲۳/۵ پر اپنی سند متصل کے ساتھ حضرت علیؑ سے روایت کرتے ہیں کہ:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جب قیامت قائم ہوگی تو عرش کے پردوں میں سے ایک پکارنے والا پکارے گا:

”یا اهل الجمع نکسوا رؤسکم وغضوا ابصارکم حتی تمر

فاطمة بنت محمد علی الصراط“

”قیامت میں جمع ہونے والو! اپنے سر جھکا لو اور اپنی نگاہیں نیچی رکھو یہاں

تک کہ محمد کی بیٹی فاطمہ صراط سے گزر جائیں“ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

سیدہ زینبؑ بنت فاطمہؑ کے مزار پر غیبی پہرہ

تاریخ تھی ۳ جمادی الاولیٰ ۱۲۲۲ھ ۴ جولائی ۲۰۰۳ء، اور جمعہ کا دن تھا۔ مجھے ایک دوست نے کھانے پر بلایا، کھانے کے دوران میں دوست کے والد محترم نے باتوں باتوں میں ذکر کیا کہ ”مجھے بیس پچیس سال پہلے شام جانا ہوا، دمشق کی سیر کرتے ہوئے مزارات پر بھی حاضر ہوا۔

حضرت علیؑ اور سیدہ فاطمہؑ زہراؑ کی دختر اور امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی ہمیشہ سیدہ زینبؑ کے مزار محترم پر جب حاضر ہوا تو احاطے میں داخل ہونے سے پہلے گارڈ نے مجھے ہدایت کی:

”لاشف فوقک“ یعنی مزار شریف میں اوپر نظر نہ اٹھانا۔

میں اندر داخل ہو گیا، فاتحہ پڑھی، بیٹھ گیا اب میرے اندر تجسس پیدا ہوا، میں نے اوپر دیکھا تو کسی نے میرا سر نیچے کر دیا، میں نے دائیں بائیں دیکھا، کوئی نہیں تھا، میں اسے اپنا وہم سمجھا، پھر سر اٹھایا، پھر کسی نے میرا سر نیچے دبا دیا، تیسری مرتبہ جو اوپر دیکھنے کی کوشش کی تو سختی سے سر نیچے جھکا دیا گیا، میرے دل پر ایک رعب اور ہیبت طاری ہو گئی اور میں جلدی سے وہاں سے نکل آیا۔

میں نے جو یہ بات سنی تو چونک اٹھا، میں نے کہا: پھر بیان کیجئے۔ انہوں نے پھر یہ بات یونہی بیان کی، تو میں نے انہیں حدیث بالاسنائی اور عرض کیا کہ سیدہ زینبؑ کے لیے حرمت کا یہ غیبی پہرہ درحقیقت سیدہ فاطمہؑ زہراؑ کی حرمت کا تسلسل ہے، آپ پر اللہ کی رحمت ہوئی کہ سر جھکا دیا گیا اور آپ خاموشی سے چلے آئے۔ جو لوگ اس حرمت کا لحاظ نہیں رکھتے، ماضی کی طرح آج بھی رسوا ہو رہے ہیں اور روز محشر بھی رسوا ہوں گے۔

فاطمی نسبت کی ہیبت

اہل حدیث مکتب فکر کے سرخیل ہیں حضرت مولانا میاں نذیر حسینؒ بن سید جواد علیؒ، ان کی سوانح حیات میں مذکور ہے:

”آپ داد ہال اور تہیال دونوں جانب سے نقوی حسینی ہیں..... میاں صاحب چوتیسویں پشت میں جناب امیر علیہ السلام کے ہیں اور محمد رسول ﷺ سے پینتیسویں، حسن اتفاق یہ ہے کہ حضرت امام حسن اور امام مہدی آخر الزماں علیہما السلام کے سوا اس سلسلہ نسب میں دس امام موجود ہیں۔“ (الحیاء بعد المماتہ: ۱۶)

آپ کی زندگی کا یہ واقعہ کتنا بصیرت افروز ہے:

”ایک دن عطاء اللہ مرحوم سوداگر پنجابی (جو اکثر آپ کے حضور میں حاضر رہتے تھے) کہنے لگے کہ: ”ان (میاں صاحب) سے بہت ڈرتا ہوں۔“

پوچھا: سبب؟

کہنے لگے کہ ”ایک دن ان کے ایک دشمن نے ارادہ کر لیا کہ آج ان کو قتل کر ڈالے، چنانچہ رات کے وقت تلوار لے کر حبش خاں کے پھانک میں چھپ کر گھات میں رہا کہ نماز عشاء کے لیے مسجد جاتے ہوئے یا وہاں سے گھر آتے ہوئے قتل کر دے۔ الغرض اسی موقع پر جب اس نے جاتے یا آتے دیکھا تو پینترا بدل، تلوار سوت کر آپ کے سامنے آ پہنچا۔

آپ نے ڈانٹ کر کہا: ”اگر میں بنی فاطمہ ہوں تو تو اپنے ارادے میں کبھی کامیاب نہ ہوگا۔“

یہ کہنا تھا کہ اُس کے بدن میں لرزہ پڑ گیا، تلوار ہاتھ سے گر گئی اور وہ اپنے گھر کو بھاگا۔ گھر پہنچا تھا کہ اُس کے پیٹ میں شدید درد ہوا، یہاں تک کہ زندگی سے جب مایوسی ہو گئی تو لوگوں کو بلا کر اُس نے کہا کہ میں غضب الہی میں مبتلا ہوں اور صورت حال یہ ہے۔ چنانچہ اُسی کی زبان سے اس واقعے کی اشاعت ہوئی اور اُسی دن وہ مر گیا۔“ (الحیاء بعد المماتہ: ۱۲۸)

امام حسنؑ اور امام حسینؑ اپنے آباء کرام علیہم السلام کے

وارثانِ برحق ہیں

حضرت فاطمہ زہراؑ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی آخری بیماری کے ایام میں حسنؑ اور حسینؑ گولے کر خدمت والا میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: ”یا رسول اللہ! یہ دونوں آپ کے بیٹے ہیں، انہیں وراثت میں کچھ عطا کر دیجیے!“ فرمایا: ”حسنؑ کو تو میں نے اپنی ہیبت (ایک روایت میں: ”اپنی ہیبت“ ایک اور روایت میں ہے: ”اپنی ثابت قدمی“) اور اپنی سیادت دی اور حسینؑ کو اپنی جرأت (ایک روایت میں: ”اپنی بلند ہمتی اور دوراندیشی“) اور اپنا جود بخشا“ (طبرانی، مناقب علیؑ والحسینؑ، ۲۲۹: ۲۳۰، درالسحابہ: ۳۰۹) یہ ایک سائنسی حقیقت ہے کہ ماں باپ کی عادات اور خیالات کے اثرات اولاد میں منتقل ہوتے ہیں۔

آج بھی امام حسنؑ اور امام حسینؑ پر اعتراض کرنے والے بیٹے کو باپ کی سیاست کا وارث قرار دیتے ہیں، پیر کے بیٹے میں پیرانہ خصوصیات دیکھتے ہیں، مہتمم کے بیٹے میں اہتمام کی خوبیاں تلاش کرتے ہیں، باپ کے انتقال پر بیٹے کو صرف اس لیے امیر تسلیم کر لیتے ہیں کہ باپ کی نسبت بیٹے میں منتقل ہو گئی۔

مولانا محمد منظور نعمانی مرحوم حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ کی وفات کے حالات میں، ان کے بیٹے مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ کی خلافت کے بارے میں لکھتے ہیں:

”... اس وقت میری ناقص نگاہ میں مولانا محمد یوسفؒ صاحب میں کوئی خاص امتیاز سوائے صاحبزادگی کے نہیں تھا اور اپنے علم و انداز کے مطابق تبلیغی کام سے تو ان کو گہری دلچسپی بھی نہیں تھی..... اس لیے مجھے اس (جانشینی کے) واقعہ کو سن کر کوئی خوشی نہیں ہوئی بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اپنے بزرگوں کے بارے میں بھی طرح طرح کے

..... اگلے دن صبح کو جب مولانا محمد یوسف صاحبؒ نے فجر کی نماز پڑھائی اور نماز کے بعد حضرتؒ کے معمول کے مطابق تقریر شروع فرمائی تو تھوڑی دیر کے بعد میں نے محسوس کیا کہ یہ تو مولانا محمد یوسف کی زبان سے حضرتؒ بول رہے ہیں..... انتقال نسبت کا لفظ سنا بھی تھا اور کتابوں میں پڑھا بھی تھا، لیکن اس کا مشاہدہ اُس دن پہلی دفعہ ہوا۔

”اس عاجز نے اور غالباً ہر دیکھنے والے نے حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی زندگی میں تین باتیں بہت ہی غیر معمولی درجہ میں دیکھیں:

(۱) دین کا درد و فکر (۲) اللہ تعالیٰ پر اعتماد و یقین

(۳) معارف و حقائق کا فیضان.....

پھر حضرت مولاناؒ کے وصال کے بعد ہر دیکھنے والے نے کھلی آنکھوں سے دیکھا کہ یہ تینوں باتیں دفعتاً حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ میں آ گئیں اور ان تینوں میدانوں میں وہ بہت تیز رفتاری بلکہ برق رفتاری سے بڑھتے رہے۔“

(سوانح مولانا محمد یوسفؒ: ۲۱۰-۲۱۳)

لیکن جب روایت مذکورہ بالا بیان کی جاتی ہے تو یہی قبیلہ فکر امام حسنؑ اور امام حسینؑ اور رسول اللہ ﷺ کی سیاست و سیادت، جرأت و سخاوت، علیؑ کی شجاعت و ولایت اور فاطمہؑ کی صداقت و طہارت کا وارث تسلیم کرنے سے ہچکچاتا ہے اور امامینؑ ہمامین کے اقدامات میں انہیں حرص، جاہ پسندی اور مہم جوئی کی بوسنگھائی دیتی ہے۔ کیا رسول اللہ ﷺ، حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہؑ کی نسبت ضعیف تھی کہ منتقل نہ ہو سکی؟

یا امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی اہلیت ناقص تھی کہ یہ حضرات اپنے مقدس و مطہر آباء کرام علیہم السلام کے وارث نہ بن سکے؟

یاد رکھیے! امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے موقف پر اعتراض درحقیقت ان کی نسبت مقدسہ پر اعتراض ہے۔

نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا

نسبت کے احترام کے حوالے سے ایک ایمان افروز اور سبق آموز واقعہ ملاحظہ ہو۔

حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ بانی دارالعلوم دیوبند کے بارے میں بیان کرتے ہیں: ”ایک دفعہ حضرت نانوتویؒ مراد آباد تشریف لے گئے، جانا آگے تھا، مراد آباد میں ٹھہرے اور پروگرام میں یہاں صرف ایک دن قیام تھا۔

لوگوں نے مزید ٹھہرنے کے لیے اصرار کیا اور اس اصرار میں علماء، امراء بھی شامل تھے، لیکن حضرت انکار کرتے رہے۔

کسی نے مشورہ دیا کہ چودہ پندرہ سال کا ایک لڑکا ہے، فلاں دفتر میں کلرک ہے، اسے بلاؤ، وہ ٹھہرا سکے گا۔

جب وہ آیا تو حضرت ادب سے اپنی مسند چھوڑ کر کھڑے ہو گئے، جھک کر مصافحہ کیا اور اپنی جگہ پر اسے بٹھایا، خود مؤدب ہو کر سامنے بیٹھ گئے۔ اس نے کہا: حضرت! جی چاہتا ہے کچھ مزید ٹھہر جائیں۔

فرمایا: بہت اچھا

ٹھہر گئے اور اتنا ٹھہرے کہ ایک ہفتہ گزر گیا، پھر اسی لڑکے نے آ کر اجازت دی تو حضرت روانہ ہوئے۔

بات یہ تھی کہ حضرت کے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ تھے اور حاجی صاحب کے شیخ میاں جی نور محمدؒ تھے، یہ لڑکا میاں جی کا نواسہ لگتا تھا، تو کسی کی بات نہ مانی، اس لڑکے کی بات مانی، یہ صرف شیخ کی نسبت کا ادب تھا۔“

(خطبات حکیم الاسلام: ۳/۲۶۶)

بائی دارالعلوم دیوبند تو شیخ کی نسبت کی یوں لاج رکھیں اور آج دیوبند سے فکری و علمی نسبت کے کچھ مدعی رسول اللہ ﷺ کی تمام نسبتوں کو فراموش کریں اور دشمنان اہل بیتؑ کے وکیل صفائی بنیں!

ہمیں تفاوت رہ از کجاست تا کجا

دہرے پیمانے

کچھ لوگ امیر معاویہؓ کے نام کے ساتھ ”سلام اللہ و رضوانہ علیہ“ لکھتے اور بولتے ہیں، لیکن امام حسینؑ، اور اہل بیتؑ کے اسماء گرامی کے ساتھ اگر ”علیہم السلام“ بولا جائے تو فوراً تشیع کا الزام دیتے ہیں، حالانکہ ہمارے قدیم لٹریچر میں سلف صالحین اہل بیتؑ کی تعظیم کے لیے ”علیہم السلام“ لکھتے چلے آئے ہیں۔

اسی حلقے کے ایک بزرگ کا انتقال ہو گیا، اتفاق سے اس دن سورج کو گرہن لگا، تو انہوں نے اپنے ترجمان رسالے کے ٹائیٹل پر انتقال کی خبر گہنائے سورج کے فوٹو کے ساتھ شائع کی، جبکہ رسول اللہ ﷺ نے واضح طور پر فرما دیا تھا کہ سورج یا چاند گرہن کا کسی کی موت یا حیات سے کوئی تعلق نہیں کہ اس میں شرک کا شائبہ پایا جاتا ہے۔

اور لطف یہ کہ اس خبر کو سیاہ حاشیہ پہنا کر ماتمی رنگ میں شائع کیا گیا! پھر انہی بزرگ کے احوال زندگی پر مشتمل ایک شمارہ خاص شائع ہوا، اس سے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے!

”اللہ تعالیٰ نے انہیں کتنی مقبولیت عطا کی اور لوگوں کے دلوں میں کسی طرح ان کی محبت ڈالی، اس ضمن میں ایک واقعے کا ذکر بے جا نہ ہوگا:

جماعت کے رکن اور مرحوم کے بہت قریبی ساتھی..... کی اہلیہ تعزیت کے لیے آئیں تو بتانے لگیں کہ صبح کی نماز کے بعد مجھے سپیکر پر اپنے بیٹے کی اتنی آواز سنائی دی: ”ہمارے..... اور پھر خاموشی!

تین دفعہ ایسا ہی ہوا، آخری چوتھی دفعہ اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا: ”ہمارے..... کا انتقال ہو گیا ہے۔“

اور پھر روتے ہوئے کہنے لگیں: ”آپ یقین کریں، اس دن ہماری پوری

بستی میں کسی نے چولہا نہیں جلایا۔“

جی ہاں! اپنی محبوب شخصیت کے بارے میں تو یہ احوال پسند کیے جاتے ہیں، لیکن اگر امام حسینؑ کے صدمہ جانکاہ کو یاد کر کے کسی کو رونا آ جائے، کوئی کھانا نہ پکائے اور کھانا نہ کھائے تو کہتے ہیں ”یہ شیعہ ہے۔“

حالانکہ محبت کے آثار تو سب جگہ ایک سے ہی ہوتے ہیں!
ایک صاحب لکھتے ہیں:

”مرحوم میرے ساتھ میرے والد صاحب کے پاس آئے اور کہا کہ میں اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں اگر آپ اجازت دیں تو.....؟ والد صاحب نے فرمایا: ”اسے ساتھ لے جانے کے لیے آپ کو کسی اجازت کی ضرورت نہیں، یہ آپ کا اپنا بچہ ہے۔“

اور امام حسینؑ کے اعزہ نے اگر اپنے بچے ان کے ہمراہ کیے اور ان پر قربان کیے تو کہتے ہیں: ”خود بھی مرے رشتہ داروں کو بھی مروایا“ فانا لله وانا الیہ راجعون پھر لکھتے ہیں: ”مجھے ہر اس شخص سے نفرت ہے جس نے مرحوم کو قصداً دکھ دیے خواہ وہ میرے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں، اس لیے میں کسی کے آنسوؤں سے متاثر نہیں ہوتا، زندگی میں جس شخص کے ساتھ دو قدم نہ چلے، اب اس پر مرثیے لکھنے سے کیا ہوگا“ اور جس نے امام حسینؑ کو دکھ دیے، یہ حلقہ اُسی کی محبت میں مبتلا ہے، اُس کی رشتہ داری کو یاد کرتا ہے اور کٹاں سر سامنے رکھ کر آنسو پکانے کو اُس کی عظمت قرار دیتا ہے! مزید لکھتے ہیں:

”جس درخت سے پیار ہوتا ہے اُس کے پھل بھی پیارے لگتے ہیں۔ ہمیں فلان بزرگ کی اولاد سے اسی لیے پیار ہے، دراصل ان سے مل کر ہم اُن سے قربت محسوس کرتے ہیں۔“

بالکل اسی طرح اگر رسول اللہ ﷺ سے اور علیؑ و فاطمہؑ سے پیار ہو تو ان

کے پھلوں حسنؑ حسینؑ سے پیار ہونا ایک فطری تقاضا ہے، اور جب حسنؑ اور حسینؑ کے قاتلوں اور ظالموں سے محبت رکھی جائے اور ان کی منقبت بیان کی جائے تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ دراصل رسول اللہ ﷺ سے محبت میں کمی ہے! ایک اور بات بڑے پتے کی لکھی!

”ہمارے لیے..... کے سب بچے محبوب کی تصویریں ہیں، کوئی شخص محبوب کی تصویروں کو بگاڑ کر محبوب سے محبت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔“

تو جن لوگوں نے شبیہ نبی ﷺ پر گھوڑے دوڑائے، سراقہ نیرے پر چڑھایا، اہل بیتؑ کو بیٹریاں پہنائیں، پھر جن مقتدر لوگوں نے انہیں تحفظ دیا، یقیناً ان کے دل محبت رسول ﷺ سے خالی تھے، اور اب ان لوگوں کی وکالت و حمایت کرنے والے بھی یقیناً محبت سے تہی دامن میں، اور کیا عجب ہے کہ ان لوگوں نے اپنے پیاروں کے لیے محبت کا پیمانہ اور رکھا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے پیاروں کے لیے محبت کا پیمانہ اور! دیکھیے ایسے لوگوں کے لیے قرآن کیا کہتا ہے:

”وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا أَكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ۝

وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوْ وَزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ“ (المطففين: ۱-۳)

اہل بیتؑ سے صلح و جنگ

رسول اللہ ﷺ سے صلح و جنگ ہے

زید بن ارقم سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے علی، فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کے بارے میں فرمایا:

”جس نے ان سے جنگ کی، میری بھی اُس سے جنگ ہے اور جس نے ان سے صلح رکھی، میری بھی اُس سے صلح ہے“ (ترمذی، مشکوٰۃ: مناقب اہل بیتؑ) اس ارشاد گرامی نے واضح کر دیا کہ ان حضرات اہل بیتؑ کی شخصیات کو رسول اللہ ﷺ سے الگ کر کے دیکھا جاسکتا ہے نہ پڑھا جاسکتا ہے۔ اب ہر شخص کو اپنا مقام اور انجام خود متعین کرنا چاہیے کہ وہ اہل بیتؑ کے بارے میں کیا نقطہ نظر اور کیسے جذبات رکھتا ہے!

اللہ تعالیٰ سے محبت رکھنے والا

اہل بیتؑ سے بھی محبت رکھے گا

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”اللہ سے محبت کرو، اس لیے کہ وہ تمہیں نعمتیں بخشتا ہے، اور اللہ کی محبت کی وجہ سے مجھ سے محبت کرو، اور میری محبت کی وجہ سے میرے اہل بیتؑ سے محبت کرو“

(ترمذی، مشکوٰۃ: مناقب اہل بیتؑ)

اس ارشاد گرامی نے واضح کر دیا کہ اللہ، رسول اللہ ﷺ اور اہل بیتؑ کی محبت میں تفریق نہیں ہو سکتی، ایک کی محبت دوسرے سے اور دوسرے کی محبت تیسرے سے لازم ہے، جو ان میں کسی ایک کی محبت سے محروم ہے، وہ درحقیقت سب کی محبت سے محروم ہے!

حسینؑ نہ صرف حیاتِ نبوی میں بلکہ وفاتِ نبوی

کے بعد بھی آپ ﷺ کے زیرِ تربیت اور زیرِ ہدایت رہے

محدث احمد بن حجر ہیتمی مکیؒ (المتوفی ۹۷۲ھ) رقمطراز ہیں:

(ترجمہ) ”امام حسنؑ کو (بیت المال سے معاہدے کے مطابق) ایک لاکھ سالانہ عطیہ

ملتا تھا، ایک سال معاویہؓ نے یہ عطیہ روک لیا، اس کی وجہ سے شدید تنگی ہوئی۔

امام حسنؑ فرماتے ہیں: میں نے دوات منگوائی کہ معاویہؓ کو اپنا حال لکھوں،

لیکن پھر میں رک گیا، اس کے بعد میں نے خواب میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھا،

آپؐ نے پوچھا: حسن! کیسے ہو؟

میں نے عرض کیا: ٹھیک ہوں ابا جان! اس کے ساتھ میں نے عطیے میں

تاخیر کی شکایت کی۔

فرمایا: کیا تم نے دوات منگوائی تھی کہ اپنا حال اپنے جیسے مخلوق کو لکھے؟

عرض کیا: جی یا رسول اللہ! تو میں کیا کروں؟

فرمایا: یہ دعا کرو:

”اللَّهُمَّ اقْذِفْ فِي قَلْبِي رَجَاءَكَ واقْطَعْ رَجَائِي عَنْكَ

سِوَاكَ حَتَّى لَا أَرْجُو أَحَدًا غَيْرَكَ

اللَّهُمَّ وَمَا ضَعُفْتُ عَنْهُ قُوَّتِي وَقَصُرَ عَنْهُ عَمَلِي وَلَمْ

تَنْتَه إِلَيْهِ رَغْبَتِي وَلَمْ تَبْلُغْهُ مَسْأَلَتِي وَلَمْ يَجْرِ عَلَيَّ

لِسَانِي مِمَّا أُعْطِيتُ أَحَدًا مِنَ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ مِنْ

الْيَقِينِ فَخُصِّنِي بِهِ يَا أَرْحَمَ الرَّحِمِينَ“

”اے اللہ! میرے دل میں بس اپنے سے امید پیوست فرما دے

اور اپنے سوا سے میری امید کاٹ دے، یہاں تک کہ میں تیرے

سو کسی سے امید نہ رکھوں

اے اللہ! آپ نے اولین و آخرین میں سے کسی کو جو یقین عطا فرمایا ہے اور میری قوت اس کے بارے میں کمزور رہی، میرا عمل اس کے بارے میں کوتاہ رہا، میری رغبت کی اس تک رسائی نہ ہوئی، میری مانگ اُس تک پہنچ نہ سکی اور میری زبان پر وہ جاری نہ ہوا، تو اس (یقین کی دولت) سے مجھے مخصوص فرما اے ارحم الراحمین!

امام حسنؑ فرماتے ہیں: واللہ ایک ہفتہ نہیں گزرا تھا کہ معاویہؓ نے پندرہ لاکھ بھیج دیے۔

میں نے کہا: ”الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي لَا يَنْسِي مَنْ ذَكَرَهُ وَلَا يُخَيِّبُ مَنْ دَعَاهُ“

”سب تعریف اُس اللہ کی جو اپنے ذاکر کو نہیں بھولتا اور اپنے سے دعا کرنے والے کو ناامید نہیں کرتا“

اس کے بعد پھر میں نے نبی ﷺ کو خواب میں دیکھا، آپؐ نے پوچھا: حسن! کیسے ہو؟

میں نے عرض کیا: بخیر ہوں یا رسول اللہ! اور پورا قصہ بیان کیا۔

آپؐ نے فرمایا: میرے پیارے بیٹے! جو صرف خالق سے امید رکھے، مخلوق

سے کوئی امید نہ رکھے، اس سے ایسا ہی معاملہ ہوتا ہے۔“ (الصواعق المحرقة: ۱۴۰)

سوچنے کی بات ہے کہ جس پدر مہربان ﷺ نے ایک ذاتی معاملے میں

اپنے عزیز بیٹے کی یوں نگرانی فرمائی، امت اور خلافت کے معاملے میں کیا انہوں نے

اپنے بیٹوں کو بے ہدایت رہنے دیا ہوگا؟

ہرگز نہیں، اس لیے کہ یہ حضرات اپنے اپنے دور میں صرف آپؑ کے بیٹے ہی نہ تھے، امت کے امام بھی تھے۔

اس خواب پر، اور اس جیسے دوسروں خوابوں پر، کسی کو تعجب نہ ہونا چاہیے، یہ حضور ﷺ کا معجزہ ہے، اور معجزے کی حقیقت یہ ہے کہ فعل اللہ کا ہوتا ہے، صادر پیغمبر کے ہاتھ سے ہوتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے، حضور اکرم ﷺ کی صورت مبارکہ میں لطیفہ ہدایت ظاہر فرما دیتا ہے۔

آپ ﷺ کا یہ سلسلہ معجزات اب بھی جاری و ساری ہے، اس لیے کہ آپ ﷺ کی رسالت کا دور جاری ہے!

(نوٹ: امام حسنؑ اور رسول اللہ ﷺ نے جو دعا تلقین فرمائی، آج بھی کوئی شخص سات رات یہ دعا کرے تو اپنی مراد پائے، ہاں نماز کی پابندی اور حلال روزی ضروری ہے)

امام حسینؑ رسول اللہ ﷺ کے جسم اطہر کا ایک ٹکڑا ہیں

ام الفضلؑ لبابہ بنت حارث، جو حضرت عباسؑ بن عبدالمطلب کی اہلیہ اور ام المومنین میمونہؑ کی ہمشیرہ ہیں، بیان کرتی ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: یا رسول اللہ! میں نے آج رات بہت برا خواب دیکھا ہے!

فرمایا: کیا خواب ہے؟

عرض کیا: بہت بھاری ہے

فرمایا: کیا ہے؟

عرض کیا: میں نے دیکھا گویا آپؐ کے جسم سے ایک ٹکڑا کاٹا گیا اور میری گود میں رکھا گیا۔

فرمایا: تو نے اچھا خواب دیکھا ہے، انشاء اللہ فاطمہؑ کے ہاں لڑکا ہوگا اور تمہاری گود میں دیا جائے گا۔

چنانچہ حسینؑ کی ولادت ہوئی اور میری گود میں ان کی پرورش ہوئی۔“

(بیہقی، مشکوٰۃ: مناقب اہل بیتؑ)

اس لیے جن لوگوں نے امام حسینؑ کو شہید کیا، انہوں نے درحقیقت رسول اللہ ﷺ کو شہید کیا!

امام حسینؑ کی شہادت پر خود رسول اللہ ﷺ

غم زدہ ہوئے اور روئے

یہی ام الفضلؓ بیان کرتی ہیں کہ ”جن دنوں امام حسینؑ میری گود میں تھے، میں ایک دن رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور حسینؑ کو آپ کی گود میں رکھا، پھر جو میری توجہ ہوئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔

میں نے عرض کیا: یا نبی اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان، آپ کو کیا ہوا؟ فرمایا: جبریل علیہ السلام میرے پاس آئے اور مجھے بتلایا کہ میری امت میرے اس بیٹے کو قتل کرے گی۔

میں نے پوچھا: اسے؟

فرمایا: ہاں، اور اس کی تربت کی مٹی بھی لائے تھے، جو سرخ تھی“ (بیہقی، مشکوٰۃ: مناقب اہل بیت) سلمیٰ سے روایت ہے کہ ”میں ام المؤمنین ام سلمہؓ کے ہاں گئی تو وہ رو رہی تھیں۔

میں نے پوچھا: آپ رو کیوں رہی ہیں؟

فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے، یعنی خواب میں، آپ کے سر اور داڑھی پر مٹی ہے، میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کو کیا ہوا؟

فرمایا: ”حسین قتل ہو گئے، میں ابھی وہاں تھا“ (ترمذی، مشکوٰۃ: مناقب اہل بیت)

اس سے معلوم ہوا کہ شہادت حسینؑ کا صدمہ معمولی صدمہ نہیں، آپ وفات کے بعد بھی اس پر غمزدہ اور دکھی ہوئے۔

یہ واقعہ غم دس محرم کا ہے، اب باقی ایام کو چھوڑ کر دس محرم کو شادی کے لیے منتخب کرنا اور یہ دلیل دینا کہ شریعت میں اس روز شادی حرام نہیں ہے، نہایت درجہ بدذوقی اور سنگدلی ہے۔

دس محرم کو شادی یا کوئی تقریب مسرت از راہ شریعت تو جائز ہے، لیکن از راہ محبت جائز نہیں ہے۔

فرض کیجئے کسی کا پورا خاندان نہایت ظلم اور جبر سے قتل کر دیا جائے، خواتین کی توہین کی جائے اور پھر اس کی دادرسی بھی نہ ہوئی ہو، تو کیا وہ شخص زندگی بھر اس روز کو، جس روز یہ سانحہ ہوا، شادی اور خوشی کے لیے منتخب کر سکتا ہے؟ جواب یقیناً نفی میں ہے۔ تو دس محرم رسول اللہ

ﷺ کے غم و حزن کا دن ہے، اور رسول اللہ ﷺ کا غم ہم سب کا غم ہے! اضافہ: اس مقام پر کچھ احباب نے مسئلہ تشبہ کی طرف توجہ دلائی، میں نے عرض کیا کہ اگر غم میں ایک فرقے سے تشبہ ہے تو خوشی میں دوسرے فرقے سے، اور اس موقع پر غم میں تشبہ اختیار کرنے میں ایمان کی سلامتی ہے، خوشی میں تشبہ ہلاکت اور بربادی ہے، اب فیصلہ خود کیجیے کہ آپ کس بات میں تشبہ اختیار کرتے ہیں؟

اور یہ مسئلہ تشبہ ایک نازک مسئلہ ہے، اس وقت جا بجا اس کا استعمال کیا جا رہا ہے، بات یہ ہے کہ کسی طبقے کی ہر ادا غلط نہیں ہوا کرتی، ورنہ آپ دین کی کتنی چیزوں کو اس تشبہ کی وجہ سے چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

اصل بات یہ ہے کہ گردش ایام کے اس مقام پر ہمارا غم کسی فرقے کی ہم آہنگی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس لیے ہے کہ اس دن خود رسول اللہ ﷺ غمناک ہوئے اور ہم آپ کے غم میں شریک ہوتے ہیں۔ تعجب ہے کسی ہمسائے، کسی دوست کے غم میں شرکت کو تو آپ اخلاقی فرض سمجھتے ہیں، لیکن رسول اللہ ﷺ کے غم میں شرکت کو بدعت خیال کرتے ہیں۔

ذرا نا صبی سازش سمجھئے پہلے رسول اللہ ﷺ کے اہل بیتؑ کو تہ تیغ کیا پھر اس کا روائی کو خروج کے حکم سے شرعی جواز فراہم کیا، پھر اس ظلم پر اظہار غم کو بدعت قرار دیا اور آخر الامر ان ایام میں تقریبات مسرت کے انعقاد کو شریعت ٹھیرایا تاکہ یہ عظیم الشان قربانی اور اس کے مقاصد ذہنوں سے اوجھل ہو جائیں۔

کتنی سنگین سازش ہے جو شریعت کے عنوان سے پھیلائی گئی اور کتنے سادہ لوح ہیں وہ لوگ جو سنت کی محبت میں اس سازش کا شکار ہو جاتے ہیں!

کیا رسول اللہ ﷺ کا دل زخمی کرنے میں کوئی کمی رہ گئی تھی کہ اب اس سنگدلی سے پوری کی جا رہی ہے؟!

ان ایام غم میں تقریب مسرت کا انعقاد ۲۲ رجب کو کوٹھڑے بھرنے کی طرح ہے، شریعت میں ۲۲ رجب کو کوٹھڑے بھر کر صدقہ کرنے کی کہیں ممانعت نہیں ہے، تو کیوں روکا جاتا ہے اور خطبات و رسائل میں اس کی مذمت کی جاتی ہے؟ بس جس بنا پر وہاں منع کیا جاتا ہے اُسی بنا پر یہاں منع کیا جا رہا ہے۔

علاوہ ازیں مصائب اہل بیتؑ درحقیقت مصائب اسلام ہیں اور ان مصائب پر مگر یہ خود

رسول اللہ ﷺ نے کیا، صحابہ کرامؓ نے کیا، امام ابوحنیفہؒ نے کیا اور ملا علی قاریؒ نے تو اس مذکورہ بالا روایت اُم سلمہؓ کے ذیل میں امام احمد بن حنبلؒ کی سند سے یہ روایت ذکر فرمائی ہے:

(ترجمہ) ”حسن بن علیؑ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے (غم) میں جس کی آنکھیں نمناک ہوئیں یا

اس کی آنکھوں سے کوئی آنسو ٹپک پڑا تو اللہ عزوجل اسے جنت عطا فرمائے گا“ (مرقاۃ: ۱۱/۳۹۱)

مجھے اس وقت اس روایت کی قوت یا ضعف سے بحث نہیں، جس درجے کا عمل ہے، اس کے لیے اتنی روایت بھی کافی ہے، میں تو بس یہ کہتا ہوں کہ یہ روایت بیان کرنے سے اگر امام احمد بن حنبلؒ اور ملا علی قاریؒ اور اس سند کے تمام راوی بدعتی نہیں بنے، سنی ہی رہے تو میں بھی اسے نقل کر کے اور اس پر عمل کر کے سنی ہی رہوں گا، اور دو رقتہ کے سنیوں کی نسبت قرون خیر کے ان اہل سنت کی رفاقت ہمارے لیے دنیا اور آخرت میں کافی ہے۔

غمِ امامؑ کے ضمن میں ہمارا مجرمانہ رویہ

امام مظلومؑ کے غم میں آج تک جتنے آنسو بہائے گئے، اگر انہیں اکٹھا کیا جائے تو آنسوؤں کا فرات بہہ نکلے!

امام عالی مقامؑ کے مصائب پر دلوں سے اٹھنے والی آہیں اگر مجسم ہوں تو آہوں کا ہمالیہ وجود میں آجائے!

امام مظلومؑ کے غم زدگان جمع ہو کر ہاتھوں کی زنجیر بنائیں تو پوری دنیا گھیرے میں ہو!

کاش آنسوؤں کے اس فرات میں طاغوتی نظام کو ڈبوایا جاتا!

کاش آہوں کا یہ ہمالیہ عصر حاضر کے فرعونوں پر گرایا جاتا!

کاش ہاتھوں کی یہ زنجیر مظلوموں کی دھگیں بن کر ظالموں کو اسیر کرتی!

لیکن افسوس صد افسوس!

ہم نے امام متاع اسلام کی عظیم قربانی کو فرقہ بازی کی نذر کر دیا!

یہ غم بالا ہے غم اور ستم بالا ہے ستم ہے!

دکھ یہ ہے کہ وہ ستم غیروں نے کیا، یہ ستم اپنے کر رہے ہیں!

فانا لله وانا الیہ راجعون

امام حسینؑ کے قتل ناحق پر آسمان بھی رویا

سورۃ الدخان میں اللہ تعالیٰ نے قوم فرعون کی غرقابی کے تذکرے کے بعد فرمایا:

ترجمہ: ”پھر نہ رویا اُن پر آسمان اور زمین اور نہ ملی اُن کو ڈھیل“ (الدخان: ۲۹)

اس سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ اہل حق کی وفات یا شہادت پر آسمان اور زمین روتے ہیں۔ علامہ عثمانیؒ آیت مذکورہ بالا کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”روایات میں ہے کہ مومن کے مرنے پر آسمان کا وہ دروازہ روتا ہے جس سے اس کی روزی اترتی تھی یا جس سے اُس کا عمل صالح اوپر چڑھتا تھا اور وہ خطہ زمین روتا ہے، جہاں وہ نماز پڑھتا تھا یعنی افسوس وہ سعادت ہم سے چھن گئی۔ کافر کے پاس عمل صالح کا بیج ہی نہیں، پھر اس پر آسمان یا زمین کیوں روئے؟ بلکہ شاید خوش ہوتے ہوں گے کہ چلو پاپ کٹا“ ”خس کم جہاں پاک“ (تفسیر عثمانی)

حسینؑ تو سرفروشان محبت کے امام تھے، ان کے قتل ناحق پر آسمان اور زمین کیسے گریہ نہ کرتے!

ابن حجر مکیؒ روایات نقل فرماتے ہیں، اور یہ روایات در السحابہ: ۲۹۷، ۲۹۸ پر بھی منقول ہیں:

”آپؑ کے قتل کے روز آسمان شدید سیاہ ہو گیا، حتیٰ کہ دن میں تارے نظر آنے لگے۔“
”اُس دن آسمان سے خونیں بارش ہوئی“

”اُس دن جو پتھر بھی اٹھایا گیا، اس کے نیچے سے تازہ خون برآمد ہوا“

ثعلبی کا بیان ہے کہ ”قتل حسینؑ پر آسمان نے گریہ کیا اور آسمان کا گریہ اُس کی سرخی ہے“

دوسرے محدثین نے کہا: ”قتل حسینؑ کے بعد چھ ماہ آسمان کے آفاق سرخ رہے“

ابن جوزیؒ، جو روایات کی تنقید میں منفرد مقام رکھتے ہیں، یہ روایت ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

”آسمان کی سرخی کی حکمت یہ ہے کہ جب انسان غضب آلود ہوتا ہے تو چہرہ سرخ ہو جاتا ہے، ذاتِ حق جسم اور جسمانی عوارض سے پاک ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قاتلین حسینؑ پر اپنے غضب کا اظہار آسمان کی سرخی سے کیا۔“ (الصواعق: ۱۹۴)

امام حسینؑ کے قتل ناحق پر ان حوادث کے ظہور سے تعجب نہیں ہونا چاہیے، تاریخ میں ایسے واقعات ملتے ہیں، شاہد کے طور پر ایک واقعہ ہدیہ قارئین ہے۔

حضرت سیدی مولہؒ دہلی میں سلطان جلال الدین خلجی کے عہد میں ایک بزرگ ہوئے ہیں، صاحب کرامت تھے، جو دوسخا میں ممتاز تھے، آپ کی خانقاہ میں ہمہ وقت ہجوم رہتا تھا۔

خلجی کو اپنے اقتدار کے خلاف سازش کی اطلاع ملی، محض شبہ میں، دوسرے لوگوں کے ساتھ، سیدی مولہؒ کو باندھ کر لایا گیا، پہلے زخمی کیا گیا، پھر ہاتھی کے پاؤں تلے مسل ڈالا گیا۔

اس پر مولانا ضیاء الدین برٹی تاریخ فیروز شاہی میں رقمطراز ہیں:

”مجھے یاد ہے کہ جس روز سیدی مولہ کا قتل ہوا، ایک سیاہ طوفان آیا اور تاریکی چھا گئی، سیدی مولہ کے قتل کے بعد ملک میں طرح طرح کے فتور پیدا ہو گئے، بزرگوں نے کہا کہ کسی درویش کو قتل کرنا خس ہے اور کسی بادشاہ کو اس نہیں آتا، سیدی مولہ کے قتل کے بعد اس سال بارش نہیں ہوئی، دہلی میں قحط پڑ گیا اور غلہ ایک چمٹل میں ایک سیر ملنے لگا، شوالک کے علاقے میں ایک قطرہ بھی بارش نہیں ہوئی، اس زمین کے ہندو عورتوں اور بچوں کے ساتھ دہلی چلے آئے، بیس بیس اور تیس تیس آدمی ایک جگہ رہتے اور بھوک سے بے تاب ہو کر اپنے کو جمنامی غرق کر دیتے تھے، ادنیٰ لوگ سلطان اور امراء کے صدقات پر زندگی بسر کرتے تھے۔“

اور اخبار الاخیار کے مصنف کا بیان ہے:

”جس روز سیدی مولہ کا قتل ہوا، بے انداز باد و غبار فضا میں اٹھا، دنیا تاریک ہو گئی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قیامت آ گئی ہے۔ سلطان جلال الدین نے یہ حال دیکھا تو سیدی مولا سے اُس کو اعتقاد پیدا ہو گیا، جو پہلے نہ تھا۔“ (بزم صوفیہ: ۲۴۵)

ابھی حال ہی میں امریکہ نے عراق پر جو بلا جواز یلغار کی تھی، ان دنوں میں ۲۰ مارچ ۲۰۰۳ء کو یہ خبر چھپی کہ کربلا کے قریب صحرا میں گرد و غبار کا ایسا طوفان اٹھا کہ فوجی قافلے رُک گئے، چہار طرف ایسا اندھیر چھا گیا کہ آنکھیں اور دور بینیں کام نہ کرتی تھیں، سانس لینا دشوار ہو گیا، موٹی ریت نے ٹینک جام اور ہتھیار بے کار کر دیے۔ طوفان کا یہ سلسلہ کئی روز رہا۔

یہ پندرھویں صدی میں ہوا۔

پہلی صدی میں اہل بیت اطہارؑ کے قتل ناحق پر

کربلا کا آسمان اشکبار ہو،
کربلا کی زمین دلفگار ہو
اور کربلا کی فضا سو گوار ہو
تو اس پر حیرانی کیسی!

رسول اللہ ﷺ پر کیا گزری ہوگی

ابن جوزیؒ فرماتے ہیں:

”غزوہ بدر میں عباس (جو اُس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) گرفتار ہو کر آئے، تو اُن کے رونے کی آواز سے حضور اکرم ﷺ کو نیند نہیں آئی، تو حسینؑ کے رونے سے آپؐ کا کیا حال ہوا ہوگا!“

”سیدنا حمزہؓ کے قاتل وحشیؒ (قبول اسلام کے بعد) جب بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے فرمایا: مجھے اپنا چہرہ مت دکھایا کرو، جس نے میرے پیاروں کو قتل کیا، میں اس کا چہرہ دیکھنا نہیں چاہتا..... حالانکہ اسلام گزشتہ جرائم کو مٹا دیتا ہے، اس کے باوجود آپؐ کے قلب اطہر کی حالت یہ ہوئی۔“

تصور کیجئے جب رسول اللہ ﷺ اُن لوگوں کو دیکھیں گے جنہوں نے آپؐ کے لاڈلے حسینؑ کو ذبح کیا، انہیں قتل کرنے کا حکم دیا اور اہل بیتؑ کو (کجاووں کے بغیر) اونٹوں کی ننگی زینوں پر رسیوں میں جکڑ کر سوار کیا اور رسول اللہ ﷺ کی عفت مآب بیٹیوں کو بے حجاب کیا، تو آپؐ کے دل کی کیفیت کیا ہوئی ہوگی!“

(الصواعق المحرقة: ۱۹۴، ۱۹۵)

اللہ کی عدالت میں اہل بیتؑ کے قتل ناحق کا مقدمہ

رسول اللہ ﷺ خود دائر کریں گے

ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ”میں نے ایک دن دوپہر کو خواب میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھا، بال بکھرے ہیں، جسم غبار آلود ہے اور آپؐ کے ہاتھ میں خون بھری ایک شیشی ہے۔

میں نے عرض کیا: میرے ماں باپ آپؐ پر قربان! یہ کیا ہے؟ فرمایا: ”یہ حسین اور اس کے اصحاب کا خون ہے، اور آج پورا دن میں یہ خون جمع کرتا رہا ہوں۔“

ابن عباسؓ فرماتے ہیں، میں نے وہ وقت نوٹ کر لیا، پھر پتہ چلا کہ امام حسینؑ اسی وقت شہید ہوئے تھے۔“ (نیہتی، مشکوٰۃ: مناقب اہل بیتؑ)

شرعی ضابطہ ہے کہ جن مظالم کا اس دنیا میں فیصلہ نہیں ہوا یا غلط ہوا تو قیامت کے دن اُن مظالم کا فیصلہ اللہ تعالیٰ خود فرمائے گا۔

انام حسینؑ اور شہداء کربلاؑ پر جو مظالم ہوئے، ظالم حکومت کی وجہ سے دنیا میں اُن کا فیصلہ نہیں ہوا۔

اب روز جزا اللہ کی عدالت میں یہ مقدمہ رسول اللہ ﷺ خود دائر کریں گے۔ ابن عباسؓ کے خواب میں شیشی میں خون اکٹھا کرنا اسی طرف اشارہ ہے کہ یہ خون رائیگاں نہیں جائے گا، خاندان کے سربراہ کی حیثیت میں میں خود اس کا مدعی ہوں گا! اور جس مقدمے میں مدعی رسول اللہ ﷺ ہوں، مدعا علیہ یزیدی حکومت ہو اور قاضی خود اللہ جل جلالہ ہو، اس کا فیصلہ معلوم ہے!

لہذا یزید کے مناقب بیان کرنے والوں اور یزیدی اقدامات کی حمایت میں کتابیں لکھنے والوں کو اپنے انجام کی فکر کرنی چاہیے۔

علیؑ کی شخصیت میں مسیحؑ کی شخصیت کا پرتو ہے اور حسینؑ کی مظلومی میں مسیحؑ کی مظلومی دکھائی دیتی ہے

حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”تجھ میں عیسیٰ کی کچھ شان پائی جاتی ہے، یہود نے اُن سے بغض رکھا، اتنا کہ ان کی اماں پر بہتان لگا دیا اور نصاریٰ نے اُن سے محبت کی اتنی کہ انہیں وہ مرتبہ دے دیا، جو اُن کا نہیں تھا“

پھر علیؑ نے فرمایا: ”میرے حوالے سے دو طرح کے آدمی ہلاک ہوں گے: ایک مجھ سے حد سے زیادہ محبت کرنے والا جو میری غیر واقعی تعریف کرے، اور دوسرا مجھ سے بغض رکھنے والا کہ میری عداوت اُسے مجھ پر بہتان لگانے پر آمادہ کرے“ (احمد، مشکوٰۃ: مناقب علیؑ)

حضرت مسیحؑ کے بارے میں یہود بغض و عناد اور گستاخی کی وجہ سے تباہ ہوئے اور نصاریٰ محبت میں غلو اور افراط عقیدت کی وجہ سے گمراہ ہوئے۔ حضرت علیؑ کے حوالے سے بھی ایک گروہ بغض اور گستاخی کی وجہ سے ملعون قرار پایا ہے اور دوسرا گروہ محبت میں غلو کی وجہ سے گمراہ ہوا ہے۔ اس طرح امت میں حضرت علیؑ کی شخصیت مثل مسیحؑ ہے۔

اس روایت میں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ محبت میں تو آپؐ نے افراط کی قید لگائی، لیکن بغض کو مطلق رکھا، یہ اس حقیقت کو واضح کر رہا ہے کہ علیؑ کی محبت میں تو افراط باعث ہلاکت ہے، جیسا کہ نصاریٰ کا معاملہ ہوا، لیکن بغض میں افراط نہیں بلکہ ذرا سا بغض بھی مسلمان کی آخرت برباد کر دے گا۔

سیدنا علیؑ عقیدت کے علاوہ دعوت و اصلاح اور حقائق و معارف کے تمثیلاتی بیان میں اور زہد و تقویٰ میں حضرت مسیحؑ کے مثل ہیں تو آپؐ کے فرزند ارجمند

سیدنا امام حسینؑ استقامت اور مظلومیت میں سیدنا مسیحؑ کے مثل ہیں:

☆ مسیحؑ کو اپنی ہی قوم نے ستایا، امام حسینؑ کو بھی اپنی ہی قوم نے دکھ دیے،

☆ مسیحؑ شاہی جبر کا نشانہ بنے، حسینؑ بھی شاہی جبر سے ٹکرائے،

☆ مسیحؑ نے جبر کا مقابلہ صبر سے کیا، امامؑ نے بھی جبر کی چالیں صبر سے ناکام کیں،

☆ صبر کے صلے میں مسیحؑ کو اللہ نے رفعت عطا فرمائی، امامؑ کو بھی رفعت شان کا انعام ملا،

☆ مسیحؑ کے اٹھ جانے کے بعد لوگوں کو خسارے کا احساس ہوا اور وہ آپؑ کے دائرہ اتباع میں داخل ہونے لگے، امامؑ کی شہادت کے بعد بھی لوگوں کو شدید تاسف ہوا اور آپؑ کا دائرہ عقیدت بھی مسلسل وسیع ہو رہا ہے۔

☆ قرآن کے مطابق مسیحؑ قیامت کی علامت ہیں ”وَإِنَّهُ لَعَلَّمَ لِّلسَّاعَةِ“ (زخرف: ۶۱)

اور امام حسینؑ اب قیامت تک خلافت کی علامت ہیں۔

☆ اور عجب ہے کہ مسیحؑ کے رفقاء و تلامذہ بھی بہتر (72) تھے، (جیسا کہ انجیل برنباس، فصل: ۲۲۱، آیت: ۶، ۱۰ میں مذکور ہے) اور امام حسینؑ کے رفقاء بھی بہتر (72) تھے:

دشمنان چوں ریگ صحرا لا تُعد

دوستان او بہ یزداں ہم عدد

(کلیات اقبال، فارسی: ۱۱۱)

انبیاء کے ساتھ یہ مماثلت کیوں نہ ہو؟

پیغمبر اعظم ﷺ کا گھرانہ ہے اور پیغمبروں کی اولاد ہے، پیغمبرانہ عزائم اور پیغمبرانہ کردار کے وارث یہ نہیں ہوں گے تو کون ہوگا؟

یہ جو فرمایا: ”میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی مثل ہیں“

اس ارشاد کا مصداق اولین ائمہ اہل بیتؑ ہیں!

پیغمبروں کی زبان سے قاتلین حسینؑ پر لعنت

ام المؤمنین ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ جبریلؑ نے رسول اللہ ﷺ کو شہادت گاہ حسینؑ کی کچھ کنکریاں دی تھیں اور آپؐ نے انہیں ایک شیشی میں رکھوا دیا تھا، جب حسینؑ کی شہادت ہوئی تو اس شب میں نے ایک ہاتف غیبی کو یہ کہتے ہوئے سنا:

ایہا القاتلون جہلاً حسیناً

ابشروا بالعذاب والتذلیل

قد لعنتم علی لسان ابن داؤد

دوموسیٰ وحامل الانجیل

ترجمہ: ”ازراہ جہل و تعصب حسینؑ کو قتل کرنے والو! تمہیں

عذاب اخروی اور ذلت دنیوی کی بشارت ہو،

ابن داؤد، موسیٰ اور حامل انجیل عیسیٰ کی زبان سے تم ملعون قرار پائے ہو۔“

یہ سن کر میں رو پڑی اور میں نے وہ شیشی کھولی تو کنکریاں خون بن چکی تھیں“

(الصواعق المحرقة: ۱۹۳)

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسرائیلی انبیاء کرام کے یہاں شہادت

امام حسینؑ کا تذکرہ رہا۔

مدینہ میں کنکریوں کا خون بننا تعجب خیز نہیں، روایت گزر چکی ہے کہ اس دن

جو پتھر بھی اٹھایا گیا اس کے نیچے سے تازہ خون برآمد ہوا۔

گویا یہ ایسا دردناک سانحہ تھا کہ پتھروں کے دل پگھل گئے اور وہ بھی خون

کے آنسو روئے!

اور یہ تو تھیں ہی شہادت گاہ کی کنکریاں!

گذشتہ صفحات میں ام الفضلؓ کی روایت میں مذکور ہے کہ جبریلؑ نے آپؐ

کو تربت حسینؑ کی سرخ مٹی دی تھی۔

اس روایت میں مذکور کنکریاں وہی سرخ مٹی ہے، جو آپؐ نے شیشی میں رکھوادی، اور یہ شیشی ام سلمہؓ کے پاس رہی۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ حضرت عائشہؓ اور دوسری ازواج مطہراتؓ کے ہوتے ہوئے آپؐ نے جبریل امینؑ کی دی ہوئی امانت حضرت ام سلمہؓ کے سپرد کی، کسی اور کو نہیں دی!

واقعہ کساء بھی حضرت ام سلمہؓ کے یہاں پیش آیا!

مناقب اہل بیتؑ کی بہت سی روایات بھی آپؐ سے ہی مروی ہیں!

وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نگاہ نبوت سے دیکھ رہے تھے کہ دور ابتلا میں ازواج مطہراتؓ میں سے صرف ام سلمہؓ ہی زندہ ہوں گی اور وہی ان واقعات کو بیان کریں گی۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا!

اس اعتبار سے یہ روایت دلیل نبوت بھی ہے۔ صلی اللہ علیہ وآلہ وبارک وسلم

(حضرت ام سلمہؓ کا تمام ازواجؓ کے بعد ۸۴ برس کی عمر میں ۶۲ھ یا ۶۳ھ

میں انتقال ہوا۔ سیرۃ النبی ﷺ: ۲/۲۲۵)

فرات کنارے ایک ذبیحہ بائبل میں ذکر حسینؑ؟

عہد نامہ قدیم میں خداوند کا کلام، جو یرمیاہؑ نبی پر اقوام کی بابت نازل ہوا، مذکور ہے۔ شاہ بائبل بنو کدر نے شاہ مصر فرعونؑ کو شکست دی تھی، فرعون کی فوج دریائے فرات کے کنارے ”کرکمیس“ میں ڈیرا ڈالے ہوئے تھی، اس پس منظر میں مصری فوج کو ہدایات دی گئیں، ان کی ہمت بڑھائی گئی اور انتقام لینے پر ابھارا گیا، ان ہدایات کے آخر میں مذکور ہے:

”خداوند رب الافواج کے لیے شمالی سرزمین میں دریائے

فرات کے کنارے ایک ذبیحہ ہے“ (یرمیاہ: ۴۶، ۱۰)

مجھے معلوم نہیں کہ بائبل کے شارحین اس آیت کے بارے میں کیا کہتے ہیں، میں تو یہ کہتا ہوں کہ تاریخ انسانی میں فرات کنارے ”خداوند کے لیے ایک ذبیحہ“ حسینؑ کے سوا کون ہوا!

قرآن مجید میں گزشتہ امت کا ”ایک ذبح عظیم“ مذکور ہے۔ ابوالکلامؒ اور اقبالؒ کے اشارات کی روشنی میں ہماری امت کے ذبح عظیم حسینؑ ہیں، جو فرات کنارے اللہ کی راہ میں ذبح ہوئے۔

ام سلمہؓ کی مذکورہ بالا روایت سے یہ معلوم ہوا تھا کہ اسرائیلی پیغمبروںؑ میں شہادت امامؑ کا ذکر رہا، اس قرینے کی روشنی میں دیکھا جائے تو بائبل کی اس آیت میں ”ایک ذبیحہ“ سے مراد امام حسینؑ ہی ہیں، اور اس باب میں مصری فوج کو جو فتح کی بشارت سنائی گئی ہے، وہ اسی ”ایک ذبیحہ“ کے صدقے میں ہے۔

یہ خیال نہ کیا جائے کہ شہادت امامؑ اور قاتلین پر لعنت کا اب بائبل میں ذکر نہیں ملتا، اس لیے کہ قرآن کا بیان ہے کہ اہل کتاب نے تحریف و ترمیم سے اصل

کتاب کی صورت بگاڑ ڈالی ہے۔

خود رسول اللہ ﷺ کے بارے میں قرآن مجید میں ہے:

”الذی یجدونہ مکتوباً عندهم فی التوراة والانجیل“

(اعراف: ۱۵۷)

لیکن موجودہ بائبل میں صراحت سے حضور ﷺ کا ذکر کہاں ملتا ہے؟ ہاں ”انجیل برنباس“ میں موجود ہے، لیکن موجودہ مسیحی اس انجیل کی صحت کا انکار کرتے ہیں!

صحابہ کرامؓ کی اللہ تعالیٰ نے دو مثالیں بیان فرما کر بتلایا:

”ذلک مثلہم فی التوراة ومثلہم فی الانجیل“

(الفح: ۲۹)

لیکن اب بائبل میں یہ مثالیں اس حوالے سے کہاں ملتی ہیں؟

یزید کی نوخیز امارت پر انجیل میں لعنت

مسند احمد میں عامر شعمیؓ سے روایت ہے کہ عامر بن شہرؓ نے فرمایا: ”(ایک معاملے میں) میں نے دو باتیں سنی ہیں، ایک بات نبی ﷺ سے اور دوسری نجاشی سے، رسول اللہ ﷺ کو تو یہ فرماتے ہوئے سنا: ”قریش کو دیکھو، ان کا قول تو لے لو اور ان کے فعل چھوڑ دو“..... اور جب میں ہجرت کر کے حبشہ گیا تھا تو ایک دن نجاشی کے پاس بیٹھا تھا کہ اس کا بیٹا آیا اور انجیل کی ایک آیت پڑھی، میں نے اس آیت کو پہچان لیا اور اسے سمجھ کر ہنس دیا۔

نجاشی نے کہا: تم اللہ کی کتاب پر یوں ہنستے ہو؟

میں نے کہا: اللہ کی قسم جو کتاب عیسیٰؑ پر نازل کی گئی ہے، اس میں ایک آیت یہ بھی ہے: ”ان اللعنة تكون في الارض اذا كان امراءها الصبيان“ (جب ملک کے امرا بچگانہ مزاج نو جوان ہوں گے تو ملک پر لعنت پڑے گی) (مسند احمد: ۳/۴۲۸)

”اس روایت میں رسول اللہ ﷺ نے جن قریش کا ذکر کیا، اس سے مراد نوخیز قریشی امراء ہیں، جیسا کہ آپ کا ارشاد ہے:

”هلاک امتی علی یدی غلۃ سفہاء من قریش“

(مسند احمد: ۲/۲۸۸)

(”میری امت قریش کے چند بیوقوف لڑکوں کے ہاتھوں تباہ ہوگی“)

یہ بیوقوف لڑکے یزید، زیاد، عبید اللہ بن زیاد، مروان، عبدالملک بن مروان، حجاج بن یوسف وغیرہم ہیں، جن کی غلط کاریوں کی وجہ سے ساری امت پر مصیبت آئی۔ حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت حسینؑ کو شہید کرنے والے اسی قسم کے لوگ تھے..... خلفائے راشدینؓ کے بعد جب زمام حکومت بچوں کے ہاتھ میں آئی تو سارا اجتماعی نظام درہم برہم ہو گیا اور ساری امت خلفشار کا شکار ہو گئی، یہ ایسا سخت خلفشار تھا

جس کے بعد اصلاح کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی.....“ (دروس الحدیث: ۱۹۶/۱)

اس روایت سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ امام حسینؑ کے عہد کا گذشتہ انبیاء کرامؑ سے لے کر نبی آخر الزمان ﷺ تک تذکرہ رہا۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی جن لوگوں نے بچکانہ مزاج، لالچالی پن اور حرص و ہوس میں اندھے ہو کر امام حسینؑ کی مخالفت کی، پیغمبروں نے ان کے دور امارت کو باعث لعنت و ہلاکت قرار دیا ہے۔

چھ آدمیوں پر اللہ اور رسول ﷺ کی لعنت

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”چھ آدمیوں پر اللہ بھی لعنت کرتا ہے اور میں بھی ان پر لعنت کرتا ہوں، اور ہر نبی کی دعا قبول ہوتی ہے:

۱۔ کتاب اللہ میں اضافہ کرنے والا

۲۔ اللہ کی تقدیر کو جھٹلانے والا

۳۔ میری امت پر جبر و جور سے مسلط ہونے والا، تاکہ جنہیں اللہ نے عزت مند قرار دیا ہے، انہیں ذلیل کرے اور جنہیں اللہ نے ذلیل ٹھہرایا ہے، انہیں معزز بنائے۔

۴۔ اللہ کے حرم کو حلال کرنے والا۔

۵۔ میری عترت کو اللہ نے جو حرمت عطا فرمائی ہے، اُسے پامال کرنے والا۔

۶۔ سنت کو (معمولی اور غیر ضروری سمجھ کر) ترک کرنے والا“

(روح المعانی: ۲۶/۷، مستدرک حاکم: ص ۴۰، حاکم نے کہا ہے کہ یہ

حدیث معیار بخاری کے مطابق صحیح ہے، اسے نسائی، بیہقی اور رزین نے بھی روایت

کیا ہے۔ مشکوٰۃ مع مرقاۃ: ۱/۱۸۰)

اس حدیث میں حرم پاک کے ساتھ عترت پاک کا ذکر عترت کی عظمت

و فضیلت کو ظاہر کر رہا ہے اور یہ بتلا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نسبت سے حرم کا احترام

لازم ہے تو رسول اللہ ﷺ کی نسبت سے عترت کا احترام لازم ہے۔

امام حسینؑ کے قاتلوں اور گستاخوں سے خدائی انتقام

”امام حاکمؒ نے کئی سندوں سے ابو نعیم سے روایت کیا ہے کہ:
 رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جبریل نے بتلایا کہ اللہ تعالیٰ کا
 ارشاد ہے: میں نے یحییٰ بن زکریا کے خون کے بدلے میں ستر
 ہزار قتل کیے اور میں حسین بن علی کے خون کے بدلے میں بھی ستر
 ہزار قتل کروں گا“
 (الصواعق: ۱۹۹)

حضرت یحییٰ کے قتل ناحق کے بعد بنی اسرائیل میں فتنہ پھوٹ پڑا، جس میں
 ہزاروں لوگ قتل ہوئے، اسی طرح امام حسینؑ کے قتل ناحق کے بعد سے اب تک ہزاروں
 لوگ اسی حوالے سے قتل ہو چکے ہیں اور خدا جانے مزید کتنے ہوں گے۔ اس خون ریزی
 کا وبال اُن لوگوں پر ہے، جنہوں نے اپنے ذاتی اور سیاسی مفاد کے لیے ناحق قتل کیا۔
 یوں تو ہر قتل ناحق سنگین جرم ہے، لیکن پیغمبر کا قتل سنگین ترین جرم ہوتا ہے،
 یہ براہ راست اللہ تعالیٰ کے ساتھ ٹکراؤ ہوتا ہے، اس لیے اس کی سزا بھی نہایت سنگین
 دی جاتی ہے۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت حسینؑ کے خون کو
 پیغمبر کے خون کی حرمت عطا فرمائی، اس لیے کہ اپنے عہد میں آپ ہی سیدنا خاتم
 الانبیاء ﷺ کے سچے وارث اور شبیہ تھے، اس روایت سے امام حسینؑ کی عظمت
 شان بھی واضح ہوتی ہے۔

(حاکمؒ نے اس روایت کو صحیح کہا ہے، ذہبیؒ نے تصحیح میں موافقت کی ہے اور
 کہا ہے کہ یہ روایت امام مسلمؒ کی شرط کے مطابق ہے۔ الصواعق: ۲۰۰)
 ”امام زہریؒ فرماتے ہیں: جو جو لوگ امام حسینؑ کے قتل میں شریک ہوئے،
 وہ سب دنیا ہی میں خدائی انتقام کی لپیٹ میں آئے، ان میں سے کچھ قتل ہوئے، کچھ

بینائی سے محروم ہوئے، کچھ کے چہرے سیاہ ہو گئے اور کچھ تھوڑی ہی مدت میں اقتدار سے ہاتھ دھو بیٹھے۔“

(الصواعق: ۱۹۵)

امام ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: ”قاتلین حسینؑ سے خدائی انتقام کے بارے میں جو روایات وارد ہوئی ہیں، وہ اکثر صحیح ہیں۔ جو جو لوگ اس قتل ناحق میں شریک رہے، ان میں سے شاید ہی کوئی دنیوی زندگی میں آفت اور مصیبت سے بچا ہو، ان میں سے ہر شخص دنیا ہی میں کسی خوفناک مرض میں ضرور مبتلا ہوا اور اکثر تو پاگل ہو گئے۔“

(الصواعق: ۱۹۵۔ حاشیہ)

آئیے! تاریخ کی زبان سے چند قاتلوں کا عبرت ناک انجام سنتے ہیں:

یزید کا انجام

بندر کی فطرت میں خست، دغائت، مکرو فریب، حیلہ سازی اور شہوت پرستی ہے۔ غالباً اللہ تعالیٰ نے اسی لیے بنی اسرائیل کو یوم السبت کے بارے میں حیلہ سازی کی سزا یہ دی کہ انہیں بندر بنادیا۔

فرمایا: ”کونوا قردة خاسنین“ (البقرة: ۶۵، الاعراف: ۱۶۶)

یزید کی طبیعت میں بھی ایسے ہی اوصاف پائے جاتے تھے، اسی لیے انسانوں پر تسلط پانے کے باوجود اُس کا طبعی میلان جانوروں بالخصوص بندروں کی طرف رہا۔ ابن کثیرؒ یزید کے مشاغل کے ذیل میں لکھتے ہیں:

”بندروں کو زرنکار ٹوپیاں اڑھاتا تھا، ریچھ اور بندر کے درمیان لڑائی کا کھیل کھیلتا تھا، جب کوئی بندر مر جاتا تو اس پر غمگین رہتا تھا، کہا جاتا ہے کہ اس کی موت کا سبب بھی یہ ہوا کہ ایک بندر یا اٹھا کر نچا رہا تھا کہ اُس نے اسے کاٹ کھایا۔“

(تاریخ ابن کثیر: ۲۳۶/۸)

طبعی اندازہ یہ ہے کہ جیسے کتے کے کاٹنے سے انسان باؤلا ہو جاتا ہے، اسی

طرح بندر کے زہر سے بھی انسان بندر جیسی حرکتیں کرتے ہوئے مرتا ہے۔ گویا حیلہ ساز اور مکار اسرائیلیوں کی سزا کا ایک نمونہ اللہ تعالیٰ نے پھر دکھلادیا۔

کیا اب بھی یقین نہیں آتا: ”ان اللہ عزیز ذو انتقام“!

حکومت چھن گئی

یزید کی حکومت تین سال نو ماہ رہی، پھر اس کے بیٹے معاویہ کو حکومت سونپی گئی، لیکن وہ بھی اس جابرانہ حکومت کا بوجھ برداشت نہ کر سکا اور چالیس ہی دن میں حکومت سے الگ ہو گیا، پھر علیحدگی سے چالیس یا ستر روز بعد ۲۳ برس کی عمر میں اس جہان ہی سے لا ولدرخصت ہو گیا۔ (حیۃ النبیؐ ان: ۸۸، ۸۹)

جس حکومت کو خاندانی اور موروثی بنانے کے لیے اتنے جتن کیے تھے، وہ اتنی قلیل مدت میں ریت کی طرح ہاتھوں سے سرک گئی!

یوں قرآن کا بیان کس شان سے پورا ہوا:

”خسر الدنيا والآخرة، ذلک هو الخسران المبین“ (الحج: ۱۱)

نسل مٹ گئی

یزید نے امام حسینؑ اور اہل بیتؑ کو بے دریغ تہ تیغ کر کے آل محمد ﷺ کا نام و نشان مٹانا چاہا تھا، لیکن مالک الملک کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

شہادت کے وقت امام حسینؑ کی صلیبی نرینہ اولاد میں صرف امام زین العابدینؑ زندہ بچے تھے، جبکہ یزید کی موت کے وقت اُس کی صلیبی اولاد کی تعداد بیس تھی، جن میں پندرہ لڑکے تھے اور پانچ لڑکیاں۔

آج حسینی سادات تو اسلامی ممالک کے گوشہ گوشہ میں آپ کو مل جائیں گے، لیکن یزید کی نسل اُسی زمانہ سے ایسی نابود ہونا شروع ہوئی کہ آج روئے زمین پر آپ کو کوئی یہ کہنے والا نہیں ملے گا کہ میں یزید کی نسل سے ہوں:

شبیرؑ کے فرزند تو لاکھوں ہیں مگر
 ڈھونڈو بھی تو ملتی نہیں اولاد یزید
 حافظ ابن کثیرؒ نے تصریح کی ہے: ”سب ایسے ختم ہوئے کہ یزید کی نسل میں
 سے کوئی ایک بھی تو باقی نہ بچا!“
 اللہ تعالیٰ نے بالکل سچ فرمایا: ”ان شانک هو الابر“

قاتلین روندے گئے

یزیدی قاتلوں نے شہداء کربلا کی لاشوں پر گھوڑے دوڑائے تھے، اللہ تعالیٰ
 کی طرف سے اسی دنیا میں انہیں اس کی سزا ملی۔

”مختار بن ابی عبید نے انتقام کا نعرہ لگایا، بہت سے لوگ اپنی تقصیروں کے داغ
 دھونے کے لیے اُس کے ساتھ ہو گئے، انہوں نے کوفہ پر کنٹرول حاصل کر لیا، پھر
 انہوں نے قتل حسینؑ میں شریک چھ ہزار افراد کو بے دردی سے قتل کیا، ان میں قاتلوں کا
 سردار عمر بن سعد بھی شامل تھا، شمر ذی الجوشن کو تو خاص طور پر گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندنا
 گیا، کیونکہ شہداء کربلا کی لاشوں کی بے حرمتی میں یہی شخص پیش پیش تھا“ (الصواعق: ۱۹۸)
 سچ ہے: ”جزاء سینۃ سینۃ مثلھا“ (الشوریٰ: ۴۰)

خدائی آگ دریا میں بھی نہ بجھی

سذی کا بیان ہے کہ میں کربلا میں ایک شخص کے یہاں مہمان تھا، مجلس
 میں یہ بات چل نکلی کہ جس جس نے قتل حسینؑ میں اعانت کی، موت سے پہلے گرفتار
 بلا ہوا اور بدترین موت مرا۔

میزبان نے کہا: بالکل غلط ہے، میں بھی شریک تھا، مجھے تو کچھ نہیں ہوا!
 یہ شخص آخر شب چراغ درست کرنے کے لیے اٹھا، چراغ درست کر رہا تھا
 کہ آگ نے اُسے پکڑ لیا، آگ آگ چلاتے ہوئے دریاے فرات میں چھلانگ لگا

دی، لیکن آگ دریا میں بھی نہ بجھتی تھی! آخر مر گیا۔

سہی کہتے ہیں: واللہ میں نے اسے دیکھا، لگتا تھا جیسے کوئلہ ہے: (الصواعق: ۱۹۵)

پیاں نہیں بجھتی تھی

شہادت سے تین دن پہلے امام حسینؑ اور اصحاب پر پانی بند کرنے کا حکم جاری ہوا۔

کیا ستم ہے کہ جس رسول رحمت ﷺ نے ذبح سے پہلے جانور کو پانی پلانے کی تلقین فرمائی، اُس کی امت نے اُسی کی اولاد پر قتل سے پہلے پانی بند کر دیا!

عبداللہ بن ابی حصین ازدی آیا اور بڑی سرمستی سے امام حسینؑ سے کہا: ”حسین! دیکھتے ہو پانی ہے گویا وسط آسمانی ہے، واللہ! اس سے ایک قطرہ بھی نہیں چکھے گا، حتیٰ کہ پیاں سا مرے گا۔“

اس پر امام حسینؑ نے فرمایا: ”اے اللہ! اسے پیاں سا مار اور اسے کبھی نہ بخشا“

حمید بن مسلم کا بیان ہے: اس واقعہ کے بعد وہ بیمار پڑ گیا، میں عیادت کے لیے گیا، قسم ہے اُس اللہ کی جس کے سوا کوئی الہ نہیں، میں نے اسے دیکھا کہ پانی پیے جاتا تھا، پیے جاتا تھا، پیے جاتا تھا، پھر قے کر دیتا تھا، پھر پیے لگتا تھا، پیٹ بھر جاتا تھا، لیکن پیاں نہیں بجھتی تھی۔ یہی اُس کا حال رہا، یہاں تک کہ اس کی جان نکل گئی۔“

(تاریخ طبری: ۴۱۲/۵)

بد دعا کے نتیجے میں دنیوی سزا پوری ہوئی، اخروی سزا بھی، انشاء اللہ، مل کر رہے گی:

ہترس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن
اجابت از در حق بہر استقبال می آید

مجھے پیاس نے مار ڈالا

امام حسینؑ کا لشکر جب مغلوب ہوا تو آپؑ گھوڑے پر سوار ہو کر فرات کی جانب چلے۔ ایک ابانی چیخا: ”تمہیں کیا ہوا؟ حسین اور پانی کے درمیان حائل ہو جاؤ۔“ چنانچہ وہ اپنا گھوڑا بڑھا کر ساتھیوں سمیت رکاوٹ بن گیا۔

امام حسینؑ نے دعا کی: ”اے اللہ! اسے پیاسا رکھ“

ابانی نے تیر نکالا اور امام حسینؑ کے گلے میں پیوست کر دیا، امام حسینؑ نے تیر کھینچ کر نکال دیا، پھر اپنے ہاتھ پھیلائے تو وہ خون سے بھر گئے، اس موقع پر امام حسینؑ نے دعا کی:

”اے اللہ! تیرے نبی کی بیٹی کے بیٹے سے جو سلوک کیا جا رہا ہے، اُس کی میں تجھی سے شکایت کرتا ہوں!“

تھوڑی ہی مدت گزری تھی کہ اللہ نے اس پر پیاس انڈیل دی، قاسم بن اصبح کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ ٹھنڈا شربت، دودھ بھرے پیالے اور پانی کے مٹکے اس کے قریب دھرے ہوتے تھے اور وہ کہہ رہا ہوتا تھا:

”کم بختو! مجھے پلاؤ، مجھے پیاس نے مار ڈالا!“

اتنا بڑا پیالا، جس سے ایک گھروالے سیر ہو سکتے تھے، اسے پلایا جاتا، لیکن جو نہی پیالا منہ سے ہٹاتے، تڑپنے لگتا، کہتا:

”کم بختو! مجھے پلاؤ، مجھے پیاس نے مار ڈالا!“

واللہ! جتنی مدت جیا، یہی حال رہا، یہاں تک کہ اس کا پیٹ اونٹ کے پیٹ کی طرح بڑھ کر پھٹ گیا۔“

(تاریخ طبری: ۴۵۰/۵)

اندھا ہو گیا

سبط ابن جوزیؒ واقعہ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص قتل کے وقت صرف

حاضر تھا، وہ اندھا ہو گیا۔ اُس سے سبب پوچھا گیا تو بتلایا کہ میں نے خواب میں نبی اکرم ﷺ کو دیکھا، آپؐ نے آستینیں چڑھائی ہوئی تھیں، ہاتھ میں تلوار تھی اور سامنے چمڑے کا ایک دسترخوان بچھا ہوا تھا، میں نے دیکھا کہ اس پر حسینؑ کے دس قاتل ذبح کیے ہوئے رکھے ہیں، آپؐ نے مجھے لعنت ملامت کی کہ تم وہاں حاضر ہو کر اُن کی تعداد میں اضافے کا باعث بنے! اس کے بعد آپؐ نے خون حسینؑ میں ڈوبی ہوئی سلائی میری آنکھوں میں پھیر دی، صبح جب میں اٹھا تو اندھا تھا۔“

(الصواعق: ۱۹۵)

یہ بعد از وفات حضور اکرم ﷺ کا معجزہ ہے۔ امام بوصیریؒ کو آپؐ خواب میں بردہ شریف عطا فرمائیں اور وہ صحت یاب ہو جائیں تو اس پر تعجب نہ ہو تو خواب میں خون بھری سلائی پھیرنے سے یہ شخص اندھا ہو جائے تو اس پر تعجب کیوں ہو! اور اس کی آنکھوں میں خون بھری سلائی اس لیے پھیری گئی کہ یہ شخص اپنی آنکھوں سے اپنے پیغمبرؐ کے نورِ نظر کا قتل ناحق دیکھتا رہا اور اسے غیرت نہ آئی۔ امام احمدؒ سے ایک اور واقعہ مروی ہے ”کہ ایک شخص نے شہادت امام حسینؑ کے بعد یوں کہا:

”اللہ نے فاسق ابن فاسق حسین کو قتل کر دیا“

تو اللہ تعالیٰ نے اُس کی آنکھوں میں موتیا باری کر دی (سفید موتیا نکل آیا) اور وہ اندھا ہو گیا“ (الصواعق: ۱۹۶)

گویا اللہ تعالیٰ نے مزا چکھایا کہ حسینؑ اور ان کے بٹا علیؑ ان آنکھوں سے تمہیں فاسق نظر آتے تھے!

(یہاں اصل میں عبارت یوں ہے: ”رماہ اللہ بکو کبین فی عینیہ“

سفید موتیے کی شکل کو کب سے ملتی جلتی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ شہاب ثاقب سے جنی شیطانوں کو رجم کرنے کا کام لیتا ہے، اسی طرح کبھی اللہ تعالیٰ شیطان نظر

انسانوں کی رمی سفید موتیے کے کوکبوں سے کر دیتا ہے!
 اوپر تر جے میں ”موتیا باری“ کی ترکیب سے اسی مفہوم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔
 چہرہ سیاہ ہو گیا

اسی یزیدی ٹولے میں سے ایک شخص نے امام حسینؑ کا سر اقدس اپنے
 گھوڑے کی کاٹھی کی رسیوں سے لٹکایا تھا، چند ہی روز میں اُس کا چہرہ تارکول سے بھی
 زیادہ سیاہ ہو گیا۔

پوچھا گیا: تم تو عرب کے شگفتہ رُوجوان تھے؟!

اس نے بتلایا: جب سے میں نے اُس سر کی توہین کی ہے، اُس وقت سے ہر
 رات دو آدمی آتے ہیں، بغلوں میں ہاتھ ڈال کر مجھے دھکیلتے ہوئے بھڑکتی آگ کے
 پاس لے جاتے ہیں اور اوندھے منہ مجھے اُس میں دھکا دے دیتے ہیں، وہ آگ مجھے
 جھلساتی رہتی ہے، اس وجہ سے میرے چہرے کا یہ حال ہو گیا ہے!

کچھ ہی عرصہ میں یہ شخص قبیح ترین موت مر گیا“ (الصواعق: ۱۹۶)

شکل مسخ ہو گئی

منصور کا بیان ہے کہ میں نے شام میں ایک شخص دیکھا جس کی شکل خنزیر جیسی تھی۔
 میں نے پوچھا تو اُس نے بتایا کہ میں روزانہ ہزار مرتبہ علیؑ پر لعنت بھیجتا تھا
 اور ہر جمعہ کو اُن پر اور اُن کی اولاد پر کئی ہزار مرتبہ لعنت دھراتا تھا..... میں نے خواب
 میں نبی اکرم ﷺ کو دیکھا..... پھر طویل خواب ذکر کیا..... اس کے ذیل میں یہ بتایا
 کہ حسنؑ نے بارگاہ اقدس میں میری شکایت کی، اس پر حضور اکرم ﷺ نے مجھ پر
 لعنت کی اور میرے چہرے پر تھوک دیا، تھوک گرتے ہی میری شکل خنزیر جیسی ہو گئی اور
 لوگوں کے لیے نشان عبرت بن گئی ہے“ (الصواعق: ۱۹۶)

حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ: ”جمعہ کے دن مجھ پر کثرت سے صلوٰۃ بھیجا
 کرو، تمہاری صلوٰۃ مجھے پیش کی جاتی ہے“ (مشکوٰۃ، باب الجمعہ، عن اوسؓ)

لیکن اس شخص نے صلوٰۃ کے بجائے جمعہ کا دن آپؐ کی آل پر لعنت بھیجنے کے لیے مخصوص کیا، جب آپؐ کے حضور یہ عمل پیش ہوتا ہوگا تو آپؐ کے قلب اقدس کو کتنی تکلیف ہوتی ہوگی!

یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے غصے سے اس گستاخ کے چہرے پر تھوکا، چنانچہ طوق لعنت میں گرفتار ہوا اور شکل مسخ ہو گئی۔

نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ غَضَبِهِ وَغَضَبِ رَسُوْلِهِ

وصلی اللہ علی النبی الامی وآلہ وبارک وسلم

سرپاش پاش ہو گیا

میدان کربلا میں ایک شخص گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا اور امام حسینؑ کے مقابل آکھڑا ہوا، زور سے پکارا:

”کیا تم میں حسین ہے؟“

امام حسینؑ چپ رہے، جب اس نے تیسری مرتبہ یہی پکارا تو آپؑ نے اپنے اصحاب سے فرمایا:

”اے کہو، ہاں یہ حسین ہیں، تم کیا چاہتے ہو؟“

کہا: ”حسین! تمہیں آگ کی بشارت ہو“

فرمایا: تم نے جھوٹ کہا، میں تو رب غفور اور شفیع مطاع (ﷺ) کے پاس جا رہا ہوں، تم کون ہو؟

بولا! ابن حوزہ

امام حسینؑ نے یہ سن کر اپنے ہاتھ اتنے اوپر اٹھائے کہ ہمیں کپڑوں کے اوپر سے بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی، پھر آپؑ نے (اس کے نام کی مناسبت سے) دعا کی:

”اللہم حُزْهِ اِلٰی النَّارِ“ ”اے اللہ! اسے آگ میں داخل فرما“

ابن حوزہ نے طیش میں آ کر آپؑ کی جانب گھوڑے کو ایڑ لگائی، درمیان میں ایک نہر تھی، گھوڑا بدکا، اُس کا پاؤں رکاب میں پھنس گیا اور خود نیچے آ رہا، اب گھوڑا جو بھاگا تو اسے بھی گھسیٹتے ہوئے ساتھ لے گیا، اسی بھاگ دوڑ میں اس کا سر پتھروں اور درختوں کے تنوں سے ٹکراتا رہا، یہاں تک کہ مر گیا۔ (تاریخ طبری: ۴۳۱/۵)

اللہ اکبر! یہی دماغ تھا، جو بغض اہل بیتؑ سے بھرا اور سڑا ہوا تھا، فوری سزا یہ ملی کہ اپنی ہی سواری نے، اللہ کے حکم کے تحت، اسے پتھروں سے ٹکراتا کر پاش پاش کر دیا، آخرت میں کیسی سزا ملے گی، اللہ ہی بہتر جانتا ہے!

فقر و شر کا شکار ہو گیا

مالک بن نسیر نے امام حسینؑ پر تلوار سے حملہ کیا تھا، آپؑ اُس وقت لمبی ٹوپی (بزنس) پہنے ہوئے تھے، تلوار ٹوپی کاٹ کر سر مبارک تک پہنچ گئی اور ٹوپی خون سے بھر گئی، اس وقت امام حسینؑ نے فرمایا تھا:

”اس کے بدلے کھا سکے نہ پی سکے اور اللہ تیرا حشر ظالموں کے ساتھ کرے“

اس کے ساتھیوں کا بیان ہے کہ ”اس کے بعد وہ فقر و شر میں مبتلا رہا، یہاں تک کہ موت نے آدبوچا۔“

کوڑھی ہو گیا

شہادت کے بعد ”بحر بن کعب“ نے امام حسینؑ کا لباس اتار لیا اور جسم مبارک بربد کر دیا..... انا للہ وانا الیہ راجعون، انا للہ وانا الیہ راجعون، انا للہ وانا الیہ راجعون..... پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ بحر بن کعب کے دونوں ہاتھوں سے موسم سرما میں گندا پانی رستار ہتا تھا اور موسم گرما میں دونوں ہاتھ یوں سوکھ جاتے تھے، گویا لکڑیاں ہیں“

(تاریخ طبری: ۴۵۱/۵)

حذر اے چہرہ دستاں کہ سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

خدائی چھری نے گستاخِ امامؑ کا بھیجا چاٹ لیا

انسؓ فرماتے ہیں کہ ”میں ابن زیاد کے پاس بیٹھا تھا، جب حضرت حسینؑ کا سر مبارک لایا گیا (اور ایک طشت میں رکھ دیا گیا۔ بخاری)

ابن زیاد ایک چھری آپؑ کی ناک میں مارنے لگا اور کہا: یہ بھی کوئی حسن ہے؟ میں نے کہا: سنو! یہ سب سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ سے مشابہ ہیں!“

(ترمذی، مشکوٰۃ: مناقب اہل بیتؑ)

طبرانی کی روایت میں ہے کہ ”آپؑ کی آنکھوں اور ناک میں چھری مارنے لگا تو میں نے کہا: اپنی چھری اٹھا لو، میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ جگہ چومتے ہوئے دیکھا ہے۔“

بزار کی روایت میں ہے کہ ”میں نے کہا: جہاں تری چھری ہے میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ جگہ سونگھتے دیکھا ہے۔“ (مرقاۃ: ۱۱/۳۹۷)

یزیدی عمال کی یہ باتیں اور یہ حرکتیں کیا واضح نہیں کرتیں کہ ان لوگوں کے دل بغضِ اہل بیتؑ سے لبریز تھے؟

اب بھی کوئی یزیدی اقدامات کا دفاع کرے اور اسے ایک اتفاقی حادثہ سمجھے تو اسے خدا سمجھے!

اب دیکھیے کہ اس گستاخی کی سزا کیا ملی؟

ظالموں کا یہ ٹولہ محبانِ امامؑ کے ہاتھوں یوں اپنے انجام کو پہنچا کہ ابن زیاد اور اس کے ساتھیوں کے سر کاٹ کر کوفہ لائے گئے اور اُسی جگہ رکھے گئے جہاں امام حسینؑ کا سر رکھا گیا تھا، لوگوں کا ایک بڑا مجمع تھا۔

عمارہ بن عمیر کہتے ہیں کہ ”جب میں پہنچا تو ایک شور ہو رہا تھا: وہ آیا، وہ آیا، میں نے دیکھا کہ ایک سانپ آیا، سب سروں سے ہوتا ہوا عبید اللہ بن زیاد کے نتھنوں میں داخل ہو گیا، کچھ دیر اس کے اندر رہا، پھر نکلا اور چلا گیا یہاں تک کہ نظروں سے غائب ہو گیا۔“

پھر شوراٹھا: وہ آیا، وہ آیا، چنانچہ سانپ نے آ کر پہلے والا عمل دھرایا..... یہ کاروائی دو یا تین مرتبہ ہوئی۔“ (ترمذی، مرقاة: ۱۱/۳۹۷)

ابن زیاد نے امامؑ کی ناک اور آنکھوں پر چھڑی ماری تھی، اللہ تعالیٰ نے سانپ کی صورت میں اپنی چھڑی بھیجی..... سانپ اور چھڑی کی شکل ملتی جلتی ہے، عصاے موسیٰ بھی بوقت ضرورت سانپ بن جاتا تھا!..... اور اس خدائی چھڑی نے ناک ہی کی راہ سے داخل ہو کر وہ دماغ چاٹا جو بغض امامؑ سے بھرا تھا! ابن زیاد نے دو یا تین مرتبہ چھڑی ماری تھی، خدائی چھڑی نے بھی اس سے دو یا تین مرتبہ یہی انتقام لیا!

یہ تو دنیا کا انجام تھا، آخرت کا انتقام اللہ ہی جانے!
”إن بطش ربك لشديد“

گستاخ اہل بیتؑ کو آج بھی سزا ملتی ہے

خیال نہ کیا جائے کہ یہ عہد ماضی کے قصے ہیں، جو خوش عقیدہ لوگوں نے دینی تسکین کے لیے بیان کیے ہیں۔ بے ادبی اور گستاخی کی سزا آج بھی جاری و ساری ہے۔ گستاخی خواہ صحابہ کرامؓ کی ہو یا اہل بیتؑ عظام کی، ایمان و عرفان کا نور سلب کر لیتی ہے۔ بغض اہل بیتؑ اور بغض صحابہؓ دونوں درحقیقت روحانی کینسر ہیں، جو مسلمان کی روحانی شخصیت کو مسخ کر دیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جو وحشت اور لعنت گستاخان صحابہؓ کے چہروں سے ٹپکتی ہے، گستاخان اہل بیتؑ کے چہروں پر بھی ویسی ہی پھٹکار برتی ہے، ایسے لوگوں کی صحبت سے طبیعت میں ایک عجیب سا انقباض پیدا ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جنہیں ایمان و اعتدال کی دولت عطا فرمائی ہے، وہ کبھی وقتِ نظر سے ایسے لوگوں کا جائزہ لیں، اُن کا دل اس حقیقت کی تصدیق کرے گا۔

عبرت کے طور پر چند مشاہدے نذر قارئین ہیں:

☆ ایک صاحب بڑے تیز طرار قلم کے مالک تھے، زبان و بیان کے بھی دہنی تھے، لیکن گفتگو اہل بیتؑ کی گستاخی سے آلودہ رہتی تھی، رفتہ رفتہ دینی خدمات سے محروم ہوتے گئے..... دینی خدمت کی توفیق اہل دین کی محبت اور ادب سے ملتی ہے، جن کے گمردین نازل ہوا، اُن کی گستاخی کرے اور پھر دینی خدمت کی توفیق بھی ملے، یہ کیسے ممکن ہے!..... وطن چھوٹا، دیار غیر میں دنیا کی خاطر ہر ذلت اٹھائی، آخر بے کسی کی موت مرے، آخر عمر میں شکل بچو نما ہو گئی تھی، العیاذ باللہ!

☆ ایک اور صاحب اچھے خطیب اور قلم کار تھے، لیکن دل بغض اہل بیتؑ سے لبریز تھا، گفتگو میں بھی اس کا اثر نمایاں رہتا تھا، چنانچہ دینی خدمات کا دائرہ رفتہ رفتہ سکڑتا گیا، ایک ناقابل بیان علت میں مبتلا ہوئے اور پھر ایک مسکمی نوجوان سے خوب بلیک میل ہوئے، آخر اسی دہنی دباؤ میں اچانک دنیا سے رخصت ہو گئے،

آخر عمر میں چہرہ وحشت سرا ہو گیا تھا، معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔

☆ ایک اور صاحب جمعہ کے دن دو مسجدوں میں خطاب کرتے تھے اور بہت خوش روتے تھے، کاروبار بھی اچھا تھا، ذہن ایسا بھٹکا کہ اہل بیتؑ کی گستاخی کرنے لگے، سزایہ ملی کہ دینی خدمت سے تقریباً محروم ہو گئے، کاروبار تباہ ہو گیا، معمولی درجے کے لوگوں کی خوشامد اور گھٹیا حرکتوں سے گذر اوقات کرتے تھے، سرخ و سفید چہرہ سیاہ اور بدنما ہو گیا تھا اور اسی حال میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ معاذ اللہ

☆ ایک اور صاحب خطابت کے ساتھ تجارت کرتے تھے، اہل بیتؑ کے بارے میں دریدہ دہن ہو گئے، سزایہ ملی کہ جھوٹ کی عادت ہو گئی، کاروبار رفتہ رفتہ تباہ ہو گیا، خطابت میں لطف باقی نہ رہا، بیماریوں نے گھیر لیا، چہرے کی رونق رخصت ہو گئی، اولاد کے صدمے اس پر مستزاد تھے، جب کبھی ملاقات ہوتی تو یوں لگتا ایک اجڑے ہوئے بد حال شخص سے ملاقات ہو رہی ہے، اچانک موت واقع ہوئی اور چل دیے، معاذ اللہ۔

☆ ایک مصنف اہل بیتؑ کے بارے میں قلبی عناد رکھتے تھے، ان کی تحریروں سے نہایت درجہ گستاخی ٹپکتی تھی، نتیجہ یہ نکلا کہ کریہہ المنظر ہو گئے اور بدترین موت مارے گئے۔

☆ ایک صاحب ہر وقت یزید کے وکیل صفائی بنے رہتے تھے اور اس کی تعریف میں رطب اللسان رہتے تھے، اس کا اثر یہ ہوا کہ زندگی کے آخری سالوں میں انتہا درجے کے یادہ گوار بد زبان ہو گئے اور اچھی بھلی صورت ایسی بگڑی کہ عبرت ہوتی تھی! معاذ اللہ ثم معاذ اللہ

☆ ایک صاحب علم کئی کتابوں کے مصنف تھے، خطیب تھے، ان کی قرآنی خدمت کا عالمی تعارف ہے، مجھے ان سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا، اتفاقاً ایک

مجلس میں ملاقات ہو گئی تو چہرے پر قرآن کا نور اور گفتگو میں محبت کا سرور نہیں پایا، بہت تعجب ہوا۔

اُن کے ہم مسلک ایک محقق عالم نہایت اہتمام سے امام حسینؑ کے موقف کا اثبات اور موذت اہل بیتؑ کی تاکید کیا کرتے تھے۔ میں نے دوران گفتگو میں اُن کے حوالے سے پوچھا کہ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

تو بڑی خشونت اور بیہوشی سے جواب دیا: ہماری رائے سراسر اُن کے خلاف ہے۔ یہ سن کر میرا تعجب جاتا رہا کہ قرآن کی خدمت تو ہے لیکن قرآن والوں سے محبت نہیں!

یہ وحشت اسی مکروہ سوچ کا اثر ہے۔

☆ عصر حاضر میں ناصیت اور یزیدیت کے مردہ فتنے کو کراچی کے ایک صاحب نے دجالی انداز تحریر سے زندہ کیا اور ہزاروں لوگوں کو گمراہ کیا۔

دینی حوالے سے ان صاحب کا حال یہ تھا کہ نماز پنجگانہ تو کجا جمعہ کی بھی پروا نہیں کرتے تھے، صوم رمضان کی بھی ان کے ہاں کوئی اہمیت نہ تھی، قرآن مجید اور وحی کے بارے میں ذہن صاف نہیں تھا، آخر اسی حال میں دار آخرت کو روانہ ہوئے۔ نمازوں کے بارے میں سستی اور لاپرواہی صرف انہی صاحب کا وتیرہ نہ تھا، بلکہ اوپر جتنے لوگوں کا ذکر ہوا ہے، دینی خدمات سے تعلق رکھنے کے باوجود تقریباً سبھی نمازوں اور دیگر دینی اعمال میں کوتاہ تھے۔

درحقیقت یہ یزید کی محبت کا اثر ہے، ابن کثیرؒ کی روایت کے مطابق: ”یزید میں شہوات کی طرف شدید میلان پایا جاتا تھا، بعض اوقات بعض نمازیں چھوڑ دیتا تھا اور اکثر اوقات نمازیں فوت تو کر ہی دیتا تھا۔“ (تاریخ ابن کثیر: ۲۳۰/۸)

اس کے برعکس امام حسینؑ کے سچے پیروکار ارکان دین کے پابند اور صدق و

صفا سے آراستہ ہوتے ہیں، اس لیے کہ خود امام حسینؑ دین کے سچے پیروکار اور صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔

ان سزاؤں کے ساتھ سب سے بڑی سزا جو ان گستاخوں کو ملی، وہ یہ تھی کہ ان میں سے کسی کو توبہ کی توفیق نہیں ہوئی۔

طاعات کی طرح معاصی کے بھی خواص ہیں، گستاخی اور بے ادبی کی معصیت کا خاصہ یہ ہے کہ اس سے توبہ کی توفیق سلب ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اہل بیت کرامؑ اور صحابہ عظامؑ کی محبت اور ادب عطا فرمائے اور سوء خاتمہ سے بچائے!

ضافہ: ڈاکٹر برہان الدین فاروقی عہد قریب کے ایک نامور دانشور اور فلسفی تھے ایک دن ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، میں تشریف فرما تھے، کسی حوالے سے کراچی کے انہی صاحب کا ذکر چھڑ گیا تو فرمایا:

”ایک مرتبہ میرے پاس آئے تھے، کہنے لگے:

”طبیعت پر انتہائی بوجھ رہتا ہے، یوں محسوس ہوتا ہے کہ دل سیاہ ہو گیا ہے۔“

”اس وحشت سے چھٹکارا مشکل نہیں، ابھی مہلت ہے، توبہ کر لو اور اس کا اعلان کر دو، ہو سکے تو علیؑ و حسینؑ کے مناقب پر کتاب لکھو تا کہ گناہ کی تلافی ہو جائے“ میں نے کہا۔

”کئی دفعہ یہ سوچا، لیکن کیا کروں توفیق نہیں ہوتی“ انہوں نے جواب دیا۔

اللہ جل شانہ نے سچ فرمایا:

”کلا بل ران علی قلوبہم ما کانوا یکسبون“ (المطففین: ۱۴)

گستاخی کی سزا لسانِ نبوت سے

ابوسعید خدریؓ سے ایک طویل روایت ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت علیؑ نے یمن سے کچھ سونا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھیجا، آپؐ اسے تقسیم فرما رہے تھے کہ ایک شخص کھڑا ہوا، جس کی آنکھیں دھنسی ہوئی تھیں اور رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں، پیشانی باہر کو نکلی ہوئی، داڑھی گھنی، سر منڈا اور تہ بند چڑھا ہوا تھا..... بعض روایات میں اس کا نام ”ذوالخویصرہ“ مذکور ہے، یہ بنو تمیم سے تھا..... کہنے لگا: ”یا رسول اللہ! اللہ سے ڈرو اور عدل کرو“

آپؐ نے فرمایا: ”کیا روئے زمین پر بسنے والے انسانوں میں میں تقویٰ اور خوف خدا کا سب سے زیادہ حقدار نہیں! میں عدل نہیں کروں گا تو کون کرے گا؟!“ اس پر وہ غصے میں بھرا چلا گیا، جب وہ جا رہا تھا تب آپؐ نے فرمایا: ”اس شخص کے ہم نسب اور ہم مزاج ایسے لوگ ہوں گے جو مزے لے لے کر کتاب اللہ کی تلاوت کریں گے لیکن کتاب اللہ ان کے گلوں سے نیچے نہیں اترے گی، وہ لوگ دین سے اس طرح خارج ہوں گے جس طرح تیر شکار سے پار نکل جاتا ہے۔“ (تجرید البخاری: حدیث ۴۹۸، مشکوٰۃ، المعجزات)

یعنی جس طرح تیر بہت تیزی سے شکار میں ایک طرف سے پیوست ہوتا ہے اور دوسری طرف سے یوں نکل جاتا ہے کہ اس پر خون وغیرہ کا کوئی اثر نہیں ہوتا اسی طرح یہ گستاخ مزاج اور بے ادب لوگ ظواہر دین کی تو بہت شد و مد سے پابندی کریں گے لیکن دین کے حقائق و مقاصد کا ان کے دلوں پر کوئی اثر نہیں ہوگا، جس تیزی سے دین میں داخل ہوں گے، اُسی تیزی سے بالکل کورے، دین سے نکل جائیں گے، دین سے ان کو کوئی فائدہ نہ ان سے دین کو کوئی فائدہ، البتہ دین کو ان سے نقصان ضرور پہنچے گا۔

خارجیوں، ناصبیوں اور یزیدیوں کو دیکھیے، حدیث میں مذکور گستاخ شخص کے بالکل ہم مزاج پائیں گے، قرآن تو پڑھتے ہیں اور بہت خوش الحانی سے پڑھتے ہیں لیکن قرآن والوں سے بغض رکھتے ہیں، اس لیے ان لوگوں کی دین پرستی کا انجام وہی ہوتا ہے جو حدیث میں مذکور ہوا۔

اللہ تعالیٰ گستاخی اور بے ادبی سے بچائے۔

اہل بیتؑ شعائر اللہ میں داخل ہیں

امام نوویؒ، المتوفی ۶۷۶ھ نے اپنے مشہور آفاق مجموعہ احادیث ”ریاض الصالحین“ میں اہل بیتؑ کے اکرام و فضیلت کے بیان میں مستقل باب قائم کیا ہے، اور اس کے تحت یہ آیت بھی نقل کی ہے:

”وَمَنْ يَعْظُمَ شَعَائِرَ اللَّهِ فَانْهَاهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ“ (الحج: ۳۲)

ترجمہ: ”اور جو کوئی شعائر اللہ کی تعظیم کرے تو یقیناً یہ بات دلوں کے تقویٰ سے (پیدا ہوتی) ہے“

اس سے معلوم ہوا کہ شعائر اللہ کی تعظیم تقویٰ کی علامت ہے، اور اہل بیتؑ شعائر اللہ میں داخل ہیں تو ان کی تعظیم و تکریم بھی حصول تقویٰ کے لیے لازم ہے۔

جس شخص کا دل اہل بیتؑ کی محبت و حرمت سے خالی ہے، وہ لاکھ عبادتیں کرے، طرح طرح ریاضتیں کرے، تقویٰ سے محروم ہی رہے گا، اور جو تقویٰ سے محروم، وہ اللہ کے یہاں عزت سے محروم!

اس سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ امیر المؤمنین سیدنا علیؑ، امیر المؤمنین سیدنا حسنؑ اور امیر المؤمنین سیدنا حسینؑ (مبارک کرمانی نے خواجہ نظام الدینؒ اولیاء کے حوالے سے آپؑ کو امیر المؤمنین ہی لکھا ہے!) ”سیر الاولیاء“ کے اقدامات میں اللہ تعالیٰ کی رضا شامل تھی اور آپؑ کے فیصلے خطا سے پاک تھے، اس لیے کہ اگر شعائر ہی بھٹک جائیں تو ہدایت کہاں سے ملے!

اس آیت سے عبرت کا ایک اور پہلو بھی سامنے آتا ہے۔

بہت پہلے نمود نے ازراہ طغیان اللہ کی قدرت کی ایک نشانی، اونٹنی کی توہین کی تھی، پیغمبر وقت حضرت صالح علیہ السلام نے انہیں بہتیرا سمجھایا کہ اللہ کی

اونٹنی اور اس کے پانی کا خیال رکھو، لیکن شقاوت انہیں کھینچ رہی تھی، انہوں نے پروانہ کی اور اونٹنی کی کوچیں کاٹ ڈالیں، اس کی سزا میں اللہ کا عذاب آیا اور سب کو تباہ و برباد کر گیا۔ (الشمس: ۱۱-۱۵)

قرآن نے یہ داستان عبرت کے لیے بیان کی تھی، لیکن افسوس لوگوں نے اس سے عبرت حاصل نہ کی، دنیا طلبی کا شمودی جذبہ غالب آیا، رسول اللہ ﷺ کی ساری نصیحتیں اور وصیتیں نظر انداز کر ڈالیں، اللہ کے شعائر رضی اللہ عنہم سے برسرِ پیکار ہوئے، پانی بند کیا اور بے دردی سے شہید کیا۔

اس کے نتیجے میں اللہ کا عذاب آیا اور قوم شمودی طرح یہ لوگ بھی نشانِ عبرت بن گئے!
 نعوذ باللہ من غضبه وغضب رسوله وغضب اہل بیتہ
 وصلى الله عليه وآله وبارک وسلم

جنت میں اہل بیتؑ کا مقام بلند

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(ترجمہ) ”اور جو لوگ ایمان لائے اور اُن کی ذریت نے ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کی تو ہم (اپنے فضل و کرم سے) اُن کی ذریت کو (جنت میں) انکے ساتھ لاحق کر دیں گے اور اُن کے عمل سے ہم کچھ بھی کم نہ کریں گے۔“ (الطور: ۲۱)

فطری امر ہے کہ انسان کتنے ہی اچھے مقام میں ہو، اُس کی خوشی تب تمام ہوتی ہے، جب اُس کا گھرانہ بھی اس کے سامنے ہو۔

انسان کو پیدا کرنے والی ہستی نے انسان کی ان نفسیات کی رعایت کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ آباء اپنے کمالِ ایمان و عمل کی وجہ سے جنت کے اعلیٰ مقام میں ہوں اور اولاد نسبتاً ادنیٰ مقام میں ہو، تو آباء کرام کے اکرام میں اولاد کو اُن کے درجے میں پہنچا دیا جائے گا۔

اہل بیتؑ بذات خود بہت اونچے مقام کے حامل ہیں، لیکن نبی اکرم ﷺ کا مقام تو سب سے اونچا ہوگا۔

علی وفاطمہ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم کو دیکھ دیکھ کر دنیا میں حضور ﷺ کو قرار ملتا تھا، جنت میں ان کے بغیر سکون کیسے ملے؟ تو آپؐ کی دلداری کی خاطر ان حضراتؑ کو آپؐ کے درجے میں پہنچایا جائے گا!

اور یہ وہ مقام ہے جو کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوگا!

زہے نصیب!

پاک نبی پاک گھرا نا

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

قرآن مجید میں اللہ جل شانہ کا ارشاد پاک ہے:

”أَنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ

وَيُطَهِّرَ كُمْ تَطْهِيرًا“ (الاحزاب: ۳۳)

ترجمہ: ”اللہ تو بس یہ چاہتا ہے کہ اے اہل بیت! تم سے گندی باتیں

دور کر دے اور تمہیں ایک خاص شان سے پاک صاف کر دے۔“

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

”اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ نبی ﷺ کے گھر والوں کو ان احکام (مذکورہ) پر

عمل کرا کر خوب پاک صاف کر دے اور ان کے رتے کے موافق ایسی قلبی صفائی اور

اخلاقی ستھرائی عطا فرمائے جو دوسروں سے ممتاز و فائق ہو..... یہاں تطہیر سے مراد

تہذیب نفس، تصفیہ قلب اور تزکیہ باطن کا وہ اعلیٰ مرتبہ ہے، جو کامل اولیاء اللہ کو

حاصل ہوتا ہے اور جس کے حصول کے بعد وہ معصوم تو نہیں بن جاتے، ہاں محفوظ

کہلاتے ہیں۔“ (فوائد عثمانی)

اس آیت میں تطہیر کا معنی ایک دوسری آیت سے واضح ہوتا ہے۔

سورۃ آل عمران میں ہے کہ فرشتوں نے حضرت مریم سے کہا:

”يَمْرِيْمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَاءِ

الْعٰلَمِيْنَ“ (آل عمران: ۴۲)

ترجمہ: ”اے مریم! یقیناً اللہ نے تجھے چن لیا ہے اور تجھے پاک صاف کر دیا ہے اور

تجھے سب جہان کی عورتوں پر فضیلت بخشی ہے۔“

تطہیر کا جو معنی یہاں ”طہرک“ میں مراد ہے وہی ”یطہرکم

تطہیراً“ میں مراد ہے۔

جیسے یہاں تطہیر سے صرف طہارت حاصل ہوئی، نبوت نہیں، اسی طرح اہل بیتؑ بھی الہی تطہیر سے طہارت اخلاق و اعمال کے بلند اور محفوظ مقام پر فائز ہوئے، البتہ نبوت و رسالت کا سلسلہ حضور اکرم ﷺ پر بند ہو گیا، اور خیال رہے کہ عصمت خاصہ نبوت ہے۔

اس آیت میں اہل بیت کا خطاب کن سے کیا گیا؟
علامہ عثمانیؒ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

”اہل بیت میں اس جگہ ازواج مطہرات کا داخل ہونا یقینی ہے بلکہ آیت کا خطاب اولاً ان ہی سے ہے، لیکن چونکہ اولاد و داماد بھی بجائے خود اہل بیت میں شامل ہیں، بلکہ بعض حیثیات سے وہ اس لفظ کے زیادہ مستحق ہیں، جیسا کہ مسند احمد کی ایک روایت میں ”احق“ کے لفظ سے ظاہر ہوتا ہے، اس لیے آپؐ کا حضرت علی، فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کو ایک چادر میں لے کر ”اللہم ہولاء اہل بیتی“ فرمانا اور حضرت فاطمہؑ کے مکان کے قریب سے گذرتے ہوئے ”الصلوة اہل البيت یرید اللہ لیذهب عنکم الرجس.....“ سے خطاب کرنا اس حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے تھا کہ گو آیت کا نزول بظاہر ازواج کے حق میں ہوا ہے اور ان ہی سے خطاب ہو رہا ہے، مگر یہ حضرات بھی بطریق اولیٰ اس لقب کے مستحق اور فضیلت تطہیر کے اہل ہیں.....“

علامہ عثمانیؒ نے جس روایت کی طرف اشارہ کیا ہے، یہ صحیح مسلم کی روایت ہے اور حضرت عائشہؓ، جی ہاں ام المؤمنین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے، فرماتی ہیں:

”نبی ﷺ ایک صبح باہر نکلے، آپؐ پر سیاہ اونی چادر تھی، حسن بن علی آئے، آپؐ نے انہیں اس میں داخل کر لیا، پھر حسین آئے، اور ان کے ساتھ داخل ہو گئے، پھر فاطمہ آئیں، آپؐ نے انہیں بھی داخل کر لیا، پھر علی آئے، آپؐ نے انہیں بھی داخل کر لیا،

پھر یہ آیت پڑھی: ”انما يريد الله ليذهب عنكم الرجس اهل البيت ويطهر كم تطهيرا“
(مسلم، مشکوٰۃ: مناقب اہل بیت)

جنہیں رسول اللہ ﷺ قرآن مجید کی تفسیر و تعمیل میں اہل بیت میں داخل کریں اور اس شان سے داخل کریں کہ چادر میں لے کر انہیں اپنے ساتھ چمٹالیں، اب کس کی ہمت ہے کہ انہیں اہل بیت سے خارج کرے؟

اور جنہیں خود اللہ تعالیٰ نے اخلاقی ستھرائی اور قلبی صفائی کا ممتاز مرتبہ عطا فرمایا اور جن کے اعمال کی حفاظت خود اپنے ذمے لی ہو، کیا ان کے قلوب حب جاہ اور حب مال کی گندگی سے آلودہ ہو سکتے ہیں؟ کیا ان کے قدم شریعت کے خلاف اٹھ سکتے ہیں؟ ایسے پاک طینت اور پاکباز نفوس کی نیتوں پر شک و شبہ بد باطنی اور شقاوت اخروی کی علامت ہے۔

یہ لوگ تو اخلاق و اعمال کا زندہ بیان تھے،

جو لوگ ان سے ٹکرائے، وہ درحقیقت قرآن سے ٹکرائے،

جنہوں نے ان کا سر قلم کیا، انہوں نے درحقیقت قرآن کا سر قلم کیا،

اور قرآن تو قیامت تک کے لیے ہے، کوئی اسے ختم کر نہیں سکتا، یہی وجہ

ہے کہ جو قدسی نفوس قرآن کے زندہ پیکر تھے، قتل و غارت اور کردار کشی کے باوجود وہ

زندہ رہے اور قیامت تک زندہ رہیں گے، اور اصلاح امت کے لیے اپنا کردار ادا

کرتے رہیں گے۔

چنانچہ عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پیشگوئی

فرمائی ہے:

(ترجمہ) ”دنیا فنا نہیں ہوگی یہاں تک کہ عرب (اور اہل اسلام) کا سربراہ میرے

اہل بیت میں سے ایک شخص ہو لے، جس کا نام میرے نام کے موافق ہوگا۔“

یہ ترمذی کی روایت ہے اور ابوداؤد کی روایت میں ہے: ”اگر دنیا کا صرف ایک ہی دن باقی رہ گیا تو اللہ تعالیٰ اسی دن کو لمبا کر دے گا اور اس میں میرے اہل بیت سے ایک شخص کو مبعوث کرے گا، جس کا نام میرے نام پر اور باپ کا نام میرے باپ کے نام پر ہوگا اور وہ زمین کو عدل و انصاف سے یونہی بھر دے گا جیسا کہ وہ اس وقت ظلم و جور سے بھری ہوگی“

ابوسعید خدریؓ کی روایت میں اس پر عزم اور باہمت شخص کا لقب ’مہدی‘ مذکور ہے۔ (مشکوٰۃ: ۲/۴۷۰)

امام مہدیؑ کے بارے میں وارد روایات اس بات کی بھی دلیل ہیں کہ آپؑ کی نسل پاک قیامت تک باقی رہے گی!

یا اللہ! ہمارے سید و مولا کی نسل پاک کو بڑھا
اور ہمیں ان کی خدمت و نصرت نصیب فرما!
صلی اللہ علیہ وآلہ وبارک وسلم

رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں اہل بیتؑ باطل کے

مقابلہ صف آرا ہوتے ہیں

۹ھ میں نجران کے نصاریٰ کا ساٹھ آدمیوں پر مشتمل وفد بڑی آن بان کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے مسیحی عقائد پر مناظرے کے لیے حاضر ہوا، کئی دن بحث ہوتی رہی، لا جواب ہونے کے باوجود جب انہوں نے ہٹ دھرمی نہ چھوڑی تو آیت مہلبہ نازل ہوئی، جس کا ترجمہ یہ ہے:

”پھر جو آپؐ سے اس بارے میں جھگڑے بعد اس کے کہ آپؐ کے پاس (حقیقت کا) علم آچکا تو آپؐ کہہ دیجئے کہ آؤ ہم بلا تے ہیں اپنے بیٹوں کو اور تمہارے بیٹوں کو، اپنی عورتوں کو اور تمہاری عورتوں کو اور اپنے آپ کو اور خود تمہیں، پھر ہم گڑ گڑا کر دعا کریں کہ جھوٹوں پر اللہ کی لعنت پڑے۔“ (آل عمران: ۶۱)

صحیح مسلم میں سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ ”آیت مہلبہ نازل ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے علی، فاطمہ، حسن اور حسین کو بلایا اور عرض کیا: اے اللہ! یہی تو میرے اہل بیت ہیں“ (مشکوٰۃ: مناقب اہل بیتؑ)

پھر جب آپؐ اللہ کے اس حکم کی تعمیل میں سراپا ”اسلام“ بن کر، ابراہیمی جذبے سے لبریز، علی و فاطمہ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم کے ساتھ باہر تشریف لا رہے تھے تو:

”یہ نورانی صورتیں دیکھ کر ان کے لاٹ پادری نے کہا میں ایسے پاک چہرے دیکھ رہا ہوں، جن کی دعا پہاڑوں کو ان کی جگہ سے سرکا سکتی ہے، ان سے مہلبہ نہ کرنا، ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے اور ایک نصرانی بھی زمین پر باقی نہ رہے گا“

”آخر انہوں نے مقابلہ چھوڑ کر سالانہ جزیہ دینا قبول کیا اور صلح کر کے واپس چلے گئے“

حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”اگر مباہلہ کرتے تو وادی آگ بن کر ان پر برستی اور اللہ تعالیٰ نجران کو بالکل تباہ و برباد کر دیتا اور ایک سال کے اندر اندر تمام نصاریٰ ہلاک ہو جاتے۔“

(فوائد عثمانی، روح المعانی: ۳/۱۸۸، سیرت المصطفیٰ ﷺ: ۳/۱۲۴)

اہل بیتؑ کے چہروں کا یہ نور، جس سے نصاریٰ مرعوب ہو کر سرنگوں ہوئے،
تطہیر الہی کا نور تھا۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ سب کی موجودگی میں رسول اللہ ﷺ صرف انہی کو کیوں لائے؟

وجہ یہ ہے کہ الہی ارادے سے یہ حضرات پاک صاف ہو چکے تھے اور نبوت کی خصوصی توجہ اور محبت کا مرکز تھے، اب رسول اللہ ﷺ انہیں باطل سے مقابلے کی تربیت دے رہے تھے۔

اس موقع پر آپؐ نے انہیں دنیائے عیسائیت کے سامنے کھڑا کیا اور ساری دنیا کو بتلادیا کہ باطل کے مقابلے میں یہی میرے نمائندے ہیں، جہاں یہ کھڑے ہوں گے، وہاں درحقیقت میں کھڑا ہوں گا، ان کے قول و عمل کا ذمہ دار میں ہوں! چنانچہ آئندہ ادوار میں جب بھی حق و باطل کے درمیان کشمکش ہوئی، یہ حضرات حق کے علمبردار رہے۔

سیدنا علیؑ اپنی پوری زندگی میں قائم بالحق رہے۔

سیدنا حسنؑ اپنے دور میں امام برحق تھے، آپؑ نے جو فیصلہ فرمایا، وہی حق تھا۔

پھر سیدنا حسینؑ نے اپنے دور میں امامت کا حق ادا کیا۔

لوگ کہتے ہیں کہ صرف امام حسینؑ ہی کیوں کھڑے ہوئے؟

میں کہتا ہوں کہ اُس دور میں مباہلہ کے تربیت یافتہ لوگوں میں سے کوئی اور تھا، جو کھڑا ہوتا؟!!

اس دور میں رسول اللہ ﷺ کے خاص تربیت یافتہ اور ربانی تطہیر سے منور صرف امام حسینؑ ہی تھے، اس لیے انہی کے قلب روشن پر خلافت سے ملوکیت کی طرف انحراف کا انکشاف سب سے پہلے اور سب سے شدید ہوا اور اسی لیے انہوں نے پوری قوت کے ساتھ قیام فرمایا۔

دیکھیے! دشمن کا جہاز میلوں دور ہوتا ہے لیکن رے ڈار (Radar) پر نمودار ہو جاتا ہے اور عام شخص کو اس وقت پتہ چلتا ہے، جب وہ سر پر آ جاتا ہے اور بم برساتا ہے۔ اب یہ کہنا کہ صرف رے ڈار ہی کو کیوں پتہ چلا؟ سب لوگوں کو کیوں علم نہ ہوا؟ جہالت ہے۔

بالکل اسی طرح اہل بیتؑ کے قلوب حق کے ریڈار تھے، انہوں نے باطل کو بہت دور سے بھانپ لیا اور اسے روکنے کی اپنی سی کوشش کی، دوسروں کو اس وقت پتہ چلا، جب باطل کے مفاسد کھل کر سامنے آئے، لیکن اُس وقت پچھتاوے کے سوا کیا ہو سکتا تھا!

”میں قرآن اور اہل بیتؑ میں چھوڑے جا رہا ہوں“

”قرآن اور اہل بیتؑ ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے“

جزیرہ عرب کو باطل قوتوں سے پاک کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حج کیا۔ اس موقع پر آپؐ نے عرفات میں تاریخ ساز خطبہ حج ارشاد فرمایا، اس خطبے میں رسول اللہ ﷺ کا انداز الوداعی ہے..... چنانچہ یہ حج، الوداعی حج ہی ثابت ہوا..... یوں محسوس ہوتا ہے کہ رؤف ورحیم باپ..... ﷺ کو آئندہ حالات کا اندازہ ہو گیا ہے اور وہ رخصت ہوتے ہوئے اپنی روحانی اولاد کو ان فتنوں سے بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔

جابرؓ سے روایت ہے کہ میں نے عرفہ کے دن رسول اللہ ﷺ کو اپنی اونٹنی قصواء پر خطبہ دیتے ہوئے دیکھا اور اس میں یہ فرماتے ہوئے سنا:

”لوگو! میں تم میں وہ (مآخذ) چھوڑ رہا ہوں کہ اگر تم (علم و عمل میں) انہیں پکڑے رہے تو ہرگز گمراہ نہ ہونے پاؤ گے:

اللہ کی کتاب

اور میری عترت میرے اہل بیت“

(مشکوٰۃ: مناقب اہل بیتؑ، ترمذی)

یہ نصیحت خطبہ حجۃ الوداع کا اہم حصہ ہے، ہمارے ہاں خطبہ حجۃ الوداع تو اہتمام سے شائع ہوتا ہے، لیکن اس نصیحت کو دانستہ یا نادانستہ حذف کر دیا جاتا ہے، معلوم نہیں کیوں؟

پھر یہ نصیحت صرف عرفات ہی میں نہیں فرمائی، بلکہ واپسی کے سفر میں وقتاً فوقتاً اس کی یاد دہانی کرواتے رہے۔

”جحفہ“ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان ایک قصبہ ہے، اس سے

تین میل کے فاصلے پر ”خُصَم“ نامی ایک بن تھا اور اس کے قریب ایک تالاب تھا، اس بن کے حوالے سے اس تالاب کو ”غدیو خُصَم“ کہہ دیتے تھے۔

(شرح نووی بر حاشیہ صحیح مسلم: ۲/۲۷۹)

حج سے واپسی پر رسول اللہ ﷺ نے یہاں پڑا دیا تھا اور ایک دن یہاں خطاب بھی فرمایا تھا۔

زید بن ارقمؓ ”خطابِ خُم“ روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپؐ نے حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

”لوگو! آگاہ ہو جاؤ، میں ایک بشر ہی ہوں، ہو سکتا ہے کہ عنقریب میرے رب کا پیغامبر (فرشتہ موت) میرے پاس آئے اور میں پیغام قبول کروں،

میں تم میں دو گراں قدر چیزیں (ثقلین) چھوڑ رہا ہوں: ان میں پہلی چیز اللہ کی کتاب ہے، اس میں ہدایت اور نور ہے، اللہ کی کتاب کو پکڑ لو اور اسے تھامے رکھو، (ایک روایت میں الفاظ یوں ہیں..... کتاب اللہ، یہی اللہ کا رسا ہے، جو اس کے پیچھے چلتا رہا، وہ سیدھے راستے پر رہے گا، اور جس نے اسے چھوڑا، گمراہ ہو جائے گا)

اور میرے اہل بیت، میں تمہیں اپنے اہل بیت کے بارے میں تنبیہ کر رہا ہوں، میں تمہیں اپنے اہل بیت کے بارے میں یاد دہانی کر رہا ہوں“

یہ صحیح مسلم کی روایت ہے۔ جامع ترمذی میں ”خطابِ خُم“ کی یہ نصیحت زید بن ارقمؓ ہی سے یوں مروی ہے:

”میں تم میں وہ (مآخذ) چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر تم انہیں

تھامے رہے تو میرے بعد ہرگز گمراہ نہ ہو گئے، ان میں ایک دوسرے سے عظیم تر ہے،

(ایک ماخذ) کتاب اللہ ہے، یہ رستا ہے، جو آسمان سے زمین تک لٹک رہا ہے،

اور (دوسرا ماخذ) میری عترت، میرے اہل بیت ہیں، اور دونوں ہرگز جدا نہیں ہوں گے، یہاں تک کہ حوض (کوثر) پر میرے پاس وارد ہو جائیں گے،

سودھیان رکھو کہ ان کے بارے میں میری وصیت پر تم کیسے عمل کرتے ہو!“ (مشکوٰۃ: مناقب اہل البیت)

امام احمدؒ اور طبرانیؒ نے یہی وصیت زید بن ثابتؓ سے روایت کی ہے اور اس میں ”ثقلین“ کی جگہ ”خلیفتین“ کا لفظ ہے، یعنی ”میں تم میں دو خلیفے چھوڑ رہا ہوں، کتاب اللہ اور میری عترت، میرے اہل بیت.....“ (مرقاۃ المفاتیح: ۳۸۶/۱۱) اس ارشاد مبارک میں رسول اللہ ﷺ نے راہ ہدایت پر قائم رہنے اور ضلالت سے بچنے کے لیے وصیت فرمائی کہ قرآن اور اہل بیتؑ سے چٹے رہو، اہل بیتؑ سے محبت و مودت لازم جانو، ان کی حرمت کا خیال رکھو، ان کے قول پر اعتماد کرو اور ان کی روایت پر عمل کرو۔

اہل بیتؑ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد اس فطری اصول کے عین مطابق ہے کہ ”صاحب البیت ادریٰ بما فیہ“ یعنی ”گھر والا گھر کی چیزوں کو بہتر اور زیادہ جانتا ہے۔“

قرآن کریم انہی کے گھر نازل ہوا، اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کا گھر انا انہی کو بنایا، اس لیے قرآنی اسرار و رموز اور نبوی اخلاق و اطوار سے ان سے زیادہ واقف نہ کوئی تھا اور نہ ہو سکتا تھا، اسی لیے رسول اللہ ﷺ بار بار قرآن اور اہل

بیت سے رجوع کرنے کی وصیت فرما رہے تھے۔

اس کے ساتھ آپؑ نے یہ بشارت بھی ارشاد فرمائی کہ قرآن اور اہل بیتؑ کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے،

لہذا جو شخص اہل بیتؑ کی سیرت اپناتا ہے اور ان کی رفاقت اختیار کرتا ہے، وہ درحقیقت قرآنی سیرت اپنا رہا ہے اور قرآنی رفاقت میں چل رہا ہے۔

علامہ طبریؒ نے ”دونوں ہرگز جدا نہیں ہوں گے“ کا یہ پرکیف مفہوم بیان کیا ہے کہ جس نے اس دنیا میں اپنے آقا و مولا ﷺ کی اس وصیت کی لاج رکھی اور قرآن و اہل بیتؑ سے چمٹا رہا، قیامت کے دن قرآن و اہل بیتؑ ہرگز اس سے جدا نہیں ہوں گے، یہاں تک کہ حوض کوثر پر اسے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں لے آئیں گے، آپؑ سے اس کے حسن کردار اور حسن تعمیل کی تعریف کریں گے۔

یہ سن کر رسول اللہ ﷺ بنفس نفیس اسے انعام و اکرام سے نوازیں گے اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ جو جزا عطا فرمائے گا، اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے!

(مرقاۃ المفاتیح: ۱۱/۳۸۶)

اب جس کا جی چاہے اس وصیت پر عمل کرے اور اپنی عاقبت سنوار لے اور جس کا جی چاہے اس وصیت کو نظر انداز کرے اور اپنی عاقبت برباد کر لے!

قیامت میں ان کا انجام تو جب قیامت قائم ہوگی، نظر آئے گا، تاریخ بتلا رہی ہے کہ جن لوگوں نے اس وصیت کو ٹھکرایا، ان کی دنیا بھی برباد ہوگئی اور وہ جیتے جی نشان عبرت بن گئے، فاعتبروا یا اولی الابصار!

ہمیں یوں تو ”صحیح مسلم“ کی روایات پر بے پناہ اعتماد ہے، لیکن ”حدیث ثقلین“ کچھ مسلمانوں کے فہم نازک پر ثقیل ہو جاتی ہے۔

کبھی کہتے ہیں: اس وصیت میں ”عترتی“ درست نہیں، یہ ”نسنتی“ کی تصحیف ہے۔

کبھی کہتے ہیں: حدیث میں ”اولہما“ مذکور ہے، ”ثانیہما“ مذکور نہیں، اور ”ثانیہما“ سنت ہے، عترت نہیں۔

غور کیجئے تو یہ باتیں تعصب کے بلبلے ہیں، حقیقت ہے کہ ”سنت“ کی پیروی کا حکم تو خود کتاب اللہ میں پہلے سے موجود ہے، ارشاد ہے:

”ما آتاکم الرسول فخذوه وما نہاکم عنہ فانتہوا“ (الحشر: ۷)

اور فرمایا: ”وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ“ (النساء: ۶۴)

نیز فرمایا: فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموا فیما شجر بینہم ثم لا

یجدوا فی انفسہم حرجاً مما قضیت ویسلموا تسلیماً“ (النساء: ۶۵)

حجۃ الوداع کے بعد رسول اللہ ﷺ جہاں قافی سے تشریف لے جا رہے تھے، اب آئندہ حالات اور نئے معاملات میں کتاب اللہ کا فہم اور آپؐ کی سنت کی پیروی کیسے ممکن ہو؟

اس کے لیے آپؐ نے اہل بیتؑ کو عملی اسوہ کے طور پر پیش فرمایا اور اس خبر صادق کے ساتھ پیش فرمایا کہ قرآن اور اہل بیتؑ ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے، میری زندگی میں تم میرے قول و عمل سے قرآن سمجھتے ہو، میرے بعد میرے اہل بیتؑ کے عمل کو دیکھ کر قرآن کی تعمیل کرنا۔

چنانچہ خلافت اولیٰ سے لے کر کربلا تک اہل بیتؑ کے عمل ہی سے قرآن کا مفہوم اور مطلوب واضح ہوا ہے۔

اس وصیت کے مطابق ہمارے لیے ہدایت کے دو بڑے مآخذ ہیں:

قرآن اور اہل بیتؑ

قرآن علمی مآخذ ہے اور اہل بیتؑ عملی مآخذ ہیں،

قرآن و سنت سے دین معلوم ہوتا ہے اور عمل اہل بیتؑ سے تعمیل دین کا

طریقہ معلوم ہوتا ہے۔

افتراق و اختلاف کے زمانے میں رسول اللہ ﷺ نے راہ نجات پانے کے لیے ”ما انا علیہ واصحابی“ بھی فرمایا ہے، اور ”اصحابی کالنجوم فباہم اقتدیتم اهتدیتم“ بھی فرمایا، اس لیے طریقہ اصحابؓ بھی طریق نجات و ہدایت ہے۔ لیکن اہل بیتؑ کو شرف صحبت کے ساتھ شرف تربیت بھی حاصل ہے، یہاں نسبت کے ساتھ نسب کی خصوصیت بھی جمع ہے، اس لیے اصحاب کرامؓ میں اہل بیتؑ کو فطری اور شرعی اختصاص حاصل ہے، بنا بریں عترت و اہل بیتؑ بجا طور پر اسوہ عمل ہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ”لن یفترقا“ آپؐ نے صرف اہل بیتؑ کے حق میں فرمایا ہے، کسی اور کے بارے میں نہیں!

اس لیے حدیث ثقلین، حدیث سنت خلفاء راشدینؓ، حدیث افتراق اور معاذ بن جبلؓ کی حدیث اجتہاد کی روشنی میں کسی بھی معاملے میں دینی رہنمائی حاصل کرنے کی ترتیب یوں ہوگی:

- ۱۔ کتاب اللہ
- ۲۔ سنت رسول اللہ ﷺ
- ۳۔ سنت اہل بیتؑ اور سنت صحابہؓ
- ۴۔ اجتہاد

خوش نصیب ہیں وہ جنہیں دینی احکام کی تعمیل میں یہ ترتیب نصیب ہو جائے!

آل محمد ﷺ اور اہل بیتؑ کا مفہوم

قرآن کی روشنی میں

آل اور اہل بیت کا مصداق متعین کرنے کے لیے چار لفظوں پر غور کرنا

ضروری ہے:

(۱) آل (۲) اہل (۳) ذریت (۴) عتوت

سب سے پہلے آل اور اہل کا معنی لغت اور قرآن میں تلاش کرتے ہیں۔

لغوی اعتبار سے آل کا لفظ اہل سے مقلوب ہے، چنانچہ آل کی تصغیر اہیل ہے۔
(مفردات، راغب اصفہانی)

اس لیے آل اور اہل دراصل ایک ہی لفظ ہیں اور ان کا مصداق بھی ایک

ہی ہے۔

قرآن مجید نے بھی حضرت لوطؑ کے تذکرے میں ایک ہی مفہوم بیان کرنے

کے لیے کہیں اہل کا لفظ استعمال کیا ہے اور کہیں آل کا۔

ارشاد ہے:

”رب نجنی و اہلی مما یعملون“ (شعراء: ۱۶۹)

”انا منجوک و اہلک الا امرأتک“ (عنکبوت: ۳۳)

”فاسر باہلک بقطع من الیل“ (حجر: ۶۵)

ان آیات میں اہل کا لفظ استعمال ہوا ہے، لیکن درج ذیل آیات میں اسی تذکرے

میں آل کا لفظ استعمال ہوا ہے:

”قالوا انا ارسلنا الی قوم مجرمین الا آل لوط“ (حجر: ۵۸، ۵۹)

”فلما جاء آل لوط المرسلون“ (حجر: ۶۱)

”اخرجوا آل لوط من قریبتکم“ (نمل: ۵۶)

تولعت اور قرآنی استعمال سے معلوم ہوا کہ آل اور اہل کا مصداق ایک ہی ہے۔
اب دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید نے آل اور اہل کے دائرے میں کن کن افراد کو لیا ہے:

(۱) ماں، باپ، بہن، بھائی اہل بیت ہیں۔

حضرت یوسفؑ کے تذکرے میں ہے:

(یوسف: ۶۲)

”اذا انقلبوا الی اہلہم لعلہم یرجعون“

(یوسف: ۶۵)

”ونمیراہلنا“

(یوسف: ۸۸)

”مسنّا و اہلنا الضّر“

حضرت موسیٰؑ کی بہن نے فرعون کے گھر والوں سے کہا:

(قصص: ۱۲)

”هل ادلکم علی اہل بیت یکفلونہ لکم“

حضرت موسیٰؑ نے اپنے بھائی ہارونؑ کے لیے دعا کی:

(طہ: ۲۹، ۳۰)

”واجعل لی وزیراً من اہلی ہرون اخی“

بھائی اہل ہے تو بھائی کی اولاد بھی اہل ہے۔

خیال رہے کہ رسول اللہ ﷺ دعا میں یہاں ہارونؑ کی جگہ علیؑ کا نام لیتے

تھے..... روایت گذشتہ اوراق میں گذر چکی ہے..... لہذا علیؑ بھی اہل بیت میں داخل

ہیں اور علیؑ کی اولاد بھی اہل بیت میں داخل ہے۔

(۲) بیوی اہل بیت ہے۔

ہمارے ہاں بھی کہا جاتا ہے: اہلیہ، گھر والی، زیادہ احترام سے ذکر کرنا ہو تو

کہتے ہیں: گھر والوں نے کہا، اور مراد صرف بیوی ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے بھی بیوی

کے لیے اہل کا لفظ اور صیغہ جمع استعمال کیا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے تذکرے میں ہے:

(طہ: ۱۰)

”فقال لاہلہ امکثوا انی آنست ناراً“

حالانکہ اس موقع پر آپ کے ساتھ صرف آپ کی اہلیہ تھیں، جیسا کہ فرمایا:

”فلما قضیٰ موسیٰ الاجل و ساربا ہلہ“ (قصص: ۲۹)

حضرت ابراہیمؑ کے پاس جب فرشتے آئے تو صرف حضرت سارہؑ آپ کے ساتھ تھیں اور قرآن ان کے لیے صیغہ جمع کے ساتھ اہل کا لفظ استعمال کر رہا ہے:

”رحمة اللہ وبرکاتہ علیکم اہل البیت“ (ہود: ۷۳)

غزوہ احد کے ذکر میں رسول اللہ ﷺ سے خطاب ہے:

”واذ غدوت من اہلک“ (آل عمران: ۱۲۱)

یہاں اہل سے مراد ازواج مطہرات ہیں۔

سورۃ احزاب میں آیت ۲۸ سے آیت ۳۴ تک صیغہ جمع مؤنث کے ساتھ ازواج مطہرات سے خطاب ہے۔ آیت ۳۳، جو آیۃ تطہیر کے عنوان سے معروف ہے، میں ضمیر جمع مذکر اور اہل البیت کا لفظ استعمال ہوا ہے، یہ سیاق واضح کر رہا ہے کہ ازواج بھی اہل بیت میں داخل ہیں۔

(۳) بیٹا بھی اہل بیت میں شامل ہے۔

حضرت نوحؑ نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی:

”ان ابنی من اہلی“ (ہود: ۴۵)

(۴) بیٹی بھی اہل بیت اور آل میں شامل ہے۔

حضرت لوط سے فرمایا گیا:

”فاسر باہلک“ (حجر: ۶۵)

”فلما جاء آل لوط المرسلون“ (حجر: ۶۱)

حضرت لوطؑ کی اولاد صرف بیٹیاں تھیں۔ انہیں آل اور اہل قرار دیا جا رہا ہے۔

سورۃ تحریم میں ہے:

”ومريم ابنت عمران“ (تحریم: ۱۲)

اور سورۃ آل عمران میں ہے:

”ان الله اصطفى آدم ونوحاً و آل ابراهيم و آل عمران على العالمين“
(آل عمران: ۳)

ابراہیمؑ کی اولاد بیٹے، عمرانؑ کی اولاد صرف بیٹی مریمؑ اور مریمؑ کی اولاد صرف عیسیٰؑ، ان سب کے لیے برابر طور پر آل کا لفظ استعمال فرمایا گیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جیسے بیٹا اور بیٹے کی اولاد آل ہے اسی طرح بیٹی اور بیٹی کی اولاد بھی آل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آیۃ تطہیر نازل ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے علی و فاطمہ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم کو اپنی مبارک چادر میں لے کر اور اپنے ساتھ چمٹا کر فرمایا: ”یہی تو میرے اہل بیت ہیں“ علیؑ بھائی بھی ہیں اور بیٹے بھی، فاطمہؑ بیٹی ہیں، حسنؑ اور حسینؑ بیٹی اور بھائی کی اولاد ہیں۔

دور جاہلیت میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ بیٹی کی جب شادی ہو جاتی ہے تو وہ پرانی ہو جاتی ہے اور اپنے گھرانے سے نکل جاتی ہے، اسی طرح بیٹی کی اولاد بھی آل میں شمار نہیں کی جاتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے عمل سے اس جاہلی تصور کی اصلاح فرمائی کہ شادی کے بعد بھی بیٹی اہل بیت میں داخل رہتی ہے اور نہ صرف بیٹی بلکہ بیٹی کی اولاد بھی اہل بیت میں شمار ہوتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ تو جاہلی رسوم کو توڑتے ہوئے سیدہ فاطمہؑ اور ان کی اولاد کو اپنے اہل بیت میں شمار کریں اور جاہلانِ عصر اب بھی جاہلی نظریات کے تحت اس مقدس خانوادے کو اہل بیت نبوی سے باہر رکھنے پر اصرار کریں! بریں عقل و دانش باید گریست

اس حوالے سے ایک روایت فیصلہ کن ہے۔

صحیح بخاری، کتاب التیمم میں حضرت عائشہؓ ایت تیمم کی شان نزول بیان

فرماتی ہیں کہ دوران سفر میں بیداء یا ذات الجیش نامی جگہ میں میرا ہارٹوٹ کر گر گیا، سفر رک گیا، پڑاؤ ایسی جگہ ہوا جہاں پانی دستیاب نہیں تھا، لوگ پریشان ہو کر حضرت ابو بکرؓ کے پاس آئے، حضرت ابو بکرؓ نے مجھے ڈانٹا، رسول اللہ ﷺ آرام فرما رہے تھے، بیدار ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے تیمم کا حکم نازل فرمایا، چنانچہ سب نے تیمم کیا۔ اس پر حضرت اُسید بن حضیرؓ نے کہا:

”ماہی باؤل برکتکم یا آل ابی بکر“

ترجمہ: ”آل ابی بکر! یہ تمہاری کوئی پہلی برکت نہیں ہے!“

(تجرید البخاری حدیث: ۲۱۶)

دیکھئے! شادی کے بعد بھی حضرت عائشہؓ کو آل ابی بکرؓ میں شمار کیا جا رہا ہے۔ اب بھی اگر کوئی نہ سمجھے تو اُسے خدا سمجھے!

(۵) حضرت مریمؑ اپنی خالہ اور خالو حضرت زکریاؑ کے پاس رہتی تھیں، قرآن مجید نے اس سلسلے میں فرمایا:

”اذ انتبذت من اہلها مکاناً شرقیاً“
(مریم: ۱۶)

تو خالو اور خالہ بھی اہل بیت ہوئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ماں باپ کی طرف سے رشتہ دار بھی اہل میں داخل ہیں۔ قرآن مجید کے ان استعمالات سے یہ بات سامنے آئی کہ آل اور اہل کے دائرے میں وہ افراد داخل ہوتے ہیں، جن سے خاندانی قرابت اور خونی رشتہ ہو یا ان سے زوجیت کا تعلق ہو۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی آل اور اہل بیت بھی آپؐ کا خاندان، اولاد اور ازواج ہیں۔

کچھ لوگوں کو آیت: ”ادخلوا آل فرعون اشد العذاب“ (مومن: ۴۶) سے غلط فہمی ہوئی، انہوں نے کہا کہ جیسے آل فرعون سے مراد پوری قوم ہے، اسی طرح

آل محمد ﷺ سے بھی پوری امت مراد ہے۔

یہ درست نہیں، اس لیے کہ مصر میں دو ہی قبیلے آباد تھے: سبطی اور قبطی۔ سبطی بنی اسرائیل ہیں، انہیں اللہ تعالیٰ نے آل یعقوبؑ، آل موسیٰ اور آل ہارونؑ فرمایا۔

اور قبطی فرعون کا قبیلہ تھا، یہ فرعون کے رشتے دار بھی تھے اور پیروکار بھی، انہیں آل فرعون رشتے دار ہونے کی وجہ سے کہا گیا، صرف پیروکار ہونے کی وجہ سے نہیں۔ ہاں دو چار نوکر چاکر اگر قبیلے سے باہر کے بھی ہوں اور فرعونؑی لشکر میں شامل ہونے کی وجہ سے ان کا انجام آل فرعون کا سا ہوا ہو، تو اس سے آل فرعون کے بیان کردہ مفہوم پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اس لیے کہ تغلیب کا استعمال کلام میں عام ہے۔

حاصل بحث یہ ہے کہ قرآنی استعمالات کی روشنی میں آل محمد ﷺ اور اہل بیتؑ کے زمرے میں داخل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ: آپؐ کے رشتے دار بھی ہوں اور پیروکار بھی۔

صرف رشتے دار ہونا یا صرف پیروکار ہونا اہل بیتؑ کے دائرے میں داخل ہونے کے لیے کافی نہیں۔

ذریۃ:

آل محمد ﷺ کا مصداق متعین کرنے کے لیے تیسرا اہم لفظ ذریۃ ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ کئی جگہ استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کے بارے میں فرمایا:

”وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رِسَالًا مِنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجًا وَذُرِّيَّةً“ (رعد: ۳۸)

ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی:

”رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بُوَادِعَ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ“ (ابراہیم: ۳۷)

حضرت زکریاؑ نے دعا کی:

”رب هب لي من لدنك ذرية طيبة انك سميع الدعاء“ (آل عمران: ۳۸)
یہ ذریت کیا ہے؟
ابن حجرؒ فرماتے ہیں:

”هی نسل الانسان من ذکر اوانثی“

”ذریت انسان کی نسل ہے، لڑکے سے ہو یا لڑکی سے“ (مرقاۃ: ۲/۳۳۹)

سورۃ الانعام، آیت: ۸۴، ۸۵ میں سیدنا عیسیٰؑ کو سیدنا ابراہیمؑ کی ذریت میں شمار کیا گیا ہے۔ سیدنا عیسیٰؑ کو ذریت ابراہیمؑ میں داخل ہونے کا شرف صرف اپنی والدہ ماجدہ سیدہ مریمؑ کے ذریعے حاصل ہوا، کیونکہ آپ کی پیدائش بن باپ ہوئی تھی، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بیٹی کی اولاد بھی ذریت میں داخل ہے۔

تفسیر کبیر میں ہے کہ امام ابو جعفرؑ نے حجاج بن یوسف کے سامنے سیدہ فاطمہؑ کی اولاد کے ذریت نبوی ہونے پر آیت مذکورہ بالا اور آیت مباہلہ سے استدلال کیا تھا۔

اسی طرح امام موسیٰ کاظمؑ نے بھی زیر بحث مسئلہ میں عباسی حکمران رشید کے سامنے آیت بالا کو حجت کے طور پر پیش کیا تھا۔

علامہ محمود آلوسی بغدادی (المتوفی ۱۲۷۰ھ) اس بحث کے آخر میں فرماتے ہیں: ”ہمارے اصحاب کے فتاویٰ اس مسئلے میں مختلف ہیں، اور میرا میلان اس قول کی جانب ہے کہ بیٹی کی اولاد بھی ذریت میں داخل ہے۔“ (روح المعانی: ۲/۲۱۴)
اس لیے حضور ﷺ کی بنات طاہراتؑ کی اولاد آپ کی ذریت ہے، اور صلوٰۃ و سلام میں آل محمد ﷺ کا مصداق آپ کی یہی ذریت ہوتی ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ آپ کی نسل سیدہ فاطمہؑ سے چلی، دوسری بنات طاہراتؑ میں بعض

کے ہاں تو اولاد ہی نہیں ہوئی اور بعض کے ہاں اولاد تو ہوئی، لیکن سلسلہ آگے چلا نہیں۔ یہ ایک تکوینی شرف ہے، جو حضرت فاطمہؑ اور آپؑ کی اولاد امجاد کو حاصل ہوا کہ نہ صرف آپؑ کی اولاد باقی رہی بلکہ خوب بڑھی اور تاقیامت بڑھتی رہے گی۔ ”انا اعطینک الکوثر“ کا ایک نمونہ یہ نسل کثیر بھی ہے۔

یوں بھی صورت و سیرت میں آپؑ سے جو مشابہت اور آپؑ کی جو محبت و عطوفت سیدہ فاطمہؑ کو حاصل ہوئی، وہ کسی اور کو حاصل نہ ہوئی، یہ نسلی بقا کا شرف غالباً اسی محبت کا اثر ہے! ”ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء“

بٹی کی اولاد کو اہل بیت میں شامل فرمانا عظیم سماجی انقلاب ہے آپؑ نے قرآن مجید کی روشنی میں بٹی کی اولاد کو اپنے اہل بیت اور اپنی آل قرار دے کر دختر کش معاشرے میں بٹی کا مقام بلند فرمایا اور جاہلی سماج کے بندھنوں کو توڑ دیا۔ بیٹیوں کے معاملے میں ہم ابھی تک جاہلی اثرات سے آزاد نہیں ہو سکے۔ شجرہ نسب میں اب بھی بیٹیوں اور ان کی اولاد کا ذکر نہیں ہوتا۔

لوگ نسل کے لیے بیٹا حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، بیوی پر ظلم ہوتا ہے، طلاقیں ہوتی ہیں۔

بٹی کو ابھی تک کمتر درجے کی اولاد تصور کیا جاتا ہے۔ اگر حضور اکرم ﷺ کی اس انقلاب آفرین سنت کو اپنایا جائے تو ہزاروں پریشانیوں سے نجات ملتی ہے۔

اولاد صرف مرد ہی کی تو نہیں ہوتی، بلکہ مرد اور عورت دونوں کی ہوتی ہے، لہذا پیدا ہونے والے بچے یا بچی کا تعلق دونوں گھرانوں سے ہونا چاہیے۔ بنا بریں یہ انقلابی سنت فطرت کے عین مطابق ہے۔

خیال رہے کہ وراثت کا معاملہ بالکل الگ ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے جس

کا جو حصہ مقرر فرما دیا ہے، وہی ملے گا۔

اسی طرح ہمارے یہاں مغرب کے جاہلی رواج کے مطابق یہ ہوتا ہے کہ شادی سے پہلے بیٹی باپ کی طرف منسوب ہوتی ہے اور شادی کے بعد شوہر کی طرف۔

رسول اللہ ﷺ نے عورت کے تشخص کو عظمت عطا فرمائی، اس کے نسب کو ہر حال میں محفوظ رکھا۔ آپؐ نے اپنی ازواج کو خدیجہ محمد، عائشہ محمد ﷺ نہیں کہلوا یا بلکہ خدیجہ بنت خویلد، عائشہ بنت ابی بکرؓ کہا، سیدہ فاطمہؓ شادی سے پہلے بھی بنت محمد ﷺ تھیں، شادی کے بعد بھی بنت محمد ﷺ ہی رہیں، آپؐ کو فاطمہ علیؓ نہیں کہا گیا۔

عصر حاضر کے مغربی رواج میں رسول اللہ ﷺ کی یہ سنت ہمارے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔

عُتْرَت

احادیث میں عتروت کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے، اس کا مفہوم بھی سمجھ لینا چاہیے۔

علامہ تورپشتیؒ فرماتے ہیں: (ترجمہ) ”کسی شخص کی عتروت اس کے اہل بیت اور اس کا قریبی قبیلہ ہوتا ہے۔ عتروت کا لفظ چونکہ بہت سے مفاہیم رکھتا ہے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے (زید بن ارقمؓ اور جابرؓ کی روایت میں) ”عترتی“ کے بعد ”اہل بیتی“ کا لفظ استعمال فرمایا، تاکہ معلوم ہو جائے کہ عتروت سے آپؐ کی مراد اپنی نسل، اپنے قریب ترین قرابت دار اور اپنی ازواج ہیں۔“ (مرقاۃ: ۱۱/۳۸۵)

حاصل کلام یہ ہے کہ آل اور اہل، ذریت اور عتروت کا لغوی مفہوم اور ان کے قرآنی اور حدیثی استعمالات متعین کرتے ہیں کہ آل محمد ﷺ سے مراد صرف آپؐ کا خاندان اور آپؐ کا گھرانہ ہے۔

صلوٰۃ وسلام میں آل محمد ﷺ کا مصداق ازواج و ذریتؑ ہے درود ابراہیمی اہم ترین درود ہے، جو خود آپؐ نے نماز میں پڑھنے کے لیے تلقین فرمایا۔ یہ درود شریف روحانی برکتوں کے علاوہ صلوٰۃ وسلام میں آل محمد ﷺ کی تفسیر بھی کرتا ہے۔

اس درود میں رسول اللہ ﷺ نے آل محمد کے لیے آل ابراہیم جیسی رحمتوں اور برکتوں کی دعا کی ہے، اس لیے پہلے دیکھتے ہیں کہ آل ابراہیم کا مصداق کون ہیں؟ قرآن مجید نے زوجہ ابراہیمؑ سارہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

”رحمت اللہ وبرکاتہ علیکم اهل البيت“ (ہود: ۷۳)

اس آیت اور درود ابراہیمی میں اللھم صل اور اللھم بارک کے الفاظ کا مفہوم ایک ہے۔ درود میں آل ابراہیم کا لفظ ہے اور یہاں آیت میں اہل البيت کا، جبکہ خطاب زوجہ سے ہے تو معلوم ہوا کہ آل اور اہل البيت میں زوجہ داخل ہے۔ حضرت یعقوبؑ نے حضرت یوسفؑ سے فرمایا:

”وایتم نعمتہ علیک وعلی آل یعقوب کما أتمہا علی ابویک من قبل ابراہیم واسحق“ (یوسف: ۶)

اس میں آل کا لفظ ذریت کے لیے استعمال ہوا ہے۔

ابراہیمؑ نے اپنی آل کے لیے رحمتوں، برکتوں کی دعائیں کیں، قرآن مجید میں ان دعاؤں کا یوں ذکر ہے:

”ربنا واجعلنا مسلمین لک ومن ذریتنا أمة مسلمة لک“ (بقرہ: ۱۲۸)

”قال انی جاعلک للناس اماماً، قال ومن ذریتی“ (بقرہ: ۱۲۴)

”رب اجعلنی مقيم الصلوة ومن ذریتی ربنا وتقبل دعاء“ (ابراہیم: ۴۰)

درود ابراہیمی میں رسول اللہ ﷺ انہی دعاؤں کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی آل کے لیے دعا کر رہے ہیں۔

اب درود ابراہیمی میں رحمت و برکت کی دعا کے حوالے سے آل ابراہیم کا لفظ ہے، اور قرآنی دعاؤں میں آل کی جگہ ذریت کا لفظ ہے، اس سے متعین ہو جاتا ہے کہ آل سے مراد ذریت ہے۔

تو قرآن مجید کے ان استعمالات سے یہ بات سامنے آئی کہ آل ابراہیم

سے مراد ازواج و ذریت ہے، لہذا جو مصداق آل ابراہیم کا ہے، وہی مصداق آل محمد ﷺ کا ہونا چاہیے۔

اور خود رسول اللہ ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے اس کی یہی توضیح فرمائی ہے۔ ہم نماز میں عام طور پر جو درود پڑھتے ہیں، یہ کعب بن عجرہؓ کی روایت ہے اور متفق علیہ ہے، اس میں ”آل محمد“ کا لفظ ہے۔ یہی درود ابو حمید الساعدیؓ سے بھی مروی ہے اور یہ روایت بھی متفق علیہ ہے، اس روایت میں الفاظ یوں ہیں:

”اللہم صل علی محمد وازواجه وذریتہ کما صلیت علی آل ابراہیم وبارک علی محمد وازواجه وذریتہ کما بارکت علی آل ابراہیم، انک حمید مجید“

(مسلم، الصلوۃ: 615، ابوداؤد، الصلوۃ: 832، ابن ماجہ، اقامۃ الصلوۃ: 895 مشکوٰۃ: الصلوۃ علی النبی ﷺ، متفق علیہ)

اس روایت نے قطعی طور پر متعین کر دیا کہ آل محمد ﷺ اور اہل بیت سے مراد ازواج مطہرات اور ذریت اطہار رضی اللہ عنہم ہیں۔ ازواج و اولاد کے لیے دعا رحمن کے بندوں کی شان ہے اور فطرت کا تقاضا ہے، قرآن مجید میں ہے کہ رحمن کے بندے یہ دعا کرتے رہتے ہیں:

”ربنا ھب لنا من ازواجنا وذریتنا قرۃ اعین واجعلنا للمتقین اماما“

(الفرقان: ۷۴)

یہ دعا بھی قرینہ ہے کہ درود میں آل کا مصداق ازواج و ذریت ہے، اس لیے کہ انسان کو آنکھوں کی ٹھنڈک انہی کے آرام اور سکون سے حاصل ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو اور اہل و عیال کو آگ سے بچانے کی تلقین فرمائی:

”قوا انفسکم واهلیکم نارا“ (تحریم: ۶)

اولاد کی اصلاح کے لیے دعا تعلیم فرمائی: ”واصلح لی ذریتی“ (احقاف: ۱۵)

داؤد کے گھرانے کو نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے لیے اعمال صالحہ کا حکم دیا:

”اعملوا آل داؤد شکراً“ (سبا: ۱۳)

ان تعلیمات سے معلوم ہوا کہ گھرانہ اسلام کی نظر میں نہایت اہمیت رکھتا ہے، حضور ﷺ بھی امت سے اپنے گھرانے کے لیے رحمت و برکت کی دعا طلب فرما رہے ہیں۔

تو یہاں درود میں آل محمد ﷺ کا وہی مفہوم ہے، جو آیت مذکورہ میں آل داؤد کا ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ ابراہیمی دعاؤں کا حوالہ اور رسول اللہ ﷺ تو ضیح اور قرآنی تعلیم متعین کر دیتی ہے کہ جو مصداق آل ابراہیم کا ہے، وہی مصداق آل محمد ﷺ کا ہے۔

لیکن کچھ لوگوں کی سوچ عجیب ہے، آل ابراہیم میں تو گھرانہ، ذریت اور اولاد مراد لیتے ہیں، لیکن آل محمد ﷺ میں یہی مفہوم چھوڑ کر پوری امت کو داخل کر لیتے ہیں!

دیکھئے! اللہ تعالیٰ نے آیتِ اصطفیٰ (آل عمران: ۳۳) میں اعلان فرمایا کہ آل ابراہیم اور آل عمران سب اہل جہان میں ہمارے مصطفیٰ، منتخب اور برگزیدہ ہیں،

آل محمد ﷺ آل ابراہیم میں داخل ہے..... بلکہ علامہ آلوسیؒ تو

روح المعانی میں یہ روایت نقل فرماتے ہیں اور بلا تردید نقل فرماتے ہیں کہ ائمہ اہل

بیت اس آیت میں یوں پڑھتے تھے: ”وآل محمد علی العالمین“ یہ قرأت

اگرچہ شاذ ہے، لیکن تفسیر تو بن سکتی ہے!..... بہر کیف! یہ آیت بتلا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ

نے آل محمد ﷺ کو اہل جہان پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔

کوئی یہ نہ کہے کہ یہ ایمانی فضیلت ہے!

اس لیے کہ کافروں کے مقابلے میں ایمانی فضیلت تو سبھی مومنین کو حاصل ہے،

یہاں اہل ایمان پر بھی فضیلت عطا فرمائی جا رہی ہے، اور یہ ہے نسبت کے ساتھ

نسب کی فضیلت.....

اب سوچنے کی بات ہے کہ اگر پوری امت آل ہے تو آل محمد ﷺ

کی شانِ اصطفیٰ کیا ہوئی؟ ان کا کیا اعزاز باقی رہا؟

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دین کے ساتھ دنیا تو سب کو دی، لیکن اپنے خاندان اور بالخصوص اپنے گھرانے کے لیے صرف دین کو پسند کیا، زکوٰۃ و صدقات سے تو اپنے خاندان کو عمومی طور پر محروم فرمایا، لیکن خاص اپنے لیے اور اپنے گھرانے کے لیے فقرا اختیار فرمایا۔

ازواج مطہراتؑ نے نان و نفقہ میں اضافے کا سوال کیا تو ارشاد ہوا: (ترجمہ) ”اگر تم دنیوی زندگی اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ دے دیتا ہوں اور خوبصورتی کے ساتھ تمہیں رخصت کر دیتا ہوں“ (احزاب: ۲۸)

سیدہ فاطمہؑ خادمہ مانگنے آئیں تو تسبیح، تحمید اور تکبیر کا تحفہ ملا۔
ابن سعدؒ یہ نصیحت آموز اور بصیرت افروز واقعہ نقل کرتے ہیں:

(ترجمہ) ”ایک دن علیؑ نے فاطمہؑ سے کہا:

”پانی کھینچ کھینچ کر میرے سینے میں درد ہونے لگا ہے، اللہ نے (مال غنیمت میں) تمہارے ابا (ﷺ) کو قیدی عطا فرمائے ہیں، جاؤ اور کوئی خادم مانگ لاؤ“
فاطمہؑ نے کہا: ”اور اللہ کی قسم آٹا پیس پیس کر میرے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔“
چنانچہ سیدہ فاطمہؑ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔

آپؐ نے پوچھا: بیٹیا! کیسے آنا ہوا؟

عرض کیا: بس سلام کے لیے حاضر ہوئی تھی۔

مانگنے سے شرمائیں اور لوٹ گئیں۔

علیؑ نے پوچھا: کیا کر کے آئی ہو؟

کہا: مجھے مانگنے سے شرم آئی۔

پھر دونوں اکٹھے ہو کر خدمت والا میں حاضر ہوئے، اپنی اپنی تکلیفیں ذکر کر کے ایک خادم کی درخواست کی۔

اس پر آپؐ نے فرمایا:

”اللہ کی قسم یہ نہیں ہو سکتا کہ تمہیں دے دوں اور اہل صفہ کو چھوڑ دوں، وہ بھوکے ہوتے ہیں اور میرے پاس ان پر خرچ کرنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا، میں یہ قیدی بیچوں گا اور ان کی قیمت ان پر خرچ کروں گا۔“

دونوں خالی ہاتھ لوٹ آئے۔ بعد میں نبی کریم ﷺ ان کے پاس آئے، اس وقت دونوں اپنے کمرے میں داخل ہو چکے تھے، اور کمرے کا حال یہ تھا کہ سر ڈھانپا جائے تو پاؤں ننگے اور پاؤں پر ڈالا جائے تو سر ننگا۔ آپ کو دیکھ کر دونوں جلدی سے اٹھے، آپ نے فرمایا: بیٹھے رہو، کیا میں تمہیں تمہاری فرمائش سے بہتر نہ دے دوں؟ عرض کیا: کیوں نہیں!

فرمایا ”یہ چند کلمات ہیں جو مجھے جبریلؑ نے سکھائے ہیں، ہر (فرض) نماز کے بعد دس مرتبہ سبحان اللہ، دس مرتبہ الحمد للہ اور دس مرتبہ اللہ اکبر کہہ لیا کرو، اور جب بستر پر لیٹنے لگو تو 33 مرتبہ تسبیح، 33 مرتبہ تحمید اور 34 مرتبہ تکبیر کہہ لیا کرو۔“

علیؑ فرماتے ہیں: اللہ کی قسم جب سے رسول اللہ ﷺ نے مجھے یہ کلمات سکھائے ہیں، میں نے کبھی انہیں ترک نہیں کیا۔

ابن الکواء نے پوچھا: صفین کی رات بھی نہیں؟!

فرمایا: اہل عراق! تمہیں خدا سمجھے، صفین کی رات بھی نہیں۔“

(طبقات ابن سعد: ۸/۲۵)

غالباً اسی تعلیم کے بعد حضرت علیؑ نے دنیا کو تین طلاقیں دی تھیں!

اور آپؑ نے اپنے تر کے کے بارے میں وصیت بھی یہ فرمائی:

”کوئی ہمارا وارث نہیں ہوگا، ہمارا ترکہ صدقہ ہے۔“ (صحیح بخاری: ۵۲۶/۱)

تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے لیے اور اپنے گھرانے کے لیے زکوٰۃ و صدقات کو حرام ٹھہرانے کے ساتھ فقر اختیار فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس قربانی کا انعام صلوٰۃ و سلام کی صورت میں عطا ہوا، یہی آل محمد ﷺ کی شانِ اصطفیٰ

ہے اور اسی سے دین میں اُن کا مقام متعین ہوتا ہے۔ آل ابراہیمؑ، جن کے حوالے سے حضور ﷺ نے اپنی آل کے لیے دعا کی ہے، انہیں بھی قربانیوں کے صلے میں اللہ تعالیٰ نے یہی شان اصطفاء عطا فرمائی تھی۔

الغرض صلوٰۃ و سلام بدل ہے فقراختیاری کا، اور آپؐ نے فقراختیار فرمایا اپنے لیے اور اپنی ازواج و ذریت کے لیے، اس قرینے سے بھی متعین ہوتا ہے کہ صلوٰۃ و سلام میں آل محمد ﷺ سے مراد ازواج و ذریت ہی ہے۔

درود میں آل محمد ﷺ کا مفہوم مزید سمجھنے کے لیے سورہ احزاب میں غور کیجئے۔ اس سورت میں سب سے پہلے تَبَنِّی (منہ بولے بیٹے کو حقیقی بیٹا تصور کرنا) کی رسم توڑی گئی اور یہ رسم توڑنے میں آپؐ کے گھرانے نے آپؐ کا بھرپور ساتھ دیا۔ پھر غزوہ احزاب کا ذکر ہے، اس غزوے کی کامیابی میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اہل بیتؑ کا خاص حصہ ہے۔

پھر رسول اللہ ﷺ کو مثالی شخصیت اور آپؐ کے گھرانے کو مثالی گھرانہ قرار دیا گیا۔ پردے کا حکم آیا، نکاح نبوی کے خصوصی احکام ارشاد ہوئے، اہل بیتؑ کے لیے نیکی کی جزا اور کوتاہی کی سزا دینی رکھی گئی، اہل بیتؑ نے ان احکام کو دل و جان سے قبول کیا اور اسلامی معاشرہ برپا کرنے کے لیے بے مثال کردار ادا کیا اور تمام مخالفتوں کو بڑے حوصلے سے برداشت کیا۔

اس پس منظر میں فرمایا گیا:

”ان الله وملائكته يصلون على النبی“

(ترجمہ) ”یقیناً اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں“

یعنی اے نبی! ہزار مخالفتوں اور اندیشوں کے باوجود آپؐ نے ہمارے احکام کی تعمیل میں جو کارنامے انجام دیے اور کوئی کسر نہ چھوڑی اس پر ہم اور ہمارے فرشتے آپؐ کو آفرین کہتے ہیں اور آپؐ کے کردار کی تحسین کرتے ہیں۔

”یا ایہا الذین آمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما“ (احزاب: ۵۶)

(ترجمہ) ”اے ایمان والو! تم بھی آپؐ پر صلوٰۃ اور خوب سلام بھیجو“

یعنی آپؐ کی خدمات اور احسانات کا دل و جان سے اعتراف کرو، اللہ سے آپؐ کے لیے رحمت کی دعا کرو اور آپؐ کے حضور سلام عقیدت پیش کرتے رہو۔

تو امت کی طرف سے صلوٰۃ و سلام درحقیقت خراج تحسین اور نذرانہ عقیدت ہے۔

اب قرآن مجید نے تو صرف آپؐ پر صلوٰۃ و سلام کا ذکر فرمایا، لیکن جب آپؐ سے پوچھا گیا: ہم آپؐ پر صلوٰۃ کیسے بھیجیں؟

تو آپؐ نے فرمایا: یوں کہو: اللھم صل علی محمد وعلی آل محمد کما گویا یہ بتلایا کہ ان احکام کی تعمیل میں میری آل اور میرے اہل بیت میرے معاون رہے، اس لیے تمہارے صلوٰۃ و سلام کے میرے ساتھ وہ بھی مستحق ہیں۔

پس سورہ احزاب کے ان احکام کے پس منظر میں صلوٰۃ و سلام کے قرینے سے بھی متعین ہوتا ہے کہ صلوٰۃ و سلام میں آل محمد ﷺ سے مراد صرف ازواج و ذریت ہی ہے، پوری امت آل کا مصداق نہیں۔

حاصل کلام یہ کہ آل محمد ﷺ کے دو دائرے ہیں: ایک عام اور دوسرا خاص، آل کا عمومی دائرہ آپؐ پر ایمان لانے والے خاندان کو شامل ہے، یہ حرمت زکوٰۃ و صدقات کا دائرہ ہے۔

اس دائرے میں آل علیؑ، آل عقیلؑ، آل جعفرؑ اور آل عباسؑ داخل ہیں، علیؑ، عقیلؑ اور جعفرؑ نے ایمان کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی رفاقت و خدمت کی اور صعوبتیں برداشت کیں، عباسؑ نے خفیہ طور پر ایمان قبول کیا اور نہایت کڑے وقت میں اسلام کی خفیہ خدمت کی، اس لیے ان حضراتؑ کی آل کو ممتاز مقام عطا ہوا اور زکوٰۃ و صدقات ان کے لیے حرام قرار دیے گئے کہ یہ مال کا میل ہے، ان کی شان اس سے بالا ہے۔

آل کا ایک دائرہ خصوصی ہے، یہ آپؐ کی ازواج و ذریت پر مشتمل ہے، یہ وہ دائرہ

خاص ہے جس میں زکوٰۃ و صدقات کے علاوہ دنیا کا گزر بھی حرام ٹھہرایا گیا اور ان کے لیے فقر اختیار فرمایا گیا اور پوری امت کے لیے مثال اور اسوہ بننے کی ذمہ داری ان پر ڈالی گئی اور انہوں نے اس ذمے داری کو قبول کیا۔

آل کا یہ دائرہ خاص رسول اللہ ﷺ کی خصوصی تربیت اور نگاہ شفقت کا مرکز رہا، میدان مباہلہ میں خصوصی طور پر انہیں لایا گیا، رسول اللہ ﷺ نے اپنی پاک چادر میں لے کر ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے عرض کیا: ”اللهم هؤلاء اهل بيتي“ اے اللہ! یہی تو میرے خاص اہل بیت ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے بعد ان کے احترام و اکرام کی خصوصی وصیت فرمائی، اس لیے عمومی احترام تو سبھی آل کے لیے ہے، لیکن خصوصی احترام یعنی صلوة و سلام خصوصی آل یعنی ازواج مطہرات اور ذریت اطہار کے لیے ہے۔

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں:

”وكلما كانت جهة القرابة اقوى كان طلب المودة

اشد، فمودة العلويين الفاطميين الزم من محبة

العباسيين“ (روح المعاني: ۲۵/۳۳)

(ترجمہ) ”رسول اللہ ﷺ سے جس کی جتنی قرابت زیادہ ہوگی، اس کے بارے میں مودت کا تقاضا اتنا ہی شدید ہوگا، لہذا بنی فاطمہؑ کی مودت بنی عباسؑ کی محبت سے زیادہ لازم ہے۔“

الغرض زکوٰۃ و صدقات کے مسائل میں جہاں آل محمد ﷺ کا ذکر آتا ہے، وہاں اہل ایمان خاندان مراد ہوتا ہے اور صلوة و سلام میں آل محمد ﷺ سے ازواج و ذریت مراد ہوتی ہے۔

حقیقی اور حکمی اہل بیتؑ

رسول اللہ ﷺ نے بعض صحابہ مثلاً سلمان فارسیؓ، عبد اللہ ابن مسعودؓ گوان کے اخلاص، وفا، قربت کی بنا پر اہل بیت میں محسوب فرمایا، لیکن یہ صورت حکمی اہل بیت کی ہے، حقیقی اہل بیت وہی ہیں، جن سے قرابت اور زوجیت کا تعلق ہے۔ قرابت اور قربت میں جو لطیف فرق ہے، یہی حقیقی اور حکمی اہل بیت کا مرتبہ متعین کرتا ہے!

جیسے سورہ اخلاص تہائی قرآن کا ثواب رکھتی ہے، لیکن یہ ثواب حکمی ہے، حقیقی تہائی قرآن کا ثواب اس سے کہیں زیادہ یعنی دس گنا ہے، اسی طرح اہل بیتؑ میں بھی حقیقی اور حکمی کا فرق ملحوظ رکھنا چاہیے۔

ازواج اور اقرباء میں فرق

کسی بھی شخص کی ازواج اور اقرباء اس کے اہل بیت ہیں، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ ازواج تا نکاح اہل بیت ہیں اور اقرباء تا بقا اہل بیت ہیں، رشتہ نکاح ٹوٹا، اہلیہ اہل بیت سے خارج، لیکن اقرباء سے رشتہ خون ٹوٹ نہیں سکتا، اس لیے اقرباء دائمی اہل بیت ہیں۔

”خطاب خم“ کی روایت میں زید بن ارقمؓ نے اسی فرق کی طرف اشارہ کیا ہے، راوی حصینؓ نے زید بن ارقمؓ سے پوچھا:

”زید! آپؑ کے اہل بیت کون ہیں؟ کیا آپؑ کی ازواج آپؑ کے اہل بیت میں نہیں ہیں؟“

فرمایا: ”آپؑ کی ازواج آپؑ کے اہل بیت سے ہیں، لیکن آپؑ کے اہل بیت وہ ہیں، جن پر آپؑ کے بعد بھی صدقہ حرام رہا۔“

پوچھا: ”وہ کون ہیں؟“

فرمایا: ”آل علیؑ، آل عقیلؑ، آل جعفرؑ، آل عباسؑ“ (صحیح مسلم: ۲۷۹/۲)

غالباً اسی فرق کی وجہ سے کتب احادیث میں مناقب اہل بیتؑ اور مناقب ازواجِ عموماً الگ الگ ابواب میں ذکر کیے جاتے ہیں۔

ازواجِ مطہراتؑ کو البتہ یہ امتیاز حاصل ہے کہ کوئی زوجہٗ مطہرہؑ آپؐ سے جدا نہیں ہوئیں۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں ”امہات المؤمنین“ کا شرف عطا فرمایا۔ (احزاب: ۶) اور حرمت ایذا رسول ﷺ کی وجہ سے آپؐ کی وفات کے بعد ازواجِ مطہراتؑ سے نکاح ہمیشہ کے لیے حرام ٹھہرایا۔ (احزاب: ۵۳)

اسی طرح ازواجِ مطہراتؑ آپؐ کی حیات طیبہ میں جن بیوت میں رہتی تھیں، آپؐ کی وفات کے بعد بھی انہی بیوت میں قیام پذیر رہیں۔

اس لیے ازواجِ مطہراتؑ جیسے آپؐ کی حیات مقدسہ میں اہل بیتؑ میں داخل تھیں، اسی طرح آپؐ کی وفات کے بعد بھی اہل بیتؑ میں شامل رہیں، اور قیامت تک صلوٰۃ و سلام میں آل محمد کے دائرے میں ذریت کے ساتھ شامل رہیں گی۔

صلی اللہ علیہ وآلہ وبارک وسلم

صلوٰۃ وسلام صرف محمد و آل محمد کا حق ہے

صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

مستند کتب احادیث میں صحیح سند کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے صلوٰۃ وسلام کے جتنے صیغے وارد ہوئے ہیں، ان میں ”محمد ﷺ کے ساتھ اکثر روایات میں ”آل محمد“ کا لفظ استعمال ہوا ہے اور بعض روایتوں میں اسی کی وضاحت ”وازدواجہ وذریۃ“ کے الفاظ سے ہے۔

صحیح بخاری، صحیح مسلم، مؤطا امام مالک، سنن ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، مسند احمد، سنن دارمی، مصنف ابن ابی شیبہ کی روایات صلوٰۃ وسلام ہمارے سامنے ہیں..... اختصار کی وجہ سے روایات نقل نہیں کر رہا، متعلقہ مقامات دیکھیے..... ان میں کسی روایت میں ”محمد و آل محمد“ ﷺ پر اضافہ نہیں ہے۔

جن دو تین روایتوں میں الفاظ مختلف ہیں یا اضافہ ہے، اولاً تو ایسی روایات ثانوی درجے کی کتب میں ہیں اور پھر موقوف ہیں یا منقطع، ان روایات کی سند ضعیف ہے۔

صلوٰۃ وسلام ہمارے لیے ایک اہم عبادت ہے، اور عبادات میں ہم رسول اللہ ﷺ کے بتلائے ہوئے طریقے کے پابند ہیں، صحیح اور مرفوع روایات میں صرف ”محمد و آل محمد“ ﷺ کا ذکر ہے، اس لیے ضعیف روایات کے سہارے اس میں زیادت درست نہیں۔

سطور بالا میں سورہ احزاب کے حوالے سے یہ بات آچکی ہے کہ دین کی اقامت و اشاعت میں آل محمد ﷺ نے جس طرح محمد ﷺ کی نصرت و اعانت کی، نزول وحی سے تادم آخر تنفیذ دین کے لیے جو مثالی کردار ادا کیا اور مثالی زندگی بسر کی، صلوٰۃ وسلام درحقیقت ان قربانیوں کا ربانی صلہ ہے۔

علاوہ ازیں دور نبوی سے تا امروز اسلام کی دشمن تین قوتیں ہیں: مشرکین، یہود، نصاریٰ، ان اسلام دشمن قوتوں کی سرکوبی میں اہل بیت کا خصوصی کردار ہے،

یہود کے مرکز خیبر کی فتح سیدنا علیؑ کے ہاتھ پر ہوئی،

اور ان تمام معرکوں میں ازواجِ مطہرات آپؐ کی دلجوئی کرتیں اور ڈھارس بندھاتی رہیں، تاریخِ اسلام کے روحانی مقابلوں میں بھی ذریتِ اطہارؑ کی پاکیزہ روحانیت نے اہل اسلام کی لاج رکھی،

اہل بیتؑ کی یہ وہ عظیم الشان خدمات ہیں، جن پر امت تا قیامت ان کی احسان مند رہے گی،

اس پر یہ شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ قرآن مجید میں حضور اکرم ﷺ کو فرمایا گیا:

”وصل علیہم، ان صلواتک سکن لہم“ (توبہ: ۱۰۳)

اور آپؐ نے خود عافرمائی اور یہ صحیح سند سے مروی ہے:

”اللهم صلّ علی آل ابی اوفی“

اس لیے کہ اضافت سے لفظ کا معنی و مفہوم بدل جاتا ہے۔ صلوٰۃ کا معنی صلوٰۃ بھیجنے والے کی حیثیت سے متعین ہوتا ہے، جب صلوٰۃ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو معنی اور، فرشتوں کی طرف ہو تو معنی اور، امت کی طرف ہو تو معنی اور، اسی طرح جس پر صلوٰۃ

بھیجی جا رہی ہے، اس کی حیثیت سے بھی معنی بدل جائے گا۔ اللہ اور فرشتے نبی پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں ”ان الله وملائكته يصلون على النبي“ (احزاب: ۵۶) اور امت پر بھی صلوٰۃ بھیجتے ہیں: ”هو الذي يصلي عليكم وملائكته“ (احزاب: ۴۳) لیکن پیغمبر ﷺ پر صلوٰۃ کی نوعیت اور ہے اور امت کے لیے اور، امت کے لیے صلوٰۃ کا مفہوم اسی آیت کا اگلا جملہ خود واضح کر رہا ہے: ”ليخرجكم من الظلمات الى النور“ اسی طرح ”ان صلواتك سكن لهم“ کے قرینے سے واضح ہوتا ہے کہ ”صل علیہم“ میں عمومی دعائے رحمت مراد ہے، جو آپؐ صدقہ لانے والے ہر شخص کے لیے کیا کرتے تھے۔

عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کی (ارشاد ربانی کی تعمیل میں) عادت تھی کہ جب کوئی شخص آپؐ کے پاس صدقہ لاتا تو آپؐ دعا کرتے ”اللهم صل علی آل فلان“ جب میرے والد آپؐ کی خدمت میں صدقہ لے کر حاضر ہوئے تو آپؐ نے دعا کی: اللهم صل علی آل ابی اوفیٰ“ (صحیح بخاری: باب وجوب الزکوٰۃ)

لیکن وہ صلوٰۃ و برکت جو ”کما صلیت علی ابراہیم و علی آل ابراہیم“ اور ”کما بارکت علی ابراہیم و علی آل ابراہیم“ میں ہے، صلوٰۃ کی یہ نوعیت صرف ”محمد و آل محمد ﷺ“ کے لیے مخصوص ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ”آل ابی اوفیٰ“ والی روایت کے باوجود فقہاء کا فتویٰ ہے کہ غیر انبیاء پر بالاستقلال صلوٰۃ بھیجنا درست نہیں، حالانکہ اس روایت میں آل ابی اوفیٰؓ پر مستقر صلوٰۃ ہے! اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ یہاں صلوٰۃ کا مفہوم وہ نہیں، جو درود میں ہوتا ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے یہاں دعا میں ”صلوٰۃ“ کا لفظ استعمال فرمایا، لیکن درود میں ”آل محمد“ کے علاوہ کسی اور کا ذکر نہیں فرمایا، اس سے بھی ”صلوٰۃ“ کی نوعیت کا فرق معلوم ہوتا ہے۔

اسی طرح ”السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین“ میں سلام اور ”وسلموا تسلیماً“ کی تعمیل میں محمد و آل محمد ﷺ پر سلام کی نوعیت بالکل مختلف ہے، ہر ایک پر سلام اُس کی شان اور مرتبے کے مطابق ہوتا ہے، آخر ہم ایک دوسرے کو بھی تو ”السلام علیکم“ کہتے ہیں، کوئی کسی کا سلام پہنچائے تو وعلیک وعلیہ السلام کہتے ہیں، لیکن یہ سلام دعا ہے، وہ سلام عقیدت، یہ سلام التفات ہے، وہ سلام ارادت، یہ تالیف ہے، وہ تعمیل، یہ سنت ہے، وہ فرض، تو کہاں یہ سلام اور کہاں وہ سلام!

حاصل بحث یہ ہے کہ آیت صلوٰۃ و سلام کی تعمیل میں جو صلوٰۃ و سلام پڑھا جاتا ہے، یہ ”محمد و آل محمد“ ﷺ کے لیے مخصوص ہے۔

صحابہ کرامؓ کے درمیان اہل بیتؑ مخصوص مقام رکھتے ہیں یہاں ایک روایت قابل ذکر ہے۔

ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ”نبی اکرم ﷺ کے دور مبارک میں ہم کسی کو ابو بکرؓ کے برابر نہیں سمجھتے تھے، پھر عمرؓ کا شمار ہوتا تھا، پھر عثمانؓ کا، اس کے بعد ہم اصحابؓ (کے مراتب کا معاملہ) چھوڑ دیتے تھے کہ باہم ایک دوسرے پر فضیلت نہیں دیتے تھے۔“

(مشکوٰۃ، مناقب ابی بکرؓ، عن البخاری)

سوال پیدا ہوا کہ علیؓ، حسنینؓ اور عیینؓ کا امتیازی مقام تو مسلم ہے، ان کا ذکر کیوں نہیں کیا؟

ملا علی قاریؒ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:

(ترجمہ) ”یہ ایک دوسرے پر فضیلت کی باتیں اصحابؓ کے درمیان ہیں ”واما اہل البیت فہم اخص منہم و حکمہم یغایرہم“ رہے اہل بیتؑ! تو وہ اصحابؓ میں مخصوص ترین ہیں، اور ان کا حکم ان سے مختلف ہے۔“ (مرقاۃ: ۱۱/۲۸۵)

جب اہل بیتؑ کا مقام مخصوص ہے تو اُن کے آداب بھی مخصوص ہونے چاہیں، اور ان کے مخصوص آداب یہی صلوٰۃ و سلام اور وجوب مودت ہے۔

صلوٰۃ و سلام کا اعزاز ذریت میں صرف اتقیا کو حاصل ہوتا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ سادات میں بہت سے لوگ فاسقانہ زندگی بسر کرتے ہیں، کئی دنیا کے بندے ہیں، کچھ گمراہ ہو کر دائرۃ اسلام سے ہی نکل چکے ہیں، تو کیا ہمارا صلوٰۃ و سلام ان لوگوں کے لیے بھی ہے؟

ایک روایت سے اس کا جواب ملتا ہے۔

عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں: ”ہم نبی ﷺ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے، فتنوں کا ذکر شروع ہوا تو آپؐ نے بہت سے فتنوں کا ذکر فرمایا یہاں تک کہ ”فتنۃ احلاس“ کا ذکر ہوا تو ایک صاحب نے پوچھا:

فتنۃ احلاس کیا ہے؟

فرمایا: یہ بھگڈ اور لوٹ مار کا فتنہ ہوگا، پھر خوشحالی کا فتنہ ہوگا، اس فتنے کی آگ میرے قدموں تلے سے میرے اہل بیت کا ایک شخص بھڑکائے گا، وہ سمجھتا ہوگا کہ وہ مجھ سے ہے، حالانکہ وہ مجھ سے نہیں ہے، میرے اولیاء تو بس متقین ہیں.....“

(مشکوٰۃ: کتاب الفتن، الفصل الثانی، عن ابی داؤد)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ اہل بیت کا وہ فرد آل میں داخل رہے گا، جو تقویٰ کی زندگی بسر کرے، صلوٰۃ و سلام کا اعزاز اُس سید کو حاصل ہوگا، جس کے اعمال سے سنت کا نور جھلکتا ہو، جو نسب کے ساتھ نسبت کی بھی حفاظت کرے، خود صراطِ مستقیم پر چلے، دوسروں کو سیدھی راہ پر لانے کی کوشش کرے تو ایسے سید کا ہر احترام و اکرام واجب ہے۔

لیکن جو اپنے نسب کی لاج نہ رکھے، حضور ﷺ سے نسبت توڑ بیٹھے، فاسق و فاجر ہو، فتنہ باز ہو، خواہ دنیوی فتنے برپا کرے یا دینی، وہ آلِ محمد ﷺ سے خارج ہو کر صلوٰۃ

وسلام کے اعزاز سے محروم ہو جاتا ہے۔

یہاں ایک دوسری روایت کا ذکر بھی لازم ہے۔ دیلمی نے انسؓ سے روایت کیا ہے کہ ”رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: آل محمد کون ہے؟

فرمایا: ہر تقی آل محمد سے ہے، پھر آپؐ نے یہ آیت پڑھی

(ترجمہ) ”اُس کے اولیاء صرف متقین ہیں“ (مرقاۃ: ۲/۳۳۸)

اس روایت کا یہ مطلب نہیں کہ جو ذریت میں نہ بھی ہو، صرف تقویٰ کی وجہ سے آل میں داخل ہو جائے گا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ میری ذریت کا ہر تقی میری آل میں ہے اور رہے گا، جو تقویٰ کی راہ سے ہٹ جائے گا، وہ میری آل سے نکل جائے گا..... مذکورہ بالا روایت اور گذشتہ دلائل کی روشنی میں اس روایت کا یہ مفہوم متعین ہوتا ہے، چنانچہ روایت بالا کے بارے میں ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں:

”وهذا ابلغ من حديث آل محمد كل تقى“ (مرقاۃ: ۱۰/۱۳۳)

یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نوحؑ سے وعدہ کیا تھا کہ میں طوفان سے تمہارے اہل کو بچاؤں گا، لیکن جب بیٹا ڈوب گیا تو نوحؑ نے عرض کیا:

”يا رب ان ابني من اهلي وان وعدك الحق وانت احكم الحاكمين“ (ترجمہ) ”میرے رب! میرا بیٹا میرے اہل سے ہے، تیرا وعدہ سچا ہے اور تو احکم الحاکمین ہے“

جواب ملا: ”يا نوح انه ليس من اهلك“

(ترجمہ) ”نوح! وہ تیرے اہل سے نہیں ہے۔“

اس لیے نہیں کہ نسب میں شک ہے بلکہ:

”انه عمل غير صالح“

(ترجمہ) ”اس لیے کہ وہ سراپا بد عمل ہے۔“ (ہود: ۲۵، ۲۶)

تو جیسے نوحؑ کا بیٹا بد عمل ہونے کی وجہ سے سفینہ نجات و رحمت سے محروم رہا، اسی طرح اہل بیت اور ذریت نبویؐ میں جو بد عمل ہوگا، وہ صلوٰۃ و سلام کے شرف سے محروم رہے گا۔ یہی بات ابراہیمؑ نے اپنی ذریت کے بارے میں کہی:

”فمن تبعنی فانه منی ومن عصانی فانک غفور رحیم“ (ابراہیم: ۳۶)
(ترجمہ) ”سو جو میری پیروی کرے گا، وہ مجھ سے ہے، اور جو میری نافرمانی کرے گا تو تو غفور رحیم ہے۔“

یعنی نافرمان میری آل اور میری ذریت سے خارج ہے، باقی آپ اُس کی مغفرت فرما دیں تو آپ کی شان ہے!

اسی طرح متقی اور تابع تو آل محمدؐ میں داخل رہے گا، بد کردار اور معصیت شعار آل محمدؐ سے خارج ہو جائے گا۔ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

یہ مضمون لکھا جا چکا تھا کہ حضرت خواجہ گیسو درازؒ کے ملفوظ سے اس کی تائید

ملی، فرمایا:

”ان کے فرزندوں میں جو ان کی صفات اور سیرت سے متصف نہیں، وہ

حسینی، علوی اور فاطمی کہلانے کا مستحق نہیں۔“ (جوامع الکلم: ۱۹۴)

فالحمد لله علی ذلک

صلوٰۃ و سلام کے بارے میں ایک اور عجیب رو یہ ہے:

جو لوگ آل محمد ﷺ کو ”ازواج و ذریت“ میں محدود سمجھتے ہیں اور اس کے ساتھ

امت کے لیے بھی تبعاً صلوٰۃ و سلام کو جائز قرار دیتے ہیں، یہ لوگ صلوٰۃ و سلام میں

آل کے بعد مزید طبقات کا ذکر کریں تو بات سمجھ آتی ہے، لیکن جو لوگ ہر تقی اور پوری

امت کو آل میں داخل سمجھتے ہیں، وہ آل کے بعد اضافہ کیوں کرتے ہیں!

صلوٰۃ و سلام عبادت ہے، عبادت اضافوں سے پاک ہونی چاہیے،

جو وضاحتیں رسول اللہ ﷺ نے نہیں فرمائیں

جو اضافے رسول اللہ ﷺ نے نہیں فرمائے

ہم وہ وضاحتیں اور اضافے کیوں کریں؟

نوٹ: صلوٰۃ وسلام کے مذکورہ بالا مسئلے میں علماء کرام کے درمیان اختلاف رائے ہے۔ فقیر نے دلائل کی روشنی میں جس رائے کو راجح سمجھا، ذکر کر دیا، اس کے ساتھ فقیر دوسری آراء کا احترام کرتا ہے۔

”ولکل وجهة هو موليها فاستبقوا الخيرات“

جعلی سادات کا فتنہ

سطور بالا میں یہ بات آئی کہ دنیا پرست، معصیت کوش سادات صلوٰۃ و سلام کے اعزاز سے محروم اور آل سے خارج ہیں۔

جب میں اپنے ارد گرد دیکھتا تھا کہ سادات کی بڑی تعداد غفلت اور فسق و فجور کی زندگی بسر کر رہی ہے، تو دکھ کے ساتھ حیرت ہوتی تھی کہ اتنا عظیم نسب کیا اتنا ہی کمزور ہے! ایک دن اسی حیرت میں ڈوبا ہوا تھا کہ ایک غوث نے دستگیری فرمائی!

”تذکرہ غوثیہ“ حضرت سید غوث علی شاہ قلندر پانی پتی (۱۸۰۴ء۔۱۸۸۰ء) کے حالات و ملفوظات کا ایک حسین تذکرہ ہے۔ حضرت غوثؒ نے کافی عرصہ سیاحت میں گزارا، بغداد شریف میں چار ماہ قیام پذیر رہے۔ فرماتے ہیں قیام بغداد کے دوران میں: ”ایک روز ہم نے سنا کہ ہندوستان کے تین چار جولاہے سجادہ نشین صاحب کو ایک ایک ریال دے کر حسنی بن گئے اور نسب نامہ بھی حاصل کر لیا ہے۔“

حسب اتفاق ایک دن ہم اور ہمارے ہم نام اور میاں سید علی شاہ صاحب سجادہ نشین ایک دسترخوان پر کھانا کھا رہے تھے، اُس وقت میاں غوث علی شاہ کو، جو کہ سید حسینی تھے، ہم نے چھیڑا کہ میر صاحب آپ بھی ایک ریال حضرت کو نذر کر کے اولاد میں شامل ہو جائیے، پھر خوب بن آئے گی!

اس بات پر وہ بہت خفا ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم میں کچھ کسر ہے یا تم سے کچھ کم ہیں؟ اگر تمہارے ہاں ایک امام ہے تو ہمارے خاندان میں گیارہ امام ہیں، باقی رہا فقر کا معاملہ، وہ قبضہ قدرت میں ہے، ملے یا نہ ملے، اس کی تلاش میں تشنہ لب پھرنا ہمارا کام ہے:

کام ماگر تر نہ شد از آب مقصد عیب نیست

زانکہ اولادِ حسینؑ تشنگی میراثِ ماست

یہ بات سن کر سجادہ نشین صاحب نے فرمایا کہ تم کو کیوں رشک آیا؟

ہم نے کہا: صاحب! رشک تو نہیں، مگر شک ضرور پیدا ہو گیا کہ کہیں ہمارے بزرگ بھی دھینے جولا ہے ہی نہ ہوں، یہاں نام لکھوا کر سید بن گئے ہوں، ہم کو تو آج سے اپنی سادات میں کلام ہو گیا!

میاں صاحب نے فرمایا: یہاں شاہ عبدالرزاق صاحب اور عبدالوہاب صاحب کی اولاد کا کچھ ذکر نہیں، یہ دونوں صاحب زادے تو حضرت کی زندگی ہی میں تشریف لے گئے تھے، ہمارے اصلی اور نقلی دفتر میں ان بزرگوں کا نام ہی نہیں، پھر ان کی اولاد کا کیا ذکر! یہاں تو صرف غریب شاہ عبدالعزیز صاحب کی اولاد ہے اور اسی خاندان میں ہم سب کو شامل کر لیتے ہیں کیونکہ مرید بھی بمنزلہ اولاد کے ہوتا ہے اور اس قسم کے لوگوں کا دفتر جدا بنا ہوا ہے“ (تذکرہ غوثیہ: ۱۰۸، ۱۰۹)

حضرت غوثؒ نے یہ راز کھول کر میری حیرت دور کر دی کہ گھٹیا اور نازیبا حرکتیں کرنے والے سید دراصل دفتر دوم کے ریالی سید ہیں!

یہ قصہ تو انیسویں صدی کا ہے، جب تبدیل نسب ایسے واقعات کم کم ہوتے تھے۔ بیسویں صدی تو انقلابات کی صدی ہے، اس صدی میں پوری دنیا میں جغرافیہ کے ساتھ سیاست و ثقافت اور تہذیب و تمدن میں انقلاب برپا ہوئے۔

ہمارے خطے میں ۱۹۴۷ء کا انقلاب اپنے جلو میں کئی طوفان لایا۔ اس میں جہاں امیر غریب اور غریب امیر ہوئے، شرفاء گمنام اور لائیرے نامور ہوئے، وہاں اس انقلاب میں سماجی شناختیں اور خاندانی نسبتیں بھی زیرِ بر ہوئیں۔

سید حسام الدین راشدی ہمارے ملک کے مشہور ادیب اور صاحب علم گذرے ہیں۔ وہ اپنے ایک مضمون ”پنبہ کجا کجا نہم“ میں رقمطراز ہیں:

”بہر حال علی گڑھ کے قفل ساز، آگرے کے موچی، میرٹھ کے قصائی، دلی کے مٹھائی فروش تو اکثر و بیشتر امیر بن گئے اور کئی ایک نے سید بن کر سجادے بھی آراستہ کر لیے

اور بعض نے کسی نہ کسی بوسیدہ قبر پر بیٹھ کر ولایت اور کرامات سے روپیہ پیسہ بٹورنا شروع کر دیا.....

سید مطلبی فرید آبادی، خدا انہیں جیتا رکھے، مرحوم سید ہاشمی فرید آبادی کے چھوٹے بھائی ہیں، علم و فضل اور خاندانی ثروت اور وجاہت کی وجہ سے اس خاندان کو کون نہیں جانتا! ان کی روایت ہے کہ کراچی آتے آتے جب ملتان کے اسٹیشن پر ان کی گاڑی رکی تو سامنے مریدوں اور عقیدت مندوں کے بے پناہ جھرمٹ میں ایک صاحب انہیں نظر آئے، صاف سفید کپڑے، قیمتی شال کاندھے پر اور صوفیانہ عمامہ سر پر بندھا۔ انہیں شک گذرا، اتر کر جو دیکھا تو فرید آباد کا ایک میراثی نکلا، شہزادی نام تھا، لیکن فرید آباد کے لوگ اسے ابے او شہر ادھر تو آ! کہہ کر پکارا کرتے تھے، شادی بیاہ کے موقع پر ادھر ادھر پیغام پہنچانا اُس کے ذمے تھا.....

پیر صاحب کی جب ان پر نظر پڑی تو مریدوں کے جھگھٹ سے فوراً نکل آئے، ادب سے مل کر علیحدہ لے گئے اور التجا کی کہ خدا کے واسطے میری لاج رکھیو، سید صاحب تیرے نانا کے دامن میں پناہ لی ہے، سید بن کر مریدوں کا اچھا خاصا گروہ پیدا کر لیا ہے، اب میری روزی پر لات نہ مارو! باپ دادا کا واسطہ ہے“

(ماہ نامہ قومی زبان، ص: ۳۳، ۳۵۔ دسمبر ۱۹۸۲ء)

ایک اور مشہور ادیب یہ دلچسپ واقعہ نقل کرتے ہیں

قیام پاکستان کے بعد لاکھوں مہاجرین بھارت سے پاکستان آئے، انہیں ضلع وار بسایا جاتا تو اُن کے صدیوں پرانے سماجی اور ثقافتی رشتے نہ ٹوٹتے، لیکن وہ ملک کے مختلف حصوں میں آباد کر دیئے گئے، ان کا انفرادی اور خاندانی تشخص ختم ہو گیا، بہت سے مہاجرین نے جھوٹ بول کر بڑے بڑے کلیم منظور کرا لیے، بہت نسوں نے ذاتیں بدل لیں، نیا ملک، نیا دور اور نئی ذات!

سرگودھا میں انبالہ کے اکثر لوگ آباد ہوئے، ایک خاندان انبالہ کے کسی بزرگ کے مزار کے مجاوروں سے تھا، یہ لوگ اپنی ذات جوگی یا فقیر بتاتے تھے، ان کے نام نتھو شاہ، پھتو شاہ اور دھوتے شاہ وغیرہ تھے، مغربی پنجاب میں ”شاہ جی“ سید کو کہا جاتا ہے، چنانچہ یہ لوگ بھی اپنی ذات سید لکھوانے اور بتانے لگے، انہوں نے بڑے بڑے کلیم داخل کئے، لیکن ان سے غلطی یہ ہوئی کہ یہ اپنے بھتیجے ”جانی شاہ“ کو سید بننے پر آمادہ نہ کر سکے اور اس سے جائیداد کا تنازعہ بھی کھڑا کر لیا، چنانچہ انبالہ کی جائیداد کے بدلے میں کلیم کی منظوری اور تقسیم کا مقدمہ جب مقامی افسر بحالیات کی عدالت میں پیش ہوا تو کچھ اس طرح کا معاملہ تھا:

افسر بحالیات:..... ”تمہارا نام.....؟“

نتھو شاہ:..... ”نتھو شاہ حضور!“

افسر:..... ”ولدیت؟“

نتھو شاہ:..... ”خیرے شاہ“

افسر:..... ”ذات؟“

نتھو شاہ:..... ”سید جناب والا، بخاری سید“

افسر:..... ”اس کلیم میں کون کون وارث ہیں؟“

نتھو شاہ:..... میں اور میرے دو بھائی پھتو شاہ اور دھوتے شاہ اور میرے مرحوم

بھائی مہر شاہ کا بیٹا جانی شاہ..... لیکن حضور ہم جانی شاہ کو اس کا حصہ نہیں دینا چاہتے۔

افسر:..... کیوں؟ تم تو کہتے ہو کہ وہ تمہارا سگا بھتیجا ہے۔“

نتھو شاہ:..... حضور بھتیجا تو ہے لیکن ہے نا خلف..... ہم نے اسے عاق کر دیا ہے۔

افسر:..... ”کیا یہاں جانی شاہ موجود ہے؟“.....؟

جانی شاہ:..... ”میں موجود ہوں مائی باپ..... میرا ہی نام جانی شاہ ہے۔“

افسر:..... ”والد کا نام؟“

جانی شاہ: ”مہر شاہ حضور“

افسر: ذات؟

جانی شاہ:..... ”جوگی..... فقیر..... مائی باپ..... اللہ اور رسولؐ کا واسطہ

دے کر مانگ کر کھانے والے“

افسر:..... ”لیکن تمہارے دونوں چچا تو اپنی ذات سید بتاتے ہیں!“

جانی شاہ: حضور اس سے اندازہ لگالیں کہ میرے دونوں چچاؤں نے سادات

کو بھی نہیں بخشا، ان کی ذات پر قبضہ کر لیا سرکار! پھر مجھ غریب کی جائیداد پر قبضہ کیوں

نہیں کریں گے، مجھے میرا حق دلوا یا جائے حضور..... میں غریب آدمی ہوں.....“

اور افسر بحالیات نے جانی شاہ کو سچا آدمی قرار دیتے ہوئے اُسے اس کا حق

دے دیا۔ لیکن اس معاشرے میں جانی شاہ کی طرح کتنے سچے لوگ ہیں.....؟ اور اس

افسر بحالیات کی طرح کتنے نیک دل اور منصف افسر.....؟“ (دوستی کا سفر: ص ۴۲-۴۱)

ان واقعات سے گلوکاروں، فنکاروں، اداکاروں اور بھانڈوں کی

سیادت کی قلعی کھل جاتی ہے، اسی طرح جو لوگ سیادت و شرافت کا نقاب اوڑھ کر

علم و مشیخت کی آبروریزی کر رہے ہیں، یہ واقعات اُن کی اصلیت کا بھی

راز فاش کرتے ہیں۔

اصلی سید کی مزید پہچان مطلوب ہو تو ملا علی قاریؒ کی خدمت میں چلتے ہیں۔

اصلی سید کی پہچان

ملا علی قاریؒ سید کے اوصاف کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”سید وہ ہے جو مغلوب الغضب نہ ہو“

سید وہ ہے جو خیر اور نیکی میں فائق رہے۔“ (مرقاۃ: ۱۱/۳۷۹)

”سید وہ ہے جو مصائب و شدائد میں لوگوں کی پناہ گاہ ہو، جو ضرورت مندوں کے کام آئے،

تکلیفوں میں ان کا ہاتھ بٹائے اور پریشان حالوں کا درماں بنے۔“ (مرقاۃ: ۱۱/۴۵)

اور حضرت خواجہ گیسو درازؒ نے فرمایا:

”اہل بیتؑ میں دو چیزیں عام طور پر پائی جاتی ہیں اور ان سے کسی کو بھی خالی

نہ دیکھو گے۔ ایک تو خوف خدا اور دوسرے عبادت و طاعت الہی، اس میں کوتاہی ان

میں سے کسی میں دیکھی نہیں جاتی“ (جوامع الکلم: ۸۷)

حاصل یہ ہے کہ سید صرف نسب میں نہیں بلکہ حسب اور علم و عمل میں بھی سید ہوتا ہے،

جس طرح شیر اور شاہین اپنے خصائص سے پہچانے جاتے ہیں، اسی طرح سادات

بھی اپنے نسلی اوصاف سے پہچانے جاتے ہیں۔

یہ تو وصفی پہچان ہے۔ محدث احمد بن حجر مکیؒ (۸۹۹-۹۷۴ھ) نے ایک عملی

پہچان بھی لکھی ہے، جو بہت کڑی ہے، فرماتے ہیں:

(ترجمہ) ”عباسی حکمران متوکل کے سامنے ایک عورت نے دعویٰ کیا کہ وہ سیدہ ہے۔

اس نے پوچھا: اس کی تحقیق کس سے کی جائے؟ تو امام علیؑ عسکریؒ کا نام لیا گیا۔ چنانچہ

انہیں بلوایا گیا، جب وہ تشریف لائے تو انہیں اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا اور زیر بحث

دعویٰ کے بارے میں دریافت کیا، آپؑ نے فرمایا:

”اللہ تعالیٰ نے حسینؑ کی اولاد کا گوشت شیروں پر حرام کیا ہے، اس عورت کو

شیروں کے سامنے ڈالا جائے۔“

عورت کے سامنے یہ بات رکھی گئی تو اس نے اپنے جھوٹ کا اعتراف کر لیا۔

اس کے بعد کسی نے متوکل سے کہا: آپ اس بات کا خود ان پر تجربہ کیوں نہیں کرتے؟

”یہ عملی پہچان ہے“

چنانچہ متوکل نے تین شیر منگوائے اور اپنے قصر کے صحن میں چھوڑ دیے، پھر امام علی عسکریؑ کو بلا بھیجا، جب وہ صحن میں داخل ہوئے تو دروازہ بند کر دیا گیا، اس وقت حال یہ تھا کہ شیروں کی دھاڑ سے کان بہرے ہو رہے تھے، جب امام صحن سے گذر کر زینے کی جانب بڑھے تو شیر پر سکون ہو کر آپ کی طرف آئے اور آپ کے گرد گھومنے لگے اور اپنا جسم آپ کے ساتھ رگڑنے لگے، امام بھی آستین کے ساتھ اپنا ہاتھ ان پر پھیر رہے تھے، پھر وہ بیٹھ گئے تو آپ زینے پر چڑھ گئے اور متوکل کے ساتھ کچھ دیر گفتگو فرماتے رہے، جب آپ واپس جانے کے لیے نیچے اترے تو شیروں نے آپ سے پھر وہی فرماں برداری اور محبت کا برتاؤ کیا، یہاں تک کہ آپ باہر نکل گئے۔ اس سے متاثر ہو کر متوکل نے بڑا ہدیہ آپ کی خدمت میں بھجوایا۔

متوکل سے کہا گیا: تم بھی یونہی کرو جیسا تمہارے ابن عم (امام علی عسکری) نے کیا۔ لیکن اُسے جرأت نہ ہوئی اور کہا: کیا تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو! (الصواعق المحرقة: ۲۰۵)

اور یہ واقعہ ایک ہی مرتبہ پیش نہیں آیا، بلکہ اس سے پہلے بھی یہ امتحان ہو چکا، ابن حجر مکی نقل فرماتے ہیں:

”یحییٰ بن عبد اللہ المحض بن الحسن المثنیٰ بن الحسن السبط جب بھاگ کر دیلم گئے اور وہاں سے گرفتار ہو کر رشید کے پاس لائے گئے تو اس نے آپ کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ آپ کو ایک گہرے حوض میں پھینک دیا گیا، جس میں بھوکے شیر تھے، لیکن وہ آپ کو کھانے سے باز رہے، وہ آپ پر حملہ آور ہونے سے ڈرتے تھے اور آپ کے پہلو میں پناہ چاہتے تھے۔“ (الصواعق المحرقة: ۲۰۷)

جو قادر و مقتدر ہستی ابراہیمؑ کو بھڑکتی آگ میں زندہ رکھ سکتی ہے، اسماعیلؑ کا حلقوم تیز چھری سے بچا سکتی ہے، وہ ہستی اگر ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی سچی اولاد کو شیروں کے منہ بچائے تو اس پر تعجب کیسا؟

جو لوگ اس دور میں سیادت و شرافت کے لیے تہمت بنے ہوئے ہیں انہیں امتحان کے اس مرحلے سے گذارنا چاہیے!

قرآن مجید کی روشنی میں

مودتِ اہل بیتؑ ہر مؤمن پر واجب ہے

سورہ شوریٰ میں نہایت دلکش اور واشگاف الفاظ میں مشرکین کو سمجھایا گیا کہ ایمان اور عمل صالح کی زندگی بسر کرو، دین حق اور قرآن مجید جیسے صحیفہ ہدایت کی قدر کرو، مان لو گے تو ابدی نجات پا کر جنت میں داخل ہو جاؤ گے، نہ مانو گے تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم کا ایندھن قرار پاؤ گے۔ یہ مضمون بیان فرمانے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

”قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ“

(الشوریٰ: ۲۳)

(ترجمہ) ”(اے نبیؐ) کہہ دیجئے کہ میں اس (کام) پر تم سے کسی

اجر کا سوال نہیں کرتا مگر ”قربی“ میں مودت ضرور چاہتا ہوں۔“

مقصود یہ ہے کہ میں جو تمہاری نجات کے لیے جان کھپا رہا ہوں اور تکلیفیں اٹھا رہا ہوں یہ صرف خیر خواہی کے جذبے سے ہے، میں اس خدمت اور تبلیغ پر تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتا، ہاں ”مودت فی القربی“ ضرور چاہتا ہوں۔

یہ قربی کیا ہے؟

اس کی تفسیر میں مفسرین کی تین آراء ہیں:

- (۱) قربی کا معنی ہے ”قربت“ (رشتہ داری، جس کی بنیاد خونی اور رجمی تعلق ہو) اس معنی کے مطابق آیت کا مطلب یہ ہے کہ ”میں تم سے اس کام پر کوئی اجر نہیں چاہتا، مگر یہ ضرور چاہتا ہوں کہ میرے اور تمہارے درمیان جو قربت ہے، اس کی وجہ سے کم از کم مجھ سے مودت رکھو، حق قربت کا تو لحاظ کرو، اگر نصرت نہیں کرتے، نہ کرو، کم از کم اذیت تو نہ پہنچاؤ، صلہ رجمی ترک نہ کرو۔“

(۲) قریبی، قرابت کے معنی میں ہے اور مراد ہے، اہل قرابت، اقارب۔
آیت کا مطلب یہ ہوا کہ ”میں اس کام پر تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا، بس اتنا چاہتا ہوں کہ میرے اقارب سے محبت و مودت کا سلوک رکھو۔“

(۳) ”قریبی“ زلفی اور بشری کی طرح مصدر ہے اور قرب اور تقرب کے معنی میں ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ”میں تم سے اس کام پر کوئی اجر اس کے سوا نہیں چاہتا کہ تمہارے اندر اللہ کے قرب کی چاہت پیدا ہو جائے“ یعنی تم راہ راست پر آ جاؤ، اعمال صالحہ کرنے لگو، بس یہی میرا اجر ہے۔

ان میں پہلی تفسیر حضرت ابن عباسؓ اور دوسرے اکابر مفسرین سے منقول ہے اور اسے رائج قرار دیا گیا ہے۔

زیر نظر آیت کریمہ میں ایک اہم بحث استثنا کی ہے کہ یہاں استثنا منقطع ہے یا متصل؟ اور غور کیا جائے تو یہ بحث بھی دراصل قربی کے مفہوم میں اختلاف کا نتیجہ ہے!
سورہ شعراء میں سیدنا نوحؑ، سیدنا ہودؑ، سیدنا صالحؑ، سیدنا لوطؑ اور سیدنا شعیبؑ کا یہ مقولہ نقل کیا گیا ہے کہ ”میں تم سے اس تبلیغ و تزکیہ پر کوئی اجر نہیں چاہتا، میرا اجر تو بس رب العالمین کے ذمے ہے“

اور سورہ ص میں یہی بات خود سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی زبانی بیان کی گئی ہے۔
ان آیات اور مزاج رسالت کو سامنے رکھتے ہوئے اکثر مفسرین نے کہا کہ سورہ شوریٰ کی زیر نظر آیت میں استثنا منقطع ہے، کہ مستثنیٰ مستثنیٰ منہ کی جنس سے نہیں ہے، لہذا مودت فی القربیٰ اجر ہے ہی نہیں کہ آیات میں ٹکراؤ ہو۔
لیکن اگر استثنیٰ کو متصل بھی مانا جائے تو کوئی حرج نہیں۔

استثنیٰ متصل کی صورت میں اجر معنوی اور اخلاقی ہوگا، اور اجر اخلاقی حقیقی اجر نہیں، بلکہ صوری اجر ہے۔ جن آیات میں طلب اجر کی نفی کی گئی ہے، وہاں اجر ظاہری اور اجر مادی مراد ہے، اور ظاہر ہے کہ دین کے ذریعے دنیوی اور مادی اجر کی طلب مذموم

ہے۔ جبکہ اجرا اخلاقی کی طلب مذموم نہیں، بلکہ مخاطب کی جذبہ فکر کو تحریک بخشتی ہے، لہذا صوری مشابہت کی وجہ سے استثنائاً کو متصل قرار دینا بھی صحیح ہوگا۔

غالباً صاحب مدارک اسی لیے فرماتے ہیں کہ: ”يجوز ان يكون استثناءً متصلًا“ علامہ آلوسیؒ نے بھی استثنائاً متصل کا احتمال ذکر کیا ہے اور بلا تردید ذکر کیا ہے! (قربانی کے مفہوم اور استثنائاً کی بحث کے لیے روح المعانی دیکھیے)

اس تمام قیل و قال سے ہٹ کر مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے قرابت کی بنیاد پر مخاطبین سے مودت و محبت کا سوال کیا..... جیسا کہ رائج تفسیر ہے..... تو اگر مشرکین سے آپؐ کی قرابت آپؐ کی مودت و محبت کی متقاضی ہے تو آپؐ سے قرابت، قرابت داروں کی مودت کی متقاضی کیوں نہ ہوگی؟ اور قرابت دار بھی وہ جنہوں نے ایمان کی گود میں آنکھ کھولی اور رسالت کے گہوارے میں پرورش پائی!

حاصل یہ کہ علت قرابت کے اشتراک کی وجہ سے آل محمد ﷺ کی مودت و محبت واجب ہے، جیسے قرابت کی وجہ سے مشرکین کے لیے رسول اللہ ﷺ کا لحاظ اور مودت واجب تھی، اسی طرح حضور اکرم ﷺ سے قرابت کی وجہ سے آل محمد ﷺ کی مودت اور ان کے حقوق کا خیال رکھنا لازم ہے۔ چنانچہ علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں: ”پوری امت مودت اہل بیتؑ کی مکلف ہے“۔ (روح المعانی: ۳۱/۲۵)

قرآن مجید میں اس آیت کے نزول کے وقت اگرچہ اقارب اس سے مراد نہیں تھے، لیکن اشتراک علت کی وجہ سے اپنے اپنے دور میں تمام اہل بیتؑ اس آیت کے مصداق میں داخل ہوتے چلے گئے، چنانچہ جس نے بھی اس آیت کی تفسیر اقارب اور اہل بیت سے کی ہے، انہوں نے غالباً اسی اشتراک علت کو مد نظر رکھا ہے..... اور جبکہ یہ تفسیر ائمہ اہل بیتؑ سے منقول ہے، تو اسے کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے!

ذاذن روایت کرتے ہیں کہ سیدنا علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ نے فرمایا: ”آل حم میں ایک

آیت ہمارے بارے میں ہے، ہماری مودت کا خیال صرف مومن ہی رکھتا ہے۔“

(روح المعانی: ۳۱/۲۵)

ابن جریر ابی الدیلم سے نقل کرتے ہیں کہ: جب علیؑ بن حسینؑ (زین العابدین) کو گرفتار کر کے لایا گیا اور (بغرض رسوائی) دمشق کے (بازار میں) سٹیج پر کھڑا کیا گیا تو ایک شامی باشندہ کھڑا ہوا اور بولا: اُس اللہ کا شکر ہے جس نے تمہیں قتل کیا اور تمہاری بیخ کنی کر دی۔

اس پر زین العابدین علیؑ نے فرمایا: کیا تم نے قرآن پڑھا ہے؟

بولا: ہاں

پوچھا: آلِ حم پڑھی ہے؟

بولا: ہاں

فرمایا: کیا تم نے ”قل لا اسئلكم عليه اجراً الا المودة فی القربی“ نہیں پڑھا؟

بولا: تو کیا وہ لوگ تم ہو؟

فرمایا: ہاں“

(روح المعانی: ۳۱/۲۵)

علامہ آلوسیؒ بڑی محبت و مدحت سے اپنے ایک معاصر عزیز سید عمر اہیتیؒ کے یہ اشعار نقل کرتے ہیں:

بأية آية يأتي يزيد غداة صحائف الاعمال تتلى

وقام رسول رب العرش يتلو وقد صمت جميع الخلق قل لا

ترجمہ: ”جس روز اعمال نامے پڑھے جائیں گے، تمام مخلوق ساکت و صامت

ہوگی اور رب العرش کے رسول ﷺ کھڑے ہوں گے اور آیت ”قل لا

اسئلكم.....“ تلاوت کریں گے تو یزید کون سی آیت پیش کرے گا!“

(روح المعانی: ۳۱/۲۵)

علاوہ ازیں اصول یہ ہے کہ ”العبرة لعموم الالفاظ لا لخصوص المورد“۔ اب قرآن اور دین کی قدر اور ایمان و عمل صالح پر جو بشارت مشرکین کو دی گئی، کیا یہ مضامین اہل ایمان کے لیے نہیں ہیں؟ کیا ان مضامین سے اہل ایمان کی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی؟ پھر اہل ایمان کی اصلاح و تربیت کے لیے آپؐ نے جو مشقتیں برداشت کیں اور امت کی نجات کے لیے آپؐ جس طرح راتوں کو جاگ جاگ کر روتے رہے، اس کے بعد اگر اہل ایمان سے یہ کہا جائے کہ:

”لا اسئلکم علیہ اجرأ الا المودة فی القربی“ تو اس میں کیا قباحت ہے؟ جبکہ ان کی مودت صرف اقارب ہونے ہی کی حیثیت سے نہیں بلکہ نمونہ ہدایت ہونے کی حیثیت سے بھی ہے۔

یہ فرمائش دراصل اس نفسیاتی حقیقت پر مبنی ہے کہ اہل بیت کو ایذا ذاتی ایذا سے زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے۔ اگر یہ فرمایا جاتا کہ: ”میری نصیحت کا کوئی اجر نہیں الا یہ کہ مجھ سے مودت رکھو اور مجھے اذیت نہ دو“ اور یہ برانہ ہوتا، بالکل اسی طرح یہ فرمانا کہ ”میری تبلیغ کا کوئی اجر نہیں الا یہ کہ میرے اقارب سے مودت رکھو اور انہیں اذیت مت پہنچاؤ“ کیسے برا ہو سکتا ہے؟ اس لیے کہ ان اقارب کو ایذا خود رسول اللہ ﷺ کو ایذا ہے۔ درج ذیل روایت یہ مضمون مزید واضح کر رہی ہے:

”عبدالمطلب بن ربیعہ بیان کرتے ہیں کہ عباسؓ غصے کی حالت میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے، میں وہاں موجود تھا، آپؐ نے پوچھا: ”آپؐ غضبناک کیوں ہیں؟“

عباسؓ نے جواب دیا: ”یا رسول اللہ! ہمارا (بنو ہاشم) اور (باقی) قریش کا کیا معاملہ ہے؟ جب وہ آپس میں ملتے ہیں تو ہنستے مسکراتے ملتے ہیں، اور جب ہم سے ملتے ہیں تو مجھے مجھے ہوتے ہیں۔“

یہ سن کر رسول اللہ ﷺ کو اتنا غصہ آیا کہ چہرہ سرخ ہو گیا پھر فرمایا: ”قسم ہے اُس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کسی شخص کے دل میں ایمان داخل نہیں ہوتا یہاں تک کہ وہ اللہ کی وجہ سے اور اس کے رسول کی وجہ سے تم سے محبت رکھے۔“

پھر فرمایا: ”لوگو! جس نے میرے چچا کو اذیت پہنچائی، اس نے مجھے اذیت پہنچائی، اس لیے کہ چچا باپ کی مثل ہی تو ہوتا ہے!“ (مشکوٰۃ مع مرقاۃ: ۱۱/۳۸۷ عن الترمذی)

اور امام احمدؒ کی روایت میں الفاظ یوں ہیں:

”..... واللہ! کسی شخص کے دل میں ایمان داخل نہیں ہوتا یہاں تک کہ وہ اللہ

کی وجہ سے اور میری قربت کی وجہ سے تم سے محبت رکھے۔“ (مرقاۃ: ۱۱/۳۸۸)

آیت مودت فی القربیٰ کی اس سے بڑھ کر تفسیر اور کیا ہوگی!

علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں: ”حق یہ ہے کہ آپؐ کے اقارب سے، اقارب ہونے کی

حیثیت سے، محبت واجب ہے، خواہ وہ کیسے ہی ہوں!

کسی نے کیا خوب کہا ہے:

داریت اہلک فی ہواک وہم عدا

ولأجل عين الف عين تکرّم

”میں نے تیری محبت میں تیرے خاندان سے مدارات برتی، حالانکہ وہ میرے

دشمن تھے، کیونکہ ایک شخص کی وجہ سے ہزاروں کا اکرام کرنا پڑتا ہے۔“

(روح المعانی: ۲۵/۳۲)

صرف نزول قرآن کا دور نہیں بلکہ یزیدی دور ذہن میں رکھ کر یہ آیت پڑھیے، تب یہ

حقیقت کھلتی ہے کہ مودت کی فرمائش کیوں کی جا رہی تھی!

امت کے لیے تڑپنے والے رسول ﷺ کی ذریت پر کربلا میں جو بیتا، اس پر رسول

اللہ ﷺ کتنے تڑپے ہوں گے؟ آپؐ کے قلب اقدس کو کتنی ٹھیس پہنچی ہوگی؟

کوئی اس کا اندازہ کر سکتا ہے!

کیا اس ظلم کی تلافی ہو سکتی ہے!

اہل بیتؑ کا مظلوم قافلہ جب دمشق سے مدینہ پہنچا تو سیدنا عقیلؑ بن ابی طالب کی دختر محترمہؑ نے اسی آیت کے پس منظر میں بالکل بجا کہا:

ماذا تقولون ان قال النبی لکم

ماذا فعلتم وانتم آخر الامم!

بعترتی و باہلی بعد مفتدی

منہم اساری و قتلیٰ ضر جوا بدم!

ماکان هذا جزائیٰ ما ذ نصحت لکم

ان تخلفونی بسوء فی ذوی رحمی!

(طبری: ۴۶۶/۵)

ترجمہ: ”اگر نبی اکرم ﷺ نے تم سے پوچھ لیا کہ تم نے آخری امت ہو کر میری جدائی کے بعد میری عترت اور میرے اہل بیت سے کیا سلوک کیا کہ آج ان میں کچھ قیدی ہیں اور کچھ خون میں لت پت مقتول ہیں، تو تم کیا جواب دو گے؟ میں جو زندگی بھر تمہیں وعظ و نصیحت کرتا رہا تو اس کی جزا یہ نہ تھی کہ تم میرے بعد میرے قرابتداروں سے ایسی بد سلوکی کرو!“

یہ ہدایتوں کی جزا ملی، یہ عنایتوں کا صلہ ملا!

جو سرور میرے دل کا تھا، اُسے خاک میں ملا دیا

کسی نے بالکل سچ کہا ہے:

اترجو أمة قتلت حسیناً

شفاعة جده يوم الحساب

(الصواعق المحرقة: ۱۹۴)

ترجمہ: ”جن لوگوں نے حسینؑ کو قتل کیا، کیا وہ روز حساب اُن کے جدا مجد ﷺ کی شفاعت کی امید رکھتے ہیں!“

امام شافعیؒ اسی آیت کے حوالے سے فرماتے ہیں:

”یا اهل بیت رسول الله حکم
فرض من الله في القرآن أنزله
کفاکم من عظیم القدر انکم
من لم یصل علیکم لاصلاة له

(الصواعق: ۱۲۸)

ترجمہ: ”اے رسول اللہ ﷺ کے اہل بیت! آپ کی محبت اللہ کی طرف سے ہم پر فرض ہے اور اللہ نے یہ حکم قرآن میں نازل فرمایا ہے، آپ کی عظمت شان کے لیے یہی کافی ہے کہ جس نے آپ پر درود نہیں پڑھا اس کی نماز نہیں ہوئی۔“
اور شیخ جلیل شمس الدین ابن عربیؒ فرماتے ہیں:

”رأيت ولاني آل طه فريضة
على رغم اهل البعد يورثني القربا
فما طلب المبعوث اجرا على الهدى
بتبليغه الا المودة في القربى“

(الصواعق: ۱۷۰)

ترجمہ: ”میں آل طہ ﷺ سے اپنی ولا اور مودت کو فریضہ سمجھتا ہوں، اہل بعد کی ناگواری کے باوجود مجھے اس ذریعے سے قرب حاصل ہو رہا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ہدایت کی تبلیغ پر مودت فی القربی کے سوا کچھ اجر نہیں چاہا (لہذا مودت فریضہ ہے)۔“
آخر میں مناسب ہے کہ زیر نظر آیت کا آخری حصہ بھی مطالعہ کر لیا جائے۔
مودت فی القربی کے حکم کے بعد ارشاد ہے:

”وَمَنْ يَّقْتِرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهُ فِيهَا حُسْنًا إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ
شَكُورٌ“
(الشوری: ۲۳)

ترجمہ: ”اور جو کوئی نیکی کمائے گا ہم اس کے لیے اس نیکی میں خوبی کا اضافہ کر دیں گے، بے شک اللہ بڑا معاف کرنے والا، قدردان ہے۔“

یعنی انسان بھلائی اور نیکی کا راستہ اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی اس نیک سعی میں خوبی عطا فرماتا ہے، دنیا میں خوبی یہ کہ سعی سے بڑھ کر نیک مزاج بنا دیتا ہے اور آخرت میں یہ کہ عمل سے زیادہ اجر عطا فرماتا ہے اور اس کوشش میں جو کمی کوتاہی رہ جاتی ہے، اسے معاف فرماتا رہتا ہے۔

اس آیت میں ”حسنہ“ سے کیا مراد ہے؟
اکثر مفسرین کہتے ہیں کہ ہر نیکی اور بھلائی اس سے مراد ہے۔

اور ابن عباسؓ اور سدیؒ سے مروی ہے کہ ”حسنہ“ سے مراد مودت اہل بیتؑ ہے۔ اب مفہوم یہ ہوا کہ جو شخص مودت اہل بیتؑ میں زندگی بسر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی زندگی میں خوبی کا اضافہ فرماتے ہیں اور اسے زیادہ سے زیادہ نیکیوں اور بھلائیوں کی توفیق عطا فرماتے ہیں۔

اصول ہے کہ انسان جس سے محبت کرتا ہے اس کے اوصاف اپنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اہل بیتؑ یقیناً منعم علیہم تھے، اب جو ان کی مودت سے سرشار ہوگا تو انہی کے راستے پر چلے گا (صراط الذین انعمت علیہم) اور نیکی میں بڑھتا چلا جائے گا اور آخرت میں انہی مبارک ہستیوں کی رفاقت اور معیت نصیب ہوگی (و حسن اولئک رفیقاً..... المرء مع من احب) یہ ہے نیکی میں خوبی کا اضافہ!

اور علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں کہ اگر ”حسنہ“ سے مراد ہر نیکی اور بھلائی ہو، تب بھی مودت اہل بیتؑ سب سے پہلے اس آیت کا مصداق قرار پائے گی، کیونکہ

یہ عظیم ترین نیکی ہے!

علامہ آلوسیؒ یہ بھی نقل فرماتے ہیں کہ یہ آیت سیدنا ابوبکرؓ کے بارے میں نازل ہوئی، کیونکہ انہیں اہل بیتؑ سے بہت گہری اور شدید محبت تھی! (روح المعانی: ۲۵/۳۳)

اہل بیتؑ کا یہ مقام اور مرتبہ کیوں نہ ہو؟

”إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ شَكُورٌ“

”یقیناً اللہ آل محمدؑ کی خطاؤں سے بہت درگزر کرنے والا اور ان کی نیکیوں کا بڑا قدر دان ہے۔“

(روح المعانی: ۲۵/۳۳)

یہ مضمون مکمل ہو چکا تھا کہ محی الدین اورنگ زیب عالمگیرؒ کی بارہ وصیتیں نظر نواز ہوئیں، ان میں نویں وصیت احترام سادات کے بارے میں ہے، فرماتے ہیں:

”بارہ کے سادات لازم السعادات کے ساتھ آئیہ کریمہ ”وآت ذا القربى حقہ“ (”اور قرابت دار کو اس کا حق دو“ بنی اسرائیل: ۲۶) کے مطابق عمل کرنا چاہیے اور ان کے احترام و رعایت میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ آئیہ کریمہ ”قل لا اسئلكم علیہ اجرأ الا المودة فی القربى“ (الشوریٰ: ۲۳) کے بموجب اس جماعت کی محبت اجر نبوت ہے، اس میں ہرگز کوتاہ نہیں ہونا چاہیے کہ دنیا و آخرت میں خیر و فلاح کی ثمر آدر ہے۔“

(احکام عالم گیری: ۱۳۵)

اورنگ زیب عالمگیرؒ جیسے عالم، فقیہ اور پابند شریعت بادشاہ کا اپنی وصیت میں مودت سادات کو اجر نبوت لکھنا اور علما و فقہا کا اسے قبول کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اہل حق اس موقف اور تعبیر کو قرآن و سنت کے خلاف نہیں سمجھتے تھے اور اس معاملے میں شدت اور تنگ نظری بعد کے ادوار میں پیدا ہوئی۔

مودت اہل بیتؑ کے بارے میں صحابہؓ، تابعینؓ، ائمہؓ اور اولیاءؓ کا طرز عمل

قرآن و سنت کی ہدایات کی روشنی میں صحابہ کرامؓ اور اولیاءؓ امت نے ہر دور میں مودت اہل بیتؑ کو حرز جان بنائے رکھا۔ یہ تمام اکابرؓ اپنے قول و عمل سے مودت کا اقرار و اظہار کرتے رہے، دامن اہل بیتؓ سے وابستگی کو سرمایہ ایمان سمجھتے رہے اور دربار اہل بیتؓ میں عقیدت و ارادت کے پھول نکھاد کرتے رہے اور حق تو ہے کہ جسے جو ملا اسی در سے ملا، اسی گھر سے ملا، تو ان کی مودت سے مومن کا دل آباد ہوتا اور ان کی محبت سے فکر و نظر کا شاد ہونا ایمانی بلکہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔

آئیے! سلف صالحینؓ کے چند واقعات پڑھتے ہیں اور ایمان تازہ کرتے ہیں!

سیدنا ابوبکرؓ کے نزدیک اہل بیتؓ کا اکرام رسول ﷺ

کے اکرام میں داخل ہے

امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں ایک باب قائم کیا ہے: مناقب قرابة رسول اللہ ﷺ
”اور اس باب کے تحت سیدنا ابوبکرؓ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:

ترجمہ: ”اہل بیت نبویؑ کے بارے میں محمد ﷺ کا خیال رکھو“

تاکید مزید یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کا یہ ارشاد سیدنا ابن عمرؓ نے نقل کیا ہے!

(بخاری: ۵۲۶/۱)

اور اسی باب میں حضرت عائشہؓ سے ایک طویل روایت میں مروی ہے حضرت علیؑ نے جب ایک سلسلہ گفتگو میں رسول اللہ ﷺ کی قرابت کا ذکر کیا تو ابوبکرؓ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور انہوں نے فرمایا:

”قسم ہے اس کی جس کے قبضے میں میری جان ہے رسول اللہ ﷺ کے قرابت دار مجھے اپنے قرابت داروں سے زیادہ پیارے ہیں اور تم (اہل بیتؑ) سے صلہ رحمی مجھے اپنے رشتہ داروں کی صلہ رحمی سے زیادہ محبوب ہے۔“ (بخاری: ۱/۵۲۶، ۲/۶۰۹)

جی ہاں! سچی محبت کے ثمرات یہی ہوتے ہیں!

ابوبکرؓ علیؓ اور عباسؓ کے لیے اپنی جگہ چھوڑ دیتے ہیں

”انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے کہ علیؓ آئے، سلام کیا پھر کھڑے کھڑے ادھر ادھر نظر دوڑائی کہ کہاں بیٹھوں، رسول اللہ ﷺ نے صحابہؓ کی طرف دیکھا کہ کون ان کے لیے مجلس میں گنجائش پیدا کرتا ہے! ابوبکرؓ آپؐ کی دائیں جانب تھے، آپؐ کے لیے اپنی جگہ سے سرک گئے اور کہا: ابوالحسن! یہاں بیٹھیے!

چنانچہ علیؓ رسول اللہ ﷺ اور ابوبکرؓ کے درمیان بیٹھ گئے۔ یہ دیکھ کر چہرہ اقدس پر مسرت کے آثار نمودار ہوئے اور فرمایا:

”ابوبکر! اہل فضیلت کا مقام بس اہل فضیلت ہی پہچانتے ہیں۔“

(الصواعق: ۱۷۷)

دارقطنی کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب مجلس آراہوتے تو ابوبکرؓ آپؐ کی دائیں جانب ہوتے، عمرؓ بائیں جانب اور عثمانؓ آپؐ کے سامنے بیٹھتے..... اس دوران میں عباسؓ بن عبدالمطلب آجاتے تو ابوبکرؓ اپنی جگہ سے ہٹ جاتے اور عباسؓ وہاں تشریف فرما ہوتے۔ (الصواعق: ۱۷۷)

ابوبکرؓ علیؓ کے چہرہ انور کی طرف کثرت سے دیکھا کرتے تھے

ابن عبد البر کی روایت ہے کہ ابوبکرؓ سیدنا علیؓ کے روئے مکرم کو کثرت سے دیکھا کرنے تھے، سیدہ عائشہؓ نے اس بارے میں پوچھا تو فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ

فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: ”علی کے چہرے کی طرف دیکھنا عبادت ہے۔“

(الصواعق: ۱۷۷)

نگاہ کو عبادت بنانے کا شرف سیدنا علیؑ کے روئے مکرم کو حاصل ہوا ہے یا کعبہ مکرمہ کو، کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ کعبہ کو دیکھتے رہنا بھی عبادت ہے۔ عجب نہیں کہ سیدنا علیؑ کو یہ اعزاز امام المتقین ہونے کے ساتھ مولود کعبہ ہونے کی وجہ سے حاصل ہوا ہو!

اسد اللہ خان غالبؒ نے شاید اسی پس منظر میں کہا ہے:

غالبؒ ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست

مشغول حق ہوں بندگی بو ترابؒ میں

(خیال رہے کہ یہاں بندگی کا لفظ مودت و عقیدت کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے)

ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ سواری سے اتر جاتے تھے

ابن عبد البر اور ابن شہاب کی روایت ہے کہ ابو بکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ کا اپنے اپنے دور خلافت میں یہ معمول تھا کہ اگر سواری پر سوار جا رہے ہیں اور عباسؓ پیدل آ رہے ہیں تو ازراہ احترام فوراً سواری سے اتر جاتے اور سواری کی لگام تھام کر پیدل ان کے ساتھ چلتے تھے۔

(الصواعق: ۱۷۸)

ابو بکرؓ و عمرؓ منبر سے اتر آئے

دارقطنی کی روایت ہے کہ ابو بکرؓ ایک مرتبہ منبر پر تشریف فرما تھے کہ حسنؓ آگے اور کہا:

میرے ابا کے منبر سے اتر جاؤ!

ابو بکرؓ نے فرمایا: آپ نے ٹھیک کہا، واللہ یہ آپ ہی کے ابا کا منبر ہے۔ پھر (نیچے

اترے) انہیں اٹھایا اور اپنی گود میں بٹھالیا اور رو پڑے۔

اسی طرح ایک مرتبہ آپؐ نے عمرؓ کو بھی کہہ دیا تھا، انہوں نے بھی اٹھا کر اپنے پہلو میں بٹھالیا اور فرمایا:

یہ آپؐ ہی کے ابا کا منبر ہے، واللہ، میرے ابا کا تو منبر تھا ہی نہیں..... اور یہ بھی فرمایا: ہمیں جو عزت و رفعت ملی ہے، یہ آپؐ کے ابا (ﷺ) کے وسیلے ہی سے تو ملی ہے!“
(الصواعق: ۱۷۷)

(یاد رہے کہ یہ بچپن کا قصہ ہے، بچہ کسی کو اپنے ابا کی جگہ دیکھتا ہے تو برداشت نہیں کرتا، لیکن شیخین کا اعتراف و احترام قابل اتباع ہے۔

ابن حجرؒ نے الاصابہ میں یہ واقعہ امام حسینؑ اور حضرت عمرؓ کے مابین لکھا ہے۔ واللہ اعلم) ابن کثیرؒ روایت کرتے ہیں کہ ”ابوبکرؓ حسینؑ کی تکریم و تعظیم کرتے تھے، اسی طرح عمرؓ اور عثمانؓ کا رویہ بھی آپؐ کے ساتھ تکریم و تعظیم کا تھا۔“
(البدایہ والنہایہ: ۱۶۱/۸)

روایت قابل غور ہے، یہ نہیں کہا جا رہا کہ آپؐ پر شفقت کرتے تھے، کہا یہ جا رہا ہے کہ آپؐ کی تکریم و تعظیم کرتے تھے!

دور ملوکیت میں اہل بیتؑ سے ناروا سلوک

یہ رویہ تو خلفائے راشدینؑ کا تھا، خلافت کے بعد جو دور ملوکیت آیا تو اس میں امراء جوہر نے اسی مسجد نبویؐ میں خاندان نبوت سے کیا سلوک برتا؟ ایک نظر اس پر بھی!

”فی منزل الوحی“ مصر کے مشہور ادیب محمد حسین ہیکل کا سفر نامہ حریم شریفین ہے، اس میں انہوں نے یہ دردناک سانحہ لکھا ہے کہ:

”سیدہ فاطمہ زہراؑ کے حجرہ مبارکہ میں سیدنا حسنؑ لہثی بن سیدنا حسنؑ السبط اپنی زوجہ محترمہ سیدہ فاطمہ بنت سیدنا حسینؑ کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ ولید بن عبد الملک اپنے دور حکومت میں مدینہ طیبہ حاضر ہوا تو دیکھا کہ اہل مدینہ اور زائرین خانوادہ

نبوت کا دل کی گہرائیوں سے احترام کرتے ہیں..... (ابھی حجرات مبارکہ اپنی اصل ہیئت میں موجود تھے، وہی حجرات جن کا اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحجرات میں ذکر فرمایا ہے!) اُس نے والی مدینہ کو حکم دیا کہ یہ تمام حجرات خرید کر مسجد میں داخل کر دو۔ اس مقدس جوڑے اور ان کی مبارک اولاد کو ولید کے اس حکم کا پتہ چلا تو انہوں نے گھر خالی کرنے سے انکار کر دیا۔

ولید کی طرف سے پیغام ملا کہ اگر نہیں نکلو گے تو حجرہ تم پر گرا دیا جائے گا۔ انہوں نے انکار پر اصرار کیا تو انہدام کا آرڈر جاری ہو گیا اور مزدوروں نے بالفعل گھر کی بنیاد اکھیڑنا شروع کر دی، اس پر مجبوراً یہ قدسی خاندان اپنے آبائی گھر سے بے گھر ہوا۔ ہیکل اسی سلسلے میں نصر خراسانی کا بیان نقل کرتے ہیں کہ:

”میں نے ازواج مطہرات کے یہ حجرات دیکھے ہیں، (جس دن یہ حجرات گرائے گئے لوگ دھاڑیں مار کر رو رہے تھے) میں نے اپنی زندگی میں اس دن سے زیادہ گریہ و بکا کبھی نہیں دیکھا، اور ہم نے سعید بن المسیب کو یہ فرماتے سنا کہ: واللہ میری دلی خواہش یہ تھی کہ یہ حجرات اپنی اصل ہیئت پر برقرار رکھے جاتے۔“

(گریہ و بکا کی یہ روایت حضرت مفتی محمد شفیعؒ نے بھی ذکر کی ہے، انہوں نے ’نصر‘ کی جگہ عطاء خراسانی نام لکھا ہے۔ معارف القرآن: ۱۰۲/۸)

ہیکل اس پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

”در اصل ولید اس خانوادے کا احترام دیکھ کر غیظ و غضب کا شکار ہوا اور حجرہ فاطمہ زہراؑ گرانے کا حکم دیا (تاکہ یہ حضرات لوگوں کی نگاہوں سے دور رہیں) لیکن الزام سے بچنے کے لیے توسیع مسجد کے بہانے تمام حجرات مقدسہ کو حکم کی لپیٹ میں لے لیا۔ حالانکہ اس سے پہلے عمرؓ اور عثمانؓ بھی مسجد نبویؐ میں توسیع کر چکے تھے، لیکن انہوں نے حجرات مقدسہ کو باقی رکھا اور باقی اطراف میں مسجد کی توسیع کی۔“

(فی منزل الوحی: ۴۸۷، ۴۸۸)

اس واقعے سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ حکومتی کردار کشی اور جابرانہ ہتھکنڈوں کے باوجود اہل بیتؑ سے مودت و عقیدت کا تعلق ختم نہیں کیا جاسکا، دلوں پر حکومت ہمیشہ اہل بیتؑ کی رہی۔

ہیکل نے ایک اور لطیف قصہ لکھا ہے:

”۸۸ھ میں جب مسجد نبویؐ کی توسیع و تزئین مکمل ہو چکی تو ولید بن عبد الملک سیدنا عثمانؓ کے بیٹے ابان کے ساتھ مسجد کا دورہ کر رہا تھا۔ اس دوران میں اس نے بڑے فخر اور ناز سے ابان سے کہا:

”این بناؤ نامن بنائکم“

”ہماری تعمیر اور تمہاری تعمیر میں کیا فرق ہے!“

ابان نے جواب دیا:

”انا بنیناہ بناء المساجد و بنیتموہ بناء الکنائس“

”ہم نے اسے مسجد کے انداز میں تعمیر کیا تھا اور تم نے اسے

گرجوں کے انداز میں بنایا ہے۔“ (فی منزل الوحی: ۴۸۹)

اس قصے سے جہاں مساجد کی تعمیر میں اسلامی مزاج کی نشاندہی ہوتی ہے، وہاں خلافت و ملوکیت میں انداز کار کا فرق بھی نمایاں ہوتا ہے۔

بات چل رہی تھی مودت اہل بیتؑ کی، اس قصہ معترضہ کے بعد مزید چند واقعات کا مطالعہ کرتے ہیں۔

سیدنا عمرؓ زمانہ قحط میں سیدنا عباسؓ کے وسیلے سے دعا کرتے ہیں

بخاریؒ کی روایت ہے کہ جب قحط پڑتا، عمرؓ بن الخطاب عباسؓ کے وسیلے سے

بارش کی یوں دعا کرتے:

”یا اللہ! جب ہم قحط میں مبتلا ہوتے تو اپنے نبی (ﷺ) کے ساتھ آپ کی بارگاہ

میں التماس گزار ہوتے تھے اور آپ بارش برسا دیتے تھے، اب ہم اپنے نبی کے چچا کے ساتھ آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے ہیں، سو ہم پر بارش برسا!“

راوی کا بیان ہے کہ دعا قبول ہوتی اور بارش برستی تھی“ (صحیح بخاری، باب الاستسقاء) حاکم کی روایت ہے کہ ایک موقع پر آپؐ نے یہ خطاب فرمایا:

”لوگو! رسول اللہ ﷺ عباسؓ سے وہی سلوک رکھتے تھے جو ایک بیٹا باپ سے رکھتا ہے، آپؐ کی تعظیم و تکریم کرتے اور آپؐ کی قسم پوری کرتے، سو لوگو! عم محترم عباسؓ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی اقتدا کرو اور اس نازل شدہ مصیبت میں انہیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وسیلہ بناؤ“ (الصواعق: ۱۷۸)

آپؐ کو اجازت کی ضرورت نہیں

دارقطنی کی روایت ہے کہ حسنؓ و عمرؓ سے ملنے آئے، لیکن اذن نہیں ملا، اتنے میں عبد اللہ بن عمرؓ بھی آگئے، انہیں بھی اذن نہیں ملا تو حسنؓ واپس چلے گئے، عمرؓ (کو اطلاع ہوئی تو) فرمایا: انہیں واپس بلاؤ جب وہ تشریف لائے تو انہوں نے بتلایا: ”امیر المؤمنین! میں نے سوچا عبد اللہ کو اجازت نہیں ملی تو مجھے بھی اجازت نہیں ملے گی! فرمایا: ”آپؐ عبد اللہ کی نسبت اجازت کے زیادہ حقدار ہیں، یہ جو ہمیں عزت و رفعت حاصل ہے، یہ اللہ کے بعد تمہاری ہی عطا کی ہوئی ہے“

ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ”آپؐ جب چاہیں تشریف لائیں، آپؐ کو اجازت کی ضرورت نہیں۔“ (الصواعق: ۱۷۹)

(ابن حجرؒ نے ’الاصابہ‘ میں یہ واقعہ امام حسینؑ کا لکھا ہے۔ واللہ اعلم)

علیؑ مولا

دارقطنی کی روایت ہے کہ دو اعرابی عمرؓ کے پاس اپنا جھگڑا لائے، آپؑ نے علیؑ کو ان کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے کہا، انہوں نے فیصلہ کر دیا تو ان میں سے ایک بولا:

”یہ ہمارے درمیان فیصلہ کرتا ہے!“

عمرؓ کو دکراٹھے اور اسے گدی سے پکڑ لیا اور فرمایا:

”بد بخت! جانتے ہو یہ کون ہیں؟ یہ تیرے مولا ہیں اور ہر مومن کے مولا ہیں اور جو انہیں اپنا مولا نہ مانے، وہ مومن ہی نہیں۔“

(الصواعق: ۱۷۹)

رسول اللہ ﷺ کی محبت مجھے اپنی محبت سے زیادہ عزیز ہے

”سیدنا عمرؓ نے حلف اٹھا کر کہا کہ حضرت عباسؓ کا قبول اسلام مجھے اپنے والد کے مسلمان ہونے سے زیادہ پیارا لگا، اس لیے کہ عباسؓ کے اسلام سے رسول اللہ ﷺ کو زیادہ خوشی ہوئی۔“

(الصواعق: ۲۳۸)

جی ہاں! محبوب کی محبت کے لیے اپنی محبت قربان کر دینا اور محبوب کی چاہتوں کو عزیز رکھنا یہی سچی محبت ہے۔

حبیب ابن حبیب

امام حسینؑ کے فرزند دلہند امام زین العابدینؑ سیدنا عبداللہ بن عباسؓ سے ملنے آئے تو انہوں نے استقبال کرتے ہوئے کہا:

”مرحبا! حبیب ابن حبیب!“

(الصواعق: ۲۳۸)

سیدنا بلالؓ نے فرمائش پوری کی

سیدنا بلالؓ عشق رسول ﷺ میں فنا تھے، حضور اکرم ﷺ کے فراق کا آپؐ کے دل کو ایسا صدمہ ہوا کہ اذان دینے کی ہمت نہ رہی، اب گلی کوچے تو وہی تھے لیکن ”نور“ نہ تھا، زندگی بدستور تھی، لیکن سرور نہ تھا، لمحہ لمحہ اضطراب، ذرہ ذرہ الہباب، بلالؓ کی تو دنیا اندھیر ہو گئی، رخت سفر باندھا اور دمشق جا بسے، کچھ عرصہ گزرا تو خود رسول اللہ ﷺ کو اپنے جاں نثار، عاشق زار کی جدائی گوارا نہ ہوئی..... اور ظاہر ہے حیات تھی، شعور حیات تھا، تبھی تو گوارا نہ ہوئی!..... اب محبت کس رنگ میں جلوہ نما ہوئی؟ یہ قصہ حضرت ابوالدرداءؓ بیان فرماتے ہیں:

(ترجمہ) ”بلالؓ نے خواب دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ انہیں فرما رہے ہیں:

”بلال! یہ کیسی جفا ہے؟

بلال! مجھے کب ملنے آو گے!“

بلالؓ غم میں ڈوبے، دھڑکتے، کانپتے دل کے ساتھ بیدار ہوئے، فوراً سواری پر بیٹھے اور مدینہ کی جانب روانہ ہوئے۔

مدینہ طیبہ پہنچ کر قبر مبارک پر حاضر ہوئے، قریب بیٹھ کر زار و قطار رونے لگے اور اپنا چہرہ قبر محبوبؐ پر رگڑنے لگے۔

حسنؑ اور حسینؑ دوڑے دوڑے آئے تو انہیں اپنے ساتھ چمٹاتے تھے اور چومتے تھے (کہ ان چہروں میں محبوب کا عکس دکھائی دیتا تھا اور ان جسموں سے محبوب کی خوشبو آتی تھی۔ ﷺ)

دونوں لاڈلوں نے فرمائش کی کہ ہم آپؐ سے وہ اذان سننا چاہتے ہیں، جو آپ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اس مسجد میں دیا کرتے تھے!

بلالؓ لاڈلوں کی یہ فرمائش ٹال نہ سکے۔ (کیونکہ یہ محبت کا تقاضا تھا اور محبت کا تقاضا نبھانا پڑتا ہے۔)

مسجد کی چھت پر چڑھے اور اُس جگہ کھڑے ہوئے جہاں کھڑے ہوا کرتے تھے۔

جب اللہ اکبر اللہ اکبر کہا تو مدینہ ہل گیا،

اشہدان لا الہ الا اللہ کہا تو مدینے میں ہلچل مچ گئی، اور جب اشہدان محمداً رسول اللہ کی صدا بلند کی تو پردہ نشین بیبیاں باہر نکل آئیں اور لوگ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے: کیا رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے؟!

لوگوں پر اتنا گریہ طاری ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد کبھی کسی مردوزن کو اس سے زیادہ روتے نہیں دیکھا گیا۔“

(رواہ ابن عساکر و قال تقی الدین السبکی اسنادہ جید۔ انوار انوری: ۱۵۲، ۱۵۳)

جن کے دل محبت رسول ﷺ سے لبریز تھے، وہ آپ کے لاڈلوں کی کوئی فرمائش ٹالتے نہ تھے اور جن لوگوں نے امام حسنؑ کو زہر دلوایا اور امام حسینؑ کو بے دردی سے شہید کیا، یقیناً ان کے دل محبت کے نور سے خالی تھے۔

اور جس دل میں محبت نہ ہو وہاں ایمان کہاں!

ابو ہریرہؓ امام حسنؑ کا بطن مبارک چومتے ہیں

احمدؒ اور طبرانیؒ نے صحیح سند سے روایت کیا ہے کہ

”عمیر بن اسحاق کا بیان ہے کہ ابو ہریرہؓ کی حسن بن علیؑ سے ملاقات ہوئی، میں وہاں موجود تھا، ابو ہریرہؓ نے امام حسنؑ سے کہا: ”اپنے پیٹ سے قمیص اٹھائیے، جہاں میں نے رسول اللہ ﷺ کو بوسہ دیتے ہوئے دیکھا ہے۔“

امام حسنؑ نے قمیص اٹھا دی تو ابو ہریرہؓ نے پیٹ چوما، اور ایک روایت میں ہے کہ آپؑ کی ناف پر بوسہ دیا۔“ (در السحابہ: ۲۹۰)

رسول اللہ ﷺ امام حسنؑ کا پیٹ چومتے تھے اور امام حسینؑ کے گلے پر بوسہ دیتے تھے یہ غالباً مستقبل کے مصائب پر اظہارِ رحمت و شفقت تھا، چنانچہ امام حسنؑ زہر پلانے سے شہید ہوئے اور امام حسینؑ کا گلا کاٹا گیا۔ صلی اللہ علیہ وآلہ وبارک ووسلم

ابو ہریرہؓ امام حسینؑ کے پاؤں جھاڑ رہے ہیں

ابن عساکر اپنی تاریخ میں ابی المہزم سے بیان کرتے ہیں کہ:
 ”ہم ایک خاتون کے جنازے میں شریک تھے، ہمارے ساتھ ابو ہریرہؓ بھی تھے، اس اثنا میں ایک مرد کا جنازہ لایا گیا، تو ابو ہریرہؓ نے اسے اپنے اور عورت کے درمیان رکھوایا اور دونوں کی اکٹھی نماز جنازہ پڑھائی۔

جب ہم واپس ہوئے تو حسینؑ (اپنی صغریٰ اور مسافت کی مشقت کی وجہ سے) تھک کر راستے میں بیٹھ گئے، ابو ہریرہؓ نے یہ دیکھا تو اپنی چادر کے پلو سے آپؐ کے قدموں سے مٹی جھاڑنے لگے، اس پر حسینؑ نے فرمایا:

ابو ہریرہ! آپ یہ کر رہے ہیں!

ابو ہریرہؓ نے عرض کیا: مجھے کرنے دیجئے، واللہ اگر لوگوں کو آپ کا وہ مقام معلوم ہو جائے جو میں جانتا ہوں تو آپ کو اپنی گردنوں پر اٹھائے رکھیں۔“

(الحسینؑ حفیداً و شہیداً: ۲۲)

ابو ہریرہؓ امام حسنؑ کو ”سیدی“ کہہ کر پکارتے ہیں

طبرانی نے معجم کبیر میں اور حاکم نے مستدرک میں صحیح سند سے ابوسعید مقبری سے روایت کیا ہے کہ:

”ہم ابو ہریرہؓ کے پاس تھے، حسنؑ بن علیؑ آئے اور سلام کیا، لوگوں نے جواب دیا، ابو ہریرہؓ وہیں تھے، لیکن انہیں پتا نہ چلا، بتلایا گیا کہ یہ حسن بن علیؑ ہیں اور انہوں نے سلام کیا ہے۔

ابو ہریرہؓ جلدی سے اٹھے، اور قریب جا کر عرض کیا:

”وعلیک السلام یاسیدی!“

ابو ہریرہؓ کو کہا گیا: ”آپ انہیں یاسیدی کہتے ہیں؟!“

انہوں نے جواب دیا: ”میں شہادت دیتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ سید ہے“ (تو میں انہیں ’سیدی‘ کیوں نہ کہوں!) (در السحابہ: ۲۹۰)

میرادل ہمیشہ حسنؑ کی محبت سے لبریز رہا ہے

حاکم نے مستدرک میں صحیح سند سے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ: ”میں نے جب سے حسنؑ سے رسول اللہ ﷺ کی محبت اور پیار دیکھا ہے، میرادل ان کی محبت سے لبریز رہا ہے۔ میں نے دیکھا کہ حسنؑ رسول اللہ ﷺ کی گود میں ہیں، حسنؑ اپنی انگلیاں نبی ﷺ کی داڑھی میں ڈال رہے ہیں اور نبی ﷺ اپنی زبان حسنؑ کے منہ میں ڈال رہے ہیں، پھر دعا کی: ”اے اللہ! میں اس سے محبت کرتا ہوں، تو بھی اس سے محبت فرما!“ (در السحابہ: ۲۹۱)

عمر بن عبدالعزیز کو احیاء خلافت کی جو سعادت ملی،

یہ مودت اہل بیتؑ کا صلہ تھی

عمر بن عبدالعزیز جب والی مدینہ تھے تو عبداللہ بن حسن بن حسنؑ کام کے سلسلے میں ان کے پاس آئے، عمر بن عبدالعزیز نے عرض کیا:

”آپ کو جب بھی کوئی کام ہو تو پیغام بھجوادیا کریں یا مجھے رقعہ لکھ دیا کریں، اس لیے کہ مجھے

اللہ سے حیا آتی ہے کہ اللہ آپ کو میرے دروازے پر دیکھے“ (الصواعق: ۱۸۰، ۲۳۸)

سیدہ فاطمہ بنت علیؑ امارت مدینہ کے دور میں عمر بن عبدالعزیز سے ملنے گئیں تو انہوں نے ان کے اعزاز و اکرام میں مجلس برخواست کر دی اور عرض کیا:

”واللہ! روئے زمین پر کوئی گھرانہ مجھے آپ کے گھرانے سے زیادہ پیارا نہیں ہے، آپ مجھے اپنے گھر والوں سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔“ (الصواعق: ۱۸۰، ۲۳۸)

ایک مرتبہ عبداللہ بن حسن المثنیٰ بن حسن السبطؑ عمر بن عبدالعزیز سے ملنے تشریف لے گئے، عبداللہ ابھی نو عمر تھے اور انہوں نے گیسور کھے ہوئے تھے، عمر بن

عبدالعزیز نے مجلس برخواست کر دی اور ہمہ تن ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس پر (بعد میں) ان کے احباب نے انہیں ملامت کی تو فرمایا:

”مجھے اتنے ثقہ محدث نے یہ حدیث بیان کی ہے کہ گویا میں یہ حدیث خود رسول اللہ ﷺ کے دہن مبارک سے سن رہا ہوں: ”فاطمہ میرا ایک ٹکڑا ہے، اس کی خوشی میری خوشی ہے“ اور مجھے یقین ہے کہ آج اگر فاطمہ زندہ ہوتیں تو اپنے بیٹے کے لیے میرا حسن اکرام دیکھ کر خوش ہوتیں۔“ (الصواعق: ۱۸۰)

سیدنا عمرؓ بن عبدالعزیز کو احیاء خلافت کی جو سعادت نصیب ہوئی اور اس شان سے نصیب ہوئی کہ آپؓ کو خلفائے راشدینؓ میں شمار کیا جاتا ہے، جیسا کہ الصواعق: ۲۲۳ پر ابوداؤد کی سنن کے حوالے سے مذکور ہے، عجب نہیں کہ یہ سعادت مودت اہل بیتؑ کے صلے میں نصیب ہوئی!

ان روایات مودت کے ساتھ ایک اور روایت بھی پڑھ لیجیے: ”نوفل بن ابی القرات کا بیان ہے کہ میں عمرؓ بن عبدالعزیز کے پاس بیٹھا تھا، مجلس میں ایک شخص نے یزید کا یوں ذکر کیا: ”امیر المؤمنین یزید بن معاویہ“

فرمایا: تو اُسے امیر المؤمنین کہتا ہے!

حکم دیا کہ اسے سزا دی جائے، چنانچہ اسے بیس کوڑے لگائے گئے“ (الصواعق: ۲۲۱) خلیفہ راشد عمرؓ بن عبدالعزیز کے اس عمل نے متعین کر دیا کہ اہل بیتؑ کی مودت اور دشمن اہل بیتؑ کی محبت ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتیں! لہذا جو لوگ منہ بھر بھر کے یزید کو امیر المؤمنین کہتے اور لکھتے ہیں اور اس کی ظالمانہ اور فاسقانہ حکومت کے وکیل صفائی بنتے ہیں، درحقیقت ان کے باطن کے کونوں کھدروں میں بغض اہل بیتؑ کے جراثیم چھپے ہوتے ہیں اور یزید کی اوٹ میں ان کا اظہار ہوتا ہے۔ خلیفہ راشد کے فیصلے کے مطابق ایسے لوگ جب جب یزید کو امیر المؤمنین کہیں اور اس کی مدح سرائی کریں، کوڑوں کی سزا کے مستحق ہیں۔

ائمہ اربعہ اور اہل بیتؑ

سطور بالا میں ہم نے اہل بیتؑ کے بارے میں خلفائے راشدینؑ اور صحابہ کرامؓ کا طرز عمل پڑھا، اب اہل السنۃ والجماعۃ کے ائمہ اربعہؑ کے مسلک و منہج کا مختصر سا جائزہ لیتے ہیں:

امام اعظم ابوحنیفہؒ کی سعادت و ذہانت سیدنا علیؑ کی دعا کا ثمر ہے علامہ شبلی نعمانیؒ امام ابوحنیفہؒ کے دادا نعمانؒ (زوطی) کے قبول اسلام اور کوفہ سکونت کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

”یہ حضرت علیؑ کی خلافت کا زمانہ تھا اور شہر کوفہ دار الخلافہ ہونے کا شرف رکھتا تھا، اس تعلق سے زوطیؒ نے کوفہ کو پسند کیا اور وہیں سکونت اختیار کی۔

کبھی کبھی جناب امیرؑ کے دربار میں حاضر ہوتے اور خلوص عقیدت کے آداب بجا لاتے۔ ایک بار نوروز کے دن، جو کہ پارسیوں کی عید کا دن ہے، فالودہ نذر کے طور پر بھیجا، حضرتؑ نے ارشاد فرمایا: ”نوروز ناکل یوم“ یعنی ”ہمارے یہاں ہر روز نوروز ہے۔“

”ثابت“ امام ابوحنیفہؒ کے پدر بزرگوار کوفہ ہی میں پیدا ہوئے، زوطیؒ نے نیک فال لڑ کے کو حضرت علیؑ کی خدمت میں حاضر کیا، آپؑ نے بزرگانہ شفقت فرمائی اور ان کے اور ان کی اولاد کے حق میں دعائے خیر کی۔“ (سیرۃ النعمان: ۲۸، ۲۹)

امام ابوحنیفہؒ کے پوتے حضرت اسماعیلؒ فرماتے ہیں:

”ہم لوگ نسل فارس سے ہیں اور کبھی کسی کی غلامی میں نہیں آئے، ہمارے دادا ابوحنیفہؒ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے، (ہمارے پردادا) ثابتؒ بچپن میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، انہوں نے ان کے خاندان کے حق میں دعائے خیر کی تھی، ہمیں امید ہے کہ وہ دعا بے اثر نہیں رہی۔“ (سیرۃ النعمان: ۲۵)

امام ابوحنیفہؒ کا علم و فضل اہل بیتؑ کا صدقہ ہے

”امام ابوحنیفہؒ ایک مدت تک استفادہ کی غرض سے امام باقرؑ کی خدمت میں حاضر رہے اور فقہ و حدیث کے متعلق بہت سی نادر باتیں حاصل کیں۔ شیعہ اور سنی دونوں نے مانا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کی معلومات کا بڑا ذخیرہ حضرت ممدوحؑ کا فیض صحبت تھا۔ امام صاحب نے ان کے فرزند رشید امام جعفر صادقؑ کے فیض صحبت سے بھی بہت کچھ فائدہ اٹھایا، جس کا ذکر عموماً تاریخوں میں پایا جاتا ہے۔ ابن تیمیہؒ نے اس سے انکار کیا ہے اور اس کی وجہ یہ خیال کی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ حضرت جعفر صادقؑ کے معاصر اور ہم سر تھے، اس لیے ان کی شاگردی کیونکر اختیار کرتے۔ لیکن یہ ابن تیمیہؒ کی گستاخی اور خیرہ چشمی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ لاکھ مجتہد اور فقیہ ہوں لیکن فضل و کمال میں ان کو حضرت جعفر صادقؑ سے کیا نسبت؟ حدیث و فقہ بلکہ تمام مذہبی علوم اہل بیتؑ کے گھر سے نکلے، و صاحب البیت ادری بما فیہا۔“

(سیرۃ النعمان: ۵۷، ۵۸)

امام جعفر صادقؑ کے ثقہ ترین شاگرد امام ابوحنیفہؒ ہیں، اس لیے اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ فقہ حنفی دراصل فقہ جعفری ہے، محفوظ اور معقول صورت میں۔ اور اب تو مسند امام زیدؒ بھی چھپ گیا ہے، اس میں اور فقہ حنفی میں کوئی خاص فرق نہیں، یہ بھی اس حقیقت کا قرینہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا علم و فقہ اہل بیتؑ کا عطیہ ہے۔

امام ابوحنیفہؒ شہید اہل بیتؑ ہیں

امام ابوحنیفہؒ سیاسی اور فقہی اعتبار سے اموی حکومت کو درست سمجھتے تھے نہ عباسی حکومت کو، کیونکہ ان حکومتوں کی بنیاد جور و جبر تھا۔ یہی وجہ ہے ان حکومتوں کے خلاف جو بھی تحریک اٹھی، امام ابوحنیفہؒ نے، دوسرے فقہاء کے ساتھ، اس کی حمایت کی۔

ہشام بن عبدالملک کے دور حکومت میں امام زید بن علیؑ نے ۱۲۱ھ میں قیام کیا اور علم بغاوت بلند کیا، شاہ عبدالعزیزؒ کے بیان کے مطابق ”امام صاحب بھی اس میں شریک تھے“ علامہ شبلیؒ اگرچہ اس سے اختلاف رکھتے ہیں، لیکن خود ان کے بیان کے مطابق ”امام ابوحنیفہؒ کا خاندان اہل بیتؑ کے ساتھ ایک خاص ارادت رکھتا تھا اور خود امام صاحبؒ نے ایک مدت تک امام باقرؑ کی دامن فیض میں تربیت پائی تھی“ اس لیے امام صاحبؒ اہل بیتؑ کے موقف اور مزاج اور ان کے خلوص و تقویٰ سے بخوبی آشنا تھے، چنانچہ قرین قیاس یہ ہے کہ ہر تحریک میں اہل بیتؑ کی حمایت کی روایات صحیح تر ہیں۔

اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اموی دور حکومت میں بھی امام ابوحنیفہؒ نے ایک سو دس کوڑے برداشت کیے لیکن عہدہ قضا قبول نہیں کیا اور عباسی دور حکومت میں بھی کئی سال اسیر رہے لیکن قاضی نہیں بنے، کیونکہ ان کے نزدیک ان حکومتوں کا جواز ہی محل نظر تھا، چنانچہ اموی اور عباسی دونوں ادوار میں سادات کرامؑ کے ساتھ امام ابوحنیفہؒ بھی زیر عتاب رہے۔

اموی جبر کا حال تو معلوم ہے، عباسی جور کا قصہ بھی شبلیؒ کی زبانی پڑھ لیجئے:

”جبر و ظلم کا بازار تو گرم ہی تھا لیکن منصور نے مزید ستم یہ کیا کہ سادات کی خانہ بربادی شروع کر دی۔ اس میں شبہ نہیں کہ سادات ایک مدت سے خلافت کا منصوبہ تیار کر رہے تھے اور ایک لحاظ سے ان کا حق بھی تھا۔ تاہم سفاح کی وفات تک ان کی کوئی سازش ظاہر نہ ہوئی تھی، صرف بدگمانی پر منصور نے سادات اور علویوں کی بیخ کنی شروع کی، جو لوگ ان میں ممتاز تھے ان کے ساتھ زیادہ مظالم کیے، محمد بن ابراہیم کہ حسن و جمال میں یگانہ روزگار تھے اور اس وجہ سے ’دیباچہ‘ کہلاتے تھے، ان کو زندہ دیوار میں چنوا دیا۔ ان مظالم کی ایک بڑی داستان ہے، جس کے بیان کرنے کو بڑا سخت دل چاہیے۔ آخر تک آ کر ۱۳۵ھ میں انہی مظلوم سادات میں سے محمدؑ ’النفس الزکیہ‘

نے تھوڑے سے آدمیوں کے ساتھ مدینہ منورہ میں خروج کیا اور چند روز میں ایک بڑی جمعیت پیدا کر لی، بڑے بڑے پیشوایان مذہب حتیٰ کہ امام مالکؒ نے فتویٰ دے دیا کہ منصور نے جبراً بیعت لی ہے، خلافت نفس زکیہ کا حق ہے۔ (معلوم ہوا کہ جبری بیعت شرعاً واجب النقص ہے۔ ناقل)

نفس زکیہ اگرچہ نہایت دلیر، قوی بازو، فن جنگ سے واقف تھے، لیکن تقدیر پر کس کا زور چل سکتا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ رمضان ۱۴۵ھ میں نہایت بہادری سے لڑ کر میدان جنگ میں مارے گئے۔

ان کے بعد ابراہیمؒ ان کے بھائی نے علم خلافت بلند کیا اور ایسی تیاریوں سے مقابلے کو اٹھے کہ منصور کے حواس جاتے رہے۔ ابراہیمؒ چونکہ شجاعت اور دلیری کے علاوہ بہت بڑے عالم اور مقتداے عالم تھے، اس لیے ان کے دعویٰ خلافت پر ہر طرف سے لبیک کی صدائیں بلند ہوئیں، خاص کوفہ میں کم و بیش بیس لاکھ آدمی ان کے ساتھ جان دینے کو تیار ہو گئے، مذہبی گروہ خاص کر علماء و فقہا نے عموماً ان کا ساتھ دیا۔

امام ابوحنیفہؒ شروع سے عباسیوں کی بے اعتدالیاں دیکھتے آئے تھے اور سفاح ہی کے زمانے میں ان کی رائے قائم ہو چکی تھی کہ یہ لوگ منصب خلافت کے شایاں نہیں۔

۱۴۵ھ میں ابراہیمؒ نے جب علم خلافت بلند کیا تو اور پیشوایان مذہب کے ساتھ امام صاحبؒ نے بھی ان کی تائید کی، خود شریک جنگ ہونا چاہتے تھے، لیکن مجبور یوں کی وجہ سے نہ ہو سکے، جس کا ان کو ہمیشہ افسوس رہا..... اس میں شبہ نہیں کہ امام صاحبؒ ابراہیمؒ کے علانیہ طرفدار تھے اور بجز اس کے کہ خود شریک جنگ نہ ہو سکے، لیکن ہر طرح پران کی مدد کی۔

”ابراہیمؒ کی شہادت کے بعد منصور ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوا جنہوں نے ابراہیمؒ کا ساتھ دیا تھا، ان میں امام صاحبؒ بھی تھے، اس وقت منصور کا پایہ تخت ہاشمیہ کے مقام

پر تھا، جو کوفہ سے چند میل ہے، لیکن چونکہ کوفہ والے سادات کے سوا اور کسی خاندان کو خلافت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے، اس لیے منصور نے ایک دوسرے دار الخلافہ کی تجویز کی اور بغداد کو انتخاب کیا۔ ۱۳۶ھ میں بغداد پہنچ کر امام ابوحنیفہؒ کے نام فرمان بھیجا کہ فوراً پائے تخت میں حاضر ہوں، امام صاحبؒ بنو امیہ کی تباہی کے بعد مکہ معظمہ سے چلے آئے تھے اور کوفہ میں مقیم تھے۔ منصور نے گو پہلے ہی ان کے قتل کا ارادہ کر لیا تھا لیکن بہانہ ڈھونڈتا تھا۔“

اور بہانہ عہدہ قضا قبول کرنے سے انکار بنا، حکم دیا کہ قید کر دیا جائے۔ ”لیکن امام صاحبؒ کی شہرت دور دور تک پہنچ چکی تھی، قید کی حالت نے ان کے اثر اور قبول عام کو کم کرنے کے بجائے اور زیادہ کر دیا۔ بغداد کی علمی جماعت جس کا شہر میں بہت کچھ اثر تھا، ان کے ساتھ نہایت خلوص رکھتی تھی، ان باتوں کا یہ اثر تھا کہ منصور نے ان کو گو نظر بند کر رکھا تھا لیکن کوئی امر ان کے ادب اور تعظیم کے خلاف نہ کر سکتا تھا، قید خانہ میں ان کا سلسلہ تعلیم بھی برابر قائم رہا۔۔۔۔۔ ان وجوہ سے منصور کو امام صاحبؒ کی طرف سے جو اندیشہ تھا، وہ قید خانہ کی حالت میں بھی باقی رہا، جس کی آخری تدبیر یہ تھی کہ بے خبری میں ان کو زہر دلوادیا۔

جب امام صاحبؒ کو زہر کا اثر محسوس ہوا تو سجدہ کیا اور اسی حالت میں وفات پائی۔“
(سیرۃ النعمان: ۷۰-۷۸)

تاریخ بغداد: ۱۳/۳۲۹ میں بھی ہے ”ثم سقاہ فمات۔“
یوں اہل السنۃ والجماعۃ کا یہ امام اعظمؒ اہل بیتؑ کے موقف و مسلک پر قربان ہوا۔ فرحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ و جزاہ عنا خیر الجزاء۔
جو لوگ جبری اور سازشی بیعت کو واجب التعمیل قرار دیتے ہیں، اس تفصیل کے بعد انہیں اپنی رائے پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔

نیز سوچنا چاہیے کہ اگر امام حسینؑ کی شہادت کے بعد رائے عامہ اموی اقتدار سے مطمئن تھی تو بار بار یہ ہلچل کیوں برپا ہوتی تھی؟

علماء و صلحاؑ آمرانِ وقت کے مقابلے میں کھڑے ہونے والے ہر مرد مجاہد کی طرف کیوں لپکتے تھے؟

امام مالکؒ کا کمالِ مودّت

امام مالکؒ بن انس کا فتویٰ تھا کہ جبری طلاق واقع نہیں ہوتی، چونکہ اس کا اثر جبری بیعت کے نفاذ پر بھی پڑتا تھا، اس لیے والیِ مدینہ جعفر بن سلیمان عباسی نے مجبور کیا کہ فتویٰ واپس لیں۔

اس سے پہلے امام صاحبؒ حضرت محمد النفس الزکیہؑ کے دعویٰ خلافت کی کھلی تائید اور حمایت کر چکے تھے، اور اس حمایت کے لیے آپؑ کا استدلال یہ تھا کہ منصور کے لیے بیعت جبراً لی گئی ہے، شرعاً جبری طلاق واقع نہیں ہوتی، اس لیے جبری بیعت کا بھی کوئی اعتبار نہیں۔ والیِ مدینہ جعفر اس فتویٰ کی آڑ میں درپے آزار ہوا، رجوع سے انکار پر غضبناک ہو کر سزا کا حکم دیا۔

پھر سرزمینِ مدینہ یہ دردناک منظر دیکھتی ہے کہ اس کی پشت پر ازراہِ ادب و محبت ننگے پاؤں چلنے والے امامؑ کی پشت پر کوڑے برسائے جا رہے ہیں، دو چار نہیں، اکٹھے ستر کوڑے! جرم کیا ہے؟

حمایتِ حق

مودتِ اہلِ حقؑ

پشتِ مبارک خون آلود ہو جاتی ہے، دونوں ہاتھ موٹھے سے اتر جاتے ہیں، اس پر بھی غصہ ٹھنڈا نہیں ہوتا، حکم ہوتا ہے اونٹ پر بٹھا کر پورے شہر میں تشہیر کی جائے، چنانچہ امامؑ دارالہجرۃ کو مجرموں کی طرح باندھ کر شہر میں گھمایا جا رہا ہے اور امام برحقؑ کی

زبان سے اس حال میں بھی یہ کلمہ حق جاری ہو رہا ہے:

”من عرفنی فقد عرفنی ومن لا یعرفنی فأنا مالک بن

أنس اقول ان طلاق المکره لیس بشیء“

”جو مجھے پہچانتا ہے، وہ تو پہچانتا ہی ہے، جو نہیں پہچانتا، وہ پہچان

لے کہ میں مالک بن انس ہوں، فتویٰ دیتا ہوں کہ جبری طلاق کا

کوئی اعتبار نہیں۔“ (طبقات ابن سعد، ترجمہ مالک بن انس)

اور یہ بھی کیا عجب ہے کہ امام مالکؒ پر تو اس لیے کوڑے برسائے جا رہے ہیں کہ وہ جبری طلاق واقع ہونے کے قائل نہیں، امام ابو حنیفہؒ جبری طلاق واقع ہونے کے قائل ہیں، لیکن کوڑے انہیں بھی مارے جا رہے ہیں! یہاں بہانہ منصب قضا سے انکار ہے! حقیقت یہ ہے کہ فقہی مسائل اور اختلاف آراء پر سزائیں صرف بہانے تھے، ان ائمہ کرامؒ کا اصل جرم اہل بیتؑ کے موقف کی تائید و حمایت تھا۔

بہر کیف! والیٰ مدینہ جعفر بن سلیمان نے تو امام مالکؒ پر یہ ستم کیا، لیکن امامؒ کوڑوں کی سزا کے بعد جب ہوش میں آئے تو فرمایا: ”میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اپنے مارنے والے کو معاف کیا۔“ پوچھا گیا تو یہ وجد آفرین جواب دیا:

”موت سرہانے کھڑی ہے، مجھے حیا آتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے اس حال میں ملوں کہ میری وجہ سے آپؐ کی آل کا کوئی فرد دوزخ میں داخل ہوا!“

کچھ عرصے کے بعد منصور عباسی مدینہ طیبہ حاضر ہوا تو امامؒ کو جعفر سے قصاص دلوانا چاہا، فرمایا:

”اللہ کی پناہ! واللہ کوڑا اٹھنے سے پہلے قرابت رسول ﷺ کی وجہ سے میں

اسے معاف کر دیتا تھا“ (الصواعق: ۱۸۰)

چشم فلک نے اہل بیتؑ سے مودت اور نسبت رسول ﷺ سے کمال محبت کا یہ نظارہ کم ہی دیکھا ہوگا!

امام احمدؒ کا جمال مودت

امام احمدؒ بن حنبلؒ نے اپنے مسند میں اہل بیتؑ کے فضائل و مناقب کی روایات جس کثرت سے ذکر کی ہیں، اس سے ان کی اہل بیتؑ سے گہری عقیدت و محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہاں ہم آپؒ کے طرز عمل کے دو واقعات ذکر کر رہے ہیں۔

”خطیب کا بیان ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ کے پاس جب کوئی سید یا قریشی آتا، بوڑھا ہوتا یا جوان، امامؒ ازراہ اکرام اس کے پیچھے پیچھے چلتے تھے۔“ (الصواعق: ۱۸۰)

”ایک مرتبہ ایک شیعہ آیا، امام نے اس کا احترام کیا، اس پر لوگوں نے باتیں کیں تو فرمایا:

”سبحان اللہ! ایک شخص اہل بیتؑ کے افراد سے محبت رکھتا ہے اور خود بھی ثقہ ہے“

(تو میں اس کا احترام کیوں نہ کروں؟) (الصواعق: ۲۳۸)

یہ اس جلیل القدر امامؒ کا طرز عمل ہے جس کی محبت کو اہل سنت کی علامت قرار دیا گیا ہے۔

امام شافعیؒ اہل بیتؑ کی مودت میں فنا تھے

امام محمد بن ادریس شافعیؒ دل و جان سے اہل بیتؑ کی مودت میں فنا تھے، آپ کے شب و روز نور مودت سے روشن رہتے تھے، چنانچہ اہل محبت پر جو گذرتی ہے، وہ آپ پر بھی گذری۔

”امام مکہ معظمہ میں مقیم تھے، فکر معاش دامن گیر تھی، اتفاقاً والی یمن مکہ مکرمہ آیا، بعض عمائد قریش نے اس سے سفارش کی کہ شافعی اہلیت رکھتے ہیں، انہیں کوئی سرکاری خدمت سپرد کی جائے، چنانچہ بخران کے عامل بنا دیے گئے۔

والی یمن بہت سفاک و ظالم تھا، امام صاحبؒ اسے ظلم و زیادتی اور بے انصافی سے روکتے تھے، والی یمن نے ناراض ہو کر ہارون الرشید کو خط لکھا کہ شافعی علوی سادات کے ساتھ ہیں، جس سے بڑا اندیشہ ہے۔

ہارون کو خط ملا تو آپ سے باہر ہو گیا، حکم بھیجا کہ شافعی اور ان کے تمام ساتھیوں کو فوراً دارالحکومت بھیج دو! حکم کی تعمیل کی گئی، امام شافعی گرفتار ہو کر ہارون کے دربار میں لائے گئے، امام محمد بن الحسن شیبانی بھی بغداد میں تشریف رکھتے تھے، انہیں معلوم ہوا تو وہ بھی پہنچ گئے، اور ان کی سفارش پر امام شافعی کی رہائی ہوئی۔

یہ واقعہ ۱۸۲ھ کا ہے، جب امام صاحبؒ کی عمر ۳۴ سال تھی۔

(محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے: ۱۱۴)

فتنہ رخص و نصب کے مقابلے میں امام شافعیؒ اہل السنۃ والجماعۃ کے بے

باک ترجمان تھے، فرماتے ہیں:

”اذا نحن فضلنا علیاً فاننا

روافض بالتفضیل عند ذوی الجہل

وفضل ابی بکر اذا ما ذکرته

رمیت بنصب عند ذکری للفضل

فلازلت ذارفض و نصب کلاهما

بحبہما حتی اوسد فی الرمل“

(الصواعق: ۱۳۳)

ترجمہ: ”جب ہم علیؑ کے فضائل بیان کریں تو اس بیان فضیلت کی وجہ سے جہلا کے

یہاں ہم روافض قرار پاتے ہیں،

جب میں ابو بکرؓ کی فضیلت ذکر کرتا ہوں تو اس تذکرہ فضل کی وجہ سے مجھ پر ناہمی کی

تہمت لگائی جاتی ہے،

ان دونوں کی محبت میں میں اسی طرح رافضی اور ناہمی رہوں گا، یہاں تک کہ ریتلی قبر

میں رکھ دیا جاؤں گا“

نیز فرماتے ہیں:

”قالوا ترفضت قلت كلا
ما الرفض ديني ولا اعتقادي
لكن توليت غير شك
خير امام وخير هادي
ان كان حب الولي رفضاً
فباني ارفض العباد“

(الصواعق: ۱۳۳)

ترجمہ: لوگ کہتے ہیں: تو رافضی ہو گیا، میں کہتا ہوں: ہرگز نہیں، رفض میرا دین ہے نہ میرا عقیدہ،

لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ میں بہترین امام اور بہترین ہادی سے محبت رکھتا ہوں، سوا گروئی کی محبت رفض ہے تو میں دنیا کا سب سے بڑا رافضی ہوں۔“
خوارج اور نواصب نے جب آپؑ کے خلاف پروپیگنڈا تیز کر دیا تو آپؑ نے ان کے جواب میں یہ ایمان آفرین اشعار کہے:

”يارا كبا قف بالمحصب من مني
واهتف بساكن خيفها والناهض
سحراً اذا فاض الحجيج الى مني
فيضاً كملتطم الفرات الفائض
ان كان رفضاً حب آل محمد
فليشهد الثقلان اني رافضي“

(الصواعق: ۱۳۳)

ترجمہ: ”اے شہ سوار! یوم ترویہ کی صبح جب حجاج ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا کی طرح منیٰ کی طرف رواں دواں ہوں تو وادی مہب کے کنارے کھڑا ہو جاؤ اور منیٰ کے

ہر باسی اور مسافر سے پکار پکار کر یہ کہہ دے کہ اگر آل محمد ﷺ کی محبت رخص ہے تو جن و انس گواہ ہو جائیں کہ میں رافضی ہوں۔“

امام شافعیؒ کے ان اشعار کو ہر دور میں اہل السنۃ والجماعۃ نے اپنے جذبات کا ترجمان سمجھا اور تواتر کے ساتھ انہیں نقل کیا۔

ابن حجر مکیؒ کی ’الصواعق المحرقة‘ کے حوالے سے تو آپ یہاں پڑھ رہے ہیں۔

امام قرطبیؒ نے ’احکام القرآن‘ میں استحسان کے ساتھ یہ اشعار لکھے ہیں۔

شہرہ آفاق محدث ملا علی قاریؒ بھی اپنی مودت و عقیدت کے اظہار کے لیے انہی اشعار کو وسیلہ بناتے ہیں، دیکھیے: مرقاة المفاتیح: ۲۵۱/۸

’روح المعانی‘ جو حضرت تھانویؒ، علامہ عثمانیؒ سے لے کر مفتی محمد شفیعؒ تک عصر حاضر کی تمام تفاسیر کا ماخذ ہے اور گزشتہ تمام تفاسیر کا نچوڑ ہے، اس میں علامہ محمود آلوسیؒ ان الفاظ کے ساتھ یہ اشعار نقل کرتے ہیں ”اور میں بھی شافعی کا قول شافی کہتا ہوں۔“

(روح: ۳۲/۲۵)

مفتی محمد شفیعؒ یہ اشعار روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”در حقیقت یہی جمہور امت کا مسلک و مذہب ہے۔“ (معارف القرآن ۶۹۲/۷)

یہ کیسا سنی ہے!

اہل بیتؑ اطہار سے ابو بکر و عمرؓ، عثمانؓ و عمرؓ کی مودتیں ہمارے سامنے آ چکیں،

ائمہ اربعہؑ کی نیاز مندیاں ہم نے پڑھ لیں،

لیکن جو سنی ابو بکر و عمرؓ کی مودتوں کا احترام نہ کرتا ہو،

عثمانؓ و عمرؓ کا اسوۂ حسنہ اس کے لیے درخور اعتنا نہ ہو،

ابو حنیفہؒ و مالکؒ کا طرز عمل اس کے لیے لائق تقلید نہ ہو،

احمد و شافعیؒ کے خیالات اس کے فکر و نظر میں راہ نہ پاسکیں

تو یہ کیسا سنی ہے؟!

ائمہ اور اولیاء کے نزدیک مودتِ اہل بیتؑ کو

سلامتی خاتمہ میں بڑا دخل ہے

ارشاد نبوی کے مطابق اخروی کامیابی کا دار و مدار دم آخر پر ہے، عبادت و ریاضت، ذکر و فکر کا مقصود بس یہ ہے کہ خاتمہ ایمان پر ہو جائے۔

حسن خاتمہ میں حسن عمل کے ساتھ اہل بیتؑ سے حسن عقیدت اہم کردار رکھتی ہے۔

امام ربانی مجدد الف ثانیؒ خواجہ محمد تقی کے نام اپنے مکتوب میں رقمطراز ہیں:

”فقیر کے والد ماجد (مخدوم شیخ عبدالاحد فاروقی) جو علم ظاہری و باطنی سے آراستہ

تھے، اکثر اوقات محبتِ اہل بیتؑ کی ترغیب دیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ اس محبت

کو سلامتی خاتمہ میں بڑا دخل ہے، اس کا بہت خیال رکھا جائے۔

ان کے مرضِ موت میں فقیر حاضر تھا، جب ان کا آخری وقت ہوا اور اس عالم فانی کا

شعور کم ہو گیا، اس وقت فقیر نے ان کو یہ بات یاد دلائی اور محبتِ اہل بیتؑ کا استفسار کیا،

فرمایا: ”میں محبتِ اہل بیتؑ میں غرق ہوں۔“

اس وقت اللہ کا شکر ادا کیا گیا۔“

اس کے بعد مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں:

”محبتِ اہل بیتؑ تو سرمایہٴ اہل سنت ہے، مخالفین اس حقیقت سے غافل اور ان کی

پراعتدال محبت سے ناواقف ہیں، انہوں نے جانبِ افراط کو اختیار کر لیا اور افراط کے

علاوہ کو تفریط سمجھ بیٹھے اور اس پر خارجیت کا حکم لگا دیا، یہ نہ سوچا کہ افراط و تفریط کے

درمیان ایک حد وسط (حد اعتدال) بھی ہے، جو مرکزِ حق اور مقامِ صدق ہے اور یہ اہل

سنت کو نصیب ہے۔

یہ کس قسم کی محبت ہے جو خلفاءِ راشدینؑ اور اصحابِ کرامؑ سے بیزاری اور لعن و طعن پر ہی

موقوف ہے!

اہل سنت کا گناہ اگر ہے تو یہ ہے کہ وہ محبت اہل بیتؑ کے ساتھ ساتھ سرورِ دو عالم ﷺ کے تمام اصحابؓ کی بھی تعظیم و توقیر کرتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو بھی، باہم تنازعات و اختلافات کے باوجود، بدی کے ساتھ یاد نہیں کرتے، اور اہل سنت کا یہ تعظیسی و توقیری رویہ درحقیقت شرفِ صحبت کی بنا پر ہے۔ (تجلیاتِ ربانی، مکتوب: ۳۶، ص: ۲۶)

امام شافعیؒ بھی مودتِ اہل بیتؑ کو اپنے لیے وسیلہٴ نجات سمجھتے تھے، فرماتے ہیں:

”آلِ النبی ذریعتی وہم الیہ وسیلتی

أرجو بهم أعطی غداً بیدی الیمین صحیفتی

(الصواعق: ۱۸۰)

ترجمہ: ”قربِ نبوی اور رضائے رسول ﷺ کے حصول کے لیے آلِ نبی ﷺ میرا ذریعہ اور وسیلہ ہیں اور ان کی مودت کے طفیل مجھے امید ہے کہ کل قیامت کو میرا صحیفہٴ عمل میرے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔“

ایمان افروز رباعی

ہمارے ہاں کی قدیم مساجد میں عموماً ایک رباعی دیواروں پر کندہ ملتی ہے:

”الہی بحق بنی فاطمہ

کہ بر قول ایماں کنم خاتمہ

وگر دعوتم رد کنی و رقبول

من و دست و دامانِ آلِ رسول“

یہ رباعی درحقیقت اہل اسلام کے قلوب میں موجزن مودتِ اہل بیتؑ کا خوبصورت اظہار ہے اور اس بات کی بھی نشاندہی کرتی ہے کہ ملتِ اسلامیہ میں تسلسل کے ساتھ یہ فکر موجود رہی کہ حسنِ خاتمہ کے لیے مودتِ اہل بیتؑ بھی ضروری ہے!

واروہ

اس رباعی کے پہلے مصرع میں ”بحق“ کے لفظ کے بارے میں مجھے کچھ اشکال تھا، ایک رات میں نے خواب میں اپنے آپ کو دیکھا کہ پہلا مصرع یوں پڑھ رہا ہوں:

”الہی بحبِ بنی فاطمہ“

الحمد للہ الجھن دور ہو گئی، اور اگر یہ مصرع یوں پڑھا جائے:

”الہی بہ وِ بنی فاطمہ“

تو الفاظ قرآن کے بھی عین مطابق ہوگا!

صلی اللہ علیہ وآلہ وبارک وسلم

نقشبندی مجددی سلسلے کے عظیم شیخ حضرت میرزا مظہر جان جاناں شہیدؒ (۱۷۰۰ء..... ۱۷۸۱ء) کیا خوب فرماتے ہیں:

”ائمہ اہل بیت اطہار رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی محبت ایمان کا موجب اور تصدیق و ایقان کا سرمایہ ہے، ہمارے لیے تو ان کی محبت کے سوا اور کوئی عمل وسیلہ نجات نہیں“
پھر آپؑ نے اپنی زبان مبارک سے یہ شعر پڑھا:

”نکرد مظہرِ ما طاعتی و رفت بن خاک

نجاتِ خود بتولائے بو ترابِ گذاشت“

(مقامات مظہری: ۳۲۰)

ترجمہ: ”ہمارے مظہر نے کوئی نیکی نہیں کی اور آسودہ خاک ہو گیا، اور اپنی نجات کا معاملہ ابو تراب علیؑ کی ولا و محبت سے وابستہ کر لیا“

بالکل وہی مضمون ہے جو چند سطور پہلے گذرا:

وگر دعوتِ مرد کنی و رد قبول

من و دست و دامن آل رسولؐ ﷺ

اپنے ایک مکتوب میں رقم طراز ہیں:

”آنحضور ﷺ کے اقرباء کی محبت تمام افراد امت پر واجب ہے۔“

(مقامات مظہری: ۴۶۱)

ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

”ائمہ اہل بیتؑ سے اظہار محبت اور اصحاب کبارؑ کی یکساں تعظیم لازم ہے، اور یہ صراط مستقیم ہے جو قیامت کے دن پل صراط کی صورت میں نمودار ہوگی، جو دنیا میں اس سیدھی راہ سے منحرف نہیں ہوگا، وہ قیامت کے دن اس سے استقامت کے ساتھ گزر جائے گا۔“ (مقامات مظہری: ۳۰۰)

علامہ فیض الحسن سہارن پوریؒ (۱۸۱۶ء-۱۸۸۷ء) علوم عربیہ کے مایہ ناز استاذ تھے، برصغیر کے متعدد نامور علما آپ سے رشتہ تلمذ رکھتے ہیں۔ ”دیوان الفیض“ آپ کا مجموعہ کلام ہے۔ اس میں دوسرے قصیدے کے آخر میں حضور اکرم ﷺ سے عرض کرتے ہیں:

”خلقت مبارکاً و بعثت سمحاً

فأحسن بی علی سونى وعابى

تربت و طال ماتربت یمینى

فخذ بیدى بآل ابى تراب“

ترجمہ: آپ برکتیں لے کر پیدا ہوئے اور صاحب جود و کرم بن کر مبعوث ہوئے، سو میری بد حالی اور کوتاہی کے باوجود میرے ساتھ احسان کیجئے۔

ایک طویل مدت ہو رہی ہے کہ میرا ہاتھ تراب (خاک) آلود ہے (یعنی میں فقر و احتیاج میں مبتلا ہوں) سو آل ابی ترابؑ کے وسیلے سے میری دھکیری فرمائیے!“

یہ اشعار بھی مودت اہل بیتؑ کے اُس پاکیزہ جذبے کی ترجمانی کرتے ہیں، جس سے ہر دور میں اہل حق کے قلوب معمور و مخمور رہے!

”مجھے حسینی چادر میں کفنایا جائے“

مغل بادشاہوں میں محی الدین اورنگ زیب عالمگیرؒ کی شخصیت اس اعتبار سے نمایاں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ظاہری کمالات کے ساتھ باطنی محاسن سے بھی حظ وافر عطا فرمایا تھا۔

عہد حاضر کے اہل دل مؤرخ سید ابوالحسن علی ندویؒ کے بقول ”محی الدین عالمگیرؒ ہندوستان کا سب سے بڑا فقیہ، غیور، حامی دین و شریعت اور مجاہد مسلمان فرماں روا تھا..... اس نے اپنی شاہزادگی کے دور میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خلف الرشید، خلیفہ راشد اور ان کے علوم کے ترجمان و شارح حضرت خواجہ محمد معصومؒ سے بیعت کی تھی..... حضرت خواجہؒ اسے ”شہزادہ دین پناہ“ کے لقب سے یاد فرماتے تھے..... اس نے حضرت خواجہ سیف الدینؒ کی زیر نگرانی باقاعدہ منازل سلوک طے کیں اور اس میں آثار ذکر نمودار ہوئے۔“ (صحبتے با اہل دل: ۱۹، ۲۰)

ایسا جہاں دیدہ اور خدا رسیدہ بادشاہ اپنی بارہ وصایا میں سب سے پہلی یہ مودت بھری وصیت کرتا ہے:

”اس عاصی غرق معاصی کو حسین علیہ السلام کی تربت مطہرہ و مقدسہ کی چادر میں لپیٹا اور کفنایا جائے، کیونکہ گناہوں کے سمندروں میں ڈوبے ہوؤں کے لیے اس درگاہ مرحمت و غفران پناہ میں التجا کیے بغیر چارہ نہیں! اور اس سعادت عظمیٰ کا سامان فرزند ارجمند بادشاہ زادہ عالی جاہ کے پاس ہے اس سے لے لیا جائے“

(احکام عالمگیری: ۴۲، ۱۳۴)

ایک دوسرے مقام پر رقمطراز ہیں:

”سادات رفیع الدرجات سے محبت جزو ایمان بلکہ عین عرفان ہے اور اس جماعت سے عداوت جہنم میں داخل ہونے اور حضرت رحمان کی ناراضی کا سبب ہے۔“

(احکام عالمگیری: ۱۵۲)

اورنگ زیب عالمگیرؒ کی سادات سے مودت

محی الدین عالمگیرؒ کی سادات سے مودت کے دو واقعات نصیحت آموز ہیں۔

(۱) سید لعل نامی ایک صاحب شاہی ملازمت میں سے پشتی منصب رکھتے تھے،

شہزادہ محمد اعظم شاہ نے ان کے بارے میں اپنے والد گرامی اورنگ زیبؒ کو ناشائستہ حرکات کی شکایت کی اور یہ فرمائش کی کہ ان کی جاگیر ضبط کر کے غلام کو عطا کی جائے۔

اورنگ زیبؒ عالمگیر نے اس پر تحریر فرمایا:

”محتسب کا کام خود سنبھال لینا اور جاگیر ضبط کرنے کی درخواست کرنا پر لطف کاروائی ہے! یک پشتی جاگیر ضبط کرنا محال ہے، چہ جائیکہ سے پشتی؟ کسی کی جاگیر کسی کے کہنے سے ضبط نہیں ہوتی،

نوکری میں تو آں بابا (شہزادہ) اور سید لعل دونوں برابر ہیں لیکن شرف سیادت میں فریق ثانی ہزار مرتبہ زیادہ ہے!

صدر الصدور وہاں کے محتسب کو لکھیں کہ تحقیق کر کے مفصل رپورٹ بھیجیں۔

الحمد للہ کہ میں نے اعلیٰ حضرت (شاہ جہان) کی طرح اولاد کو اپنے اوپر مسلط نہیں کیا کہ ندامت جھیلوں“ (احکام عالمگیری: ۱۴۳)

حقیقت یہ ہے کہ اگر دل میں اہل بیتؑ کی مودت ہو تو اس کے مظاہر یقیناً ایسے ہی ہوتے ہیں، پھر محبت پدیری حدود شریعت سے تجاوز نہیں کرتی، پھر رسول اللہ ﷺ سے نسبت کا لحاظ تمام مصلحتوں سے عزیز تر ہوتا ہے!

(۲) محمد بیدار بخت شہزادہ محمد اعظم اور داراشکوہ کی بیٹی جہاں زیب بانو کا بیٹا اور

اورنگ زیب عالمگیرؒ کا لاڈلا پوتا تھا، اس کی شادی سیدہ شمس النساءؒ دختر مختار خاں سے ہوئی تھی، ایک دن رپورٹ ملی کہ شہزادہ ہمیشہ اہلیہ کے ساتھ کمال محبت و عنایت سے پیش آتا تھا، لیکن کچھ عرصہ سے اکثر ناراض رہتا ہے، چنانچہ ایک روز کہا:

”پاجی کی لڑکی کو سلاطین کے ساتھ غرور سے پیش نہیں آنا چاہیے“

شمس النساءؒ نے جواب میں کہا:

”اگر چاہیں مجھے مار ڈالیں، لیکن اب تم سے بات نہیں کروں گی“
پننانچہ اس روز سے شاہزادہ سے بات نہیں کی۔

اس اطلاع نامہ پر تحریر فرمایا:

”صبح دم مرغ چمن با گلِ نو خواستہ گفت
ناز کم کن کہ دریں باغ بے چوں تو شگفت
گل بخندید کہ از راست زنجم ولے
ہیچ عاشق خن تلخ بمعشوق نہ گفت

(ترجمہ: صبح کے وقت بلبل نے ایک نوشگفتہ پھول سے کہا: ناز کم کر کہ اس باغ میں
تجھ جیسے بہت پھول کھلے ہیں،

پھول نے ہنس کر کہا کہ مجھے سچی بات کا تو رنج نہیں، لیکن کسی عاشق نے کبھی اپنے
معشوق کو تلخ بات نہیں کہی!)

نور چشم کو واضح ہو کہ جوانی کے زمانے میں، جسے تمہارے پاجی مصاحبین کی اصطلاح میں
جوانی دیوانی کہتے ہیں، ہمیں بھی ایک شخصیت سے، جو نہایت فخر و غرور کی حامل تھی، قلبی تعلق
تھا، لیکن ہم نے تمام زندگی اس کی محبت کو نبھایا اور کبھی اُسے آزر دہ خاطر نہ ہونے دیا۔

دوسری یہ بات بھی واضح ہو کہ سادات کے ساتھ پاجی کا لفظ استعمال کرنا خود پاجی پن
ہے، اگر کوئی سید کو پاجی کہتا ہے تو وہ پاجی بن نہیں جائے گا۔

اگر محل دار اور ناظر کی رپورٹ سے اس سیدہ (شہس النساء) کی رضا مندی کا حال
معلوم نہ ہوا تو عتاب بلکہ عقاب میں گرفتار ہو جاؤ گے“ (احکام عالمگیری: ۱۴۹)
جن کے دل محبت رسول اکرم ﷺ سے لبریز ہوں، وہ گیارہویں صدی ہجری میں،
سراسر گھریلو معاملے میں نسبت سیادت کا یوں احترام کرتے ہیں!

اور جو احسان فراموش، جاہ پرست اور حکومت کے حریص ہوں، وہ وہی کچھ کرتے
ہیں، جو انہوں نے پہلی صدی ہجری میں خانوادہ نبوت کے ساتھ کیا!

برتن سے وہی پھلکتا ہے، جو اس میں ہوتا ہے!

اکابر علماء دیوبند اور موڈت اہل بیتؑ

سارے عالم پر سادات کی تعظیم واجب ہے

حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ، جو مولانا نانوتویؒ کے پوتے بھی ہیں اور ساٹھ سال دارالعلوم دیوبند کے مہتمم بھی رہے، روایت فرماتے ہیں:

”میں نے اپنے بزرگوں سے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کے متعلق سنا کہ ان کی عادات میں ادب کا لحاظ بے حد ہوتا، سادات کا کوئی نابالغ بچہ بھی آجاتا تو سر ہانہ چھوڑ کر پالکتی کی طرف بیٹھ جاتے اور فرماتے کہ دنیا مخدوم زادوں کی عزت کرتی ہے، یہ سارے عالم کے مخدوم زادے ہیں، سارے عالم پر ان کی تعظیم واجب ہے۔“ (خطبات حکیم الاسلام: ۳/۲۶۵)

میں سید زادے کے منہ میں اپنا لعاب نہیں ڈال سکتا

حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ اور جامعہ اشرفیہ، لاہور کے بانی تھے، ان کے بارے میں ان کے فرزند ارجمند حضرت مولانا عبدالرحمن اشرفیؒ روایت کرتے ہیں:

”میرے والد صاحبؒ امرتسر کی عید گاہ کے خطیب تھے، سارا شہر وہاں عید کی نماز پڑھنے کے لیے آتا تھا۔ ایک مرتبہ والد صاحبؒ نے عید کی نماز پڑھائی۔ حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور ان کے فرزند عطاء المؤمن بھی حاضر تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس عید کے موقع پر حضرت والد صاحبؒ نے یہ اشعار بار بار پڑھے:

بہر غفلت یہ تیری ہستی نہیں دیکھ، جنت اس قدر سستی نہیں
رہ گذر دنیا ہے یہ بستی نہیں جائے عیش و عشرت و مستی نہیں

ایک دن مرنا ہے آخر موت ہے

کر لے جو کرنا ہے آخر موت ہے

فکر آخرت کے بارے میں یہ ایسا مسحور کن بیان تھا کہ نماز عید کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے عرض کی: حضرت میرے بیٹے کے منہ میں اپنا لعاب ڈال دیجئے! حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا: میں کسی سید زادے کے منہ میں اپنا لعاب نہیں ڈال سکتا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے جب شدید اصرار کیا تو مجھے اچھی طرح یاد ہے، حضرت والد صاحبؒ نے اپنی زبان پر انگلی لگائی اور وہ انگلی عطاء المؤمن کے منہ میں لگادی۔ (ماہ نامہ الحسن ص: ۲۲، ستمبر ۲۰۰۳ء)

سید کی اقتدا میرا سرمایہ نجات ہے

سید مسعود علی لکھنوی ایک شاعر تھے، آزاد تخلص کرتے تھے، آل انڈیا ریڈیو مشاعرے میں بلائے جاتے تھے، جوانی میں تبلیغی جماعت سے وابستہ ہوئے، قسمت نے یادری کی، دیوبندی سلسلے کے عظیم شیخ حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ سے بیعت ہو گئے اور پھر اسی خانقاہ کے ہو رہے۔ تربیتی مراحل سے گذر کر مولانا کا سابقہ بھی شخصیت کی نہینت بنا۔ حضرت رائے پوریؒ نے انہیں نمازوں کا امام ٹھہرا لیا۔ سفر ہوتا یا حضر، بڑے بڑے علماء کی موجودگی میں پانچوں نمازوں اور نماز جمعہ میں امام سید مسعود آزاد ہی ہوتے۔

ایک مرتبہ کسی نے حضرت رائے پوریؒ سے اس بارے میں کچھ کہا تو فرمایا: ”اپنے پلے کچھ نہیں، حضور اکرم ﷺ کے نواسے کی اقتدا میں نمازیں پڑھ رہا ہوں، بس یہی میرا سرمایہ ہے۔“

بالکل وہی بات ہے جو حضرت میرزا مظہر جان جاناؒ نے فرمائی تھی:

نکرد مظہر ما طاعتی و رفت بخاک
نجات خود بتولایے بو ترابؑ گذاشت

(مجھے یہ بات ۱۱ ذوالحجہ ۱۴۲۲ھ ۳ فروری ۲۰۰۲ء منگل کے روز حضرت مولانا ظفر احمد قادری نے طائے ونڈ میں ملاقات کے دوران میں بتلائی اور انہیں ان کے شیخ مولانا جمیل احمد دہلویؒ خلیفہ حضرت رائے پوریؒ نے متعدد بار بیان کی)

مفتی اعظمؒ ذکر امامؒ پر زار و قطار رو پڑے

اب باسٹھ سال ہو رہے ہیں کہ میرے والد محترم حضرت مولانا عبداللہ مسعودؒ شوال ۱۳۶۲ھ میں مدرسہ امینیہ، دہلی میں دورہ حدیث شریف کے لیے داخل ہوئے۔ مفتی اعظم حضرت مولانا کفایت اللہؒ اس زمانے میں افتا کے ساتھ مسند حدیث پر بھی رونق افروز تھے۔ والد محترمؒ کو حضرت مفتی صاحبؒ کے ساتھ تعلق خاطر تھا، رشتہ تلمذ کے ساتھ آپؒ کی خدمت میں مصروف رہا کرتے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کا درس فقہیت و ثقاہت کا اعلیٰ نمونہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ دورانِ درس میں امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے مناقب میں کوئی حدیث آگئی تو ان کے مناقب اور مصائب کے تصور سے رو پڑے، شدت گریہ سے چہرہ چھپا لیا اور زار و قطار روتے رہے۔

یہی کیفیت میرے شیخ حضرت مولانا محمد عبدالرشید نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی تھی۔ ایک مجلس میں واقعہ کربلا کا ذکر آگیا تو سر جھکا لیا اور دیر تک جھکائے رکھا، پھر سر اٹھایا تو آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ حضرت عائشہؓ سے مروی چھ لعنتیوں والی روایت بیان کی اور فرمایا: جو شخص اتنا بدترین ظالم ہو اور جس میں لعنت کی اتنی وجوہ پائی جاتی ہوں، کیا وہ مومن ہوگا؟

تم سے تو وہ ہی اچھے

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ عصر حاضر کے نامور شیخ تھے، آپ زندگی بھرا کابر کی شفقتوں اور عنایتوں اور اصاغر کی عقیدتوں اور محبتوں کا مرکز

رہے، آخر عمر میں مدینہ طیبہ میں قیام پذیر ہو گئے تھے، وہیں انتقال ہوا اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

آپ کے خلیفہ مجاز مولانا عزیز الرحمن ایک واقعہ نقل کرتے ہیں:

”ایک دفعہ مدینہ منورہ میں خدام نے عاشورا کا روزہ رکھا، عصر کے بعد افطاری اور کھانے کے اہتمام میں مشغول تھے تو حضرتؑ نے ہمیں بلا کر پوچھا:

”آج شہداء کربلا اور حضرت حسینؑ کے لیے کیا کیا ایصالِ ثواب کیا؟“

خاموشی پر حضرتؑ نے فرمایا:

”ذوب مرو، تم سے تو وہ ہی اچھے جو کم از کم جھوٹ موٹ رو تو لیتے ہیں۔“

پھر حضرتؑ نے خود ایصالِ ثواب کیا اور اس کی بڑی مقدار تعلیم کی خاطر اظہار فرمائی۔

اس بارے میں حضرت شیخؒ کے دیگر خطوط آپ کے خلفاء اور متوسلین کے پاس موجود ہیں۔“ (اکابر کا مسلک و مشرب: ۱۱)

اہل بیتؑ کا جوتا میرا تاج ہے

حضرت مولانا محمد اجمل خانؒ قریبی عہد کے نامور خطیب تھے، آپ اپنے ایک خطاب میں، جس کی ریکارڈنگ محفوظ ہے، فرماتے ہیں:

”میں برملا کہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کے گھر والوں، آپؐ کی بیٹی اور حسنؑ و حسینؑ بلکہ ان کے غلاموں کی جوتیوں کی خاک کو سرمہ بنالیں تو حیرت کی بات نہیں، میں اللہ کی قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ ان کی جوتی مل جائے اور اپنے سر پر رکھ کر نماز پڑھوں تو یہ میرے لیے باعثِ فخر ہوگا۔“

”قرآن مجید نے حضرت ایوبؑ کی شان میں فرمایا ہے:

”إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ“ (ص: ۴۴)

ترجمہ: ”ہم نے اسے نہایت صابر پایا، خوب بندہ تھا! بے شک وہ بڑا ہی رجوع کرنے والا تھا۔“

قرآن واقعہ کربلا سے پہلے نازل ہو چکا تھا، اگر بعد میں نازل ہوتا یقیناً امام حسینؑ کی شان میں بھی یہی فرماتا۔“

ان حکایات سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ بانی دارالعلوم دیوبند سے لے کر عصر حاضر تک ہمارے تمام اسلاف مودتِ اہل بیتؑ میں ڈوبے ہوئے تھے اور قدم قدم پر حرمتِ سادات کا لحاظ رکھتے تھے۔

پس دیوبندی کے لیے ضروری ہے کہ

اہل بیتؑ کی مودت سے سرشار ہو
شہداء کربلا کی حرمت کا پاسدار ہو
اور گستاخان اہل بیتؑ سے بیزار ہو

اکابر علماء دیوبند نسبتِ اہل بیتؑ کے حامل تھے

مولانا عبید اللہ انورؒ نے مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے آخری سفر دیوبند کا حال قلم بند فرمایا ہے۔ مولانا انورؒ کا یہ مضمون جنوری ۸۴ء کی ایک نشست میں پڑھا گیا پھر ”خدام الدین“ میں شائع ہوا۔ مولانا لکھتے ہیں کہ دیوبند میں مولانا سندھیؒ بڑے اشتیاق اور اہتمام سے حضرت میاں اصغر حسین دیوبندیؒ سے ملنے گئے، دورانِ ملاقات میں دونوں کے مخدوم شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کا تذکرہ غالب رہا، اس ضمن میں مولانا سندھیؒ نے فرمایا:

”حضرت شیخ الہندؒ کو مولانا محمد قاسمؒ (بانی دارالعلوم دیوبند) سے جو نسبت حاصل ہوئی، اس نسبت کو امام ولی اللہ دہلویؒ اپنی کتابوں میں نسبتِ اہل بیتؑ کا نام

دیتے ہیں، اور یہی نسبت اہل بیتؑ حضرت شیخ الہندؒ سے مولانا سید حسین احمد مدنی کو حاصل ہے۔ (”خدام الدین“ لاہور، امام انقلاب نمبر: ۳۷، ۳۸)

چھوٹے منہ سے بڑی بات نکل رہی ہے لیکن بڑائی کے جذبے سے نہیں، صرف ’قافیہ گل‘ ہونے کے شوق سے، اور بات بھی اپنی نہیں ایک بزرگ کی ہے جو انہوں نے کسی اچھے وقت میں مجھے فرمائی تھی کہ ”تمہیں نسبت اہل بیتؑ حاصل ہے“
 فالحمد لله علی ذلک۔ اللہ تعالیٰ اس کی حقیقت نصیب فرمائے۔

ائمہ اہل بیتؑ راہ صدق و صفا میں بھی امام ہیں

حضرت سید ابوالحسن علی ہجویریؒ المعروف بہ داتا گنج بخش (۷۶۵ھ) اولیاء کاملین میں بلند مقام رکھتے ہیں، آپ کی شہرہ آفاق تصنیف ”کشف المحجوب“ آج بھی اہل طلب کے لیے چشمہ فیض ہے، اس کتاب میں آپؑ نے راہ صدق و صفا کے اوصاف اور اہل صدق و صفا کے احوال بیان فرمائے ہیں۔

اہل بیتؑ کے تذکرے میں ارشاد فرماتے ہیں:

”رسول اللہ ﷺ کے اہل بیتؑ تقدس ازلی میں مخصوص تھے، ہر ایک کو تصوف میں کمال حاصل تھا اور سب اہل تصوف کے سردار تھے۔“ (کشف المحجوب: ۱۳۵)

”ابوالحسن علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ برادر مصطفیٰؐ، غواص بحر بلا، سونختہ آتش ولا اور تمام اولیاء و اصفیاء کے پیشوا ہیں، آپؑ کو تصوف میں شان عظیم اور مرتبہ بلند حاصل تھا، اصول حقیقت میں اس قدر باریک ہیں اور نکتہ رس تھے کہ حضرت جنیدؒ نے ان کی نسبت کہا:

”شیخنا فی الاصول والبلاء علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ“

”اصول (علم تصوف) اور بلا کشی (معاملت) میں ہمارے پیر علی مرتضیٰؑ ہیں“

”اہل تصوف حقائق عبارات، دقائق اشارات، تجرید دنیا و آخرت اور نظارہ تقدیر حق کے معاملے میں حضرت علیؑ کی پیروی کرتے ہیں“..... (کشف المحجوب: ۱۳۵)

”امام حسنؑ جگر بند مصطفیٰؐ، ریحان دل مرتضیٰؑ اور نور چشم زہراؑ ہیں، آپؑ طریقت میں

گہری نظر رکھتے تھے، اس موضوع پر آپ کے دقیق نکات بکثرت ہیں۔“

(کشف المحجوب: ۱۳۵)

مکتوب حسن بنام حسنؑ

سلاسل طریقت میں خواجہ حسن بھریؒ کا مرتبہ محتاج بیان نہیں، جب فرقہ قدریہ نے زور پکڑا اور مسئلہ تقدیر میں لوگ الجھنے لگے تو خواجہ حسن بھریؒ نے امام حسنؑ کی خدمت میں عریضہ لکھا، ہم اس مکتوب گرامی کو صرف یہ بات ظاہر کرنے کے لیے نقل کر رہے ہیں کہ قرونِ خیر میں بلند مرتبت اہل خیر کی نگاہوں میں اہل بیتؑ کا کیا مقام و مرتبہ تھا؟ اور اہل علم کس طرح اپنی علمی اور روحانی پریشانیوں میں ائمہ اہل بیتؑ سے مراجعت کرتے تھے؟ (اصل مکتوب عربی میں ہے، ہم اس کا ترجمہ لکھ رہے ہیں)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فرزند رسول اللہ!

قرار نگاہ رسول اللہ!

السلام علیک ورحمة اللہ وبرکاتہ

ازاں بعد (امت میں) آپؐ گروہ بنی ہاشم کی وہی حیثیت ہے جو گہرے سمندر میں رواں کشتیوں اور گھٹا ٹوپ اندھیروں میں چراغوں کی ہوتی ہے، آپؐ لوگ راہِ ہدایت کے نشانات ہیں اور ایسے رہنما ہیں کہ جو ان کی پیروی کرے، نجات پا جائے، آپؐ لوگ کشتیِ نوح کی مانند ہیں، جو اہل ایمان کا ٹھکانہ ہے اور اس میں سوار ہونے والے نجات پاتے ہیں،

فرزند رسول اللہ!

مسئلہ تقدیر کے بارے میں ہم حیران ہیں اور جبر و اختیار کے حوالے سے ہمارے درمیان اختلاف واقع ہوا ہے، تو اس سلسلے میں آپؐ کی کیا رائے ہے؟ اپنی پختہ رائے سے ہمیں آگاہ فرمائیے۔ آپؐ لوگ (آیت قرآنی) ”ذریۃ بعضہا من بعض“ (ذریۃ انبیاء ہے کہ ایک دوسرے کی نسل سے ہے) آل عمران: ۳۳ کا

مصدق ہیں، آپ کے پاس اللہ کا عطا فرمودہ علم ہے، اللہ آپ (کی برگزیدگی اور پاکیزگی) کا گواہ ہے اور آپ لوگوں کے سامنے اللہ (کی عظمت و کبریائی) کے گواہ ہو، والسلام علیک“ (کشف المحجوب: ۱۳۵)

امام حسینؑ

”اس جماعت (صدق و صفا) میں شامل ہیں چراغ خاندانِ مصطفوی، جملہ تعلقات سے مجرد، اپنے زمانے کے سردار ابو عبد اللہ الحسین بن علی رضی اللہ عنہم، محقق ولی اللہ، قبلہ اہل صفا و قلیل کربلا، اہل تصوف ان کی درستی حال پر متفق ہیں، جب تک حق ظاہر تھا آپ متابعت حق میں مصروف رہے اور جب حق مفقود ہوا تو شمشیر بدست میدان میں نکل آئے اور خدا کی راہ میں سرقربان کیے بغیر آرام نہ لیا، پیغمبر ﷺ نے آپ کو متعدد نوازشات سے سرفراز کیا۔“ (کشف المحجوب: ۱۳۷)

حضرت داتا گنج بخشؒ نے یہ بات خوب نقل کی کہ ”اہل تصوف امام حسینؑ کی درستی حال پر متفق ہیں“ سچ تو یہ ہے کہ جن لوگوں سے خود اللہ نے رجس دور کر کے انہیں پاک صاف کر دیا ہو، اہل تصوف ان کی درستی حال پر کیوں متفق نہ ہوں؟

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اگر حب جاہ اور حب مال رجس ہے..... اور یقیناً ہے..... تو اللہ تعالیٰ نے یہ رجس ان حضرات اہل بیتؑ سے دور کر دیا ہے، لیکن کچھ لوگ آج بھی امام حسینؑ پر ایسے گھٹیا الزام لگانے سے نہیں چوکتے۔

آج اگر یہ کہا جائے کہ سید احمد شہیدؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ، حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا محمود حسنؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مفتی کفایت اللہؒ، مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ، سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مفتی محمودؒ، مولانا غلام غوث ہزارویؒ، مولانا غلام اللہ خانؒ، مولانا محمد منظور نعمانیؒ، قائدین افغانستان اور دوسرے وہ تمام زعماء جنہوں نے نفاذ اسلام کی

جدوجہد کی اور دین کی راہ میں قربانیاں دیں، ان سب لوگوں کی تگ و دو کا مقصود اقتدار و اختیار اور مال و منال کا حصول تھا، تو مجھے یقین ہے کہ یہ لوگ پنجے جھاڑ کر ایسے قاتل کے پیچھے پڑ جائیں گے اور اُسے دائرہ اسلام سے باہر دھکیلنے تک دم نہیں لیں گے حالانکہ ان مذکورہ بالا بزرگوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ نے شہادتیں دی ہوں اور اہل تصوف جس کی درستی حال پر متفق ہوں، لیکن امام حسنؑ، امام حسینؑ کے بارے میں ایسا سوچتے اور بولتے ہوئے ان کا ایمان نہ جانے کہاں چلا جاتا ہے؟ اور یہ ایسی خرافات ٹھنڈے پیٹوں کیسے برداشت کر لیتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ انسان کا ظاہری رویہ اس کی باطنی کیفیت کو ظاہر کر ہی دیتا ہے!

امام زین العابدینؑ

”اسی جماعت (صدق و صفا) میں داخل ہیں وارثِ نبوت، چراغِ امت، سید مظلوم، امام مرحوم، سراج العارفین، زین العابدین علی بن حسین بن علی رضی اللہ عنہم، اپنے زمانے میں سب سے زیادہ مکرم اور عابد تھے، اظہارِ حقیقت اور دقیقہ گوئی میں مشہور تھے۔“

”مذکور ہے کہ جب میدانِ کربلا میں حسینؑ ابن علیؑ کو فرزندوں سمیت شہید کر دیا گیا تو حضرت زین العابدین کے سوا مستورات کا کوئی پرسان حال نہ تھا، وہ بھی بیمار تھے، حضرت حسینؑ ان کو علی اصغر کہا کرتے تھے، جب ان کو ننگے اونٹوں پر چڑھا کر یزید (اُس پر واقع ہو جس کا وہ مستحق ہے، اللہ اسے رسوا کرے) کے رو برو پیش کیا گیا تو ان میں سے ایک نے آپ کو کہا:

علی! اہل بیتِ رحمت! یہ کیسی صبح ہے؟

فرمایا: ہماری صبح ہماری قوم کے ہاتھوں میں ایسی ہے جیسی قومِ موسیٰ کی صبح فرعون اور اس کی قوم کے ہاتھوں میں تھی کہ ان کے مردوں کو قتل کرتے تھے اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھتے تھے، ہمارے لیے صبح و شام کی تفریق ختم ہو چکی ہے، یہ ہماری مصیبت کی حقیقت ہے۔“

(کشف المحجوب: ۱۳۹)

امام باقرؑ

”اہل بیت میں معاملات کی حجت، ارباب مشاہدہ کی برہان، اولاد نبی میں امام، نسل علی میں برگزیدہ، ابو جعفر محمد بن علی بن حسین بن علی رضی اللہ عنہم ہیں، آپ کو امام باقر بھی کہتے ہیں، علمی دقائق اور کتاب حق میں لطیف اشارات آپ سے مخصوص ہیں، آپ کی کرامات مشہور، نشانات روشن اور دلائل واضح ہیں۔

کہتے ہیں ایک بادشاہ وقت نے آپ کو شہید کرنے کا ارادہ کیا اور بلوا بھیجا، جب آپ تشریف لائے تو اس نے معذرت کی، تحائف پیش کیے اور نہایت اچھے طریقے سے رخصت کیا،

لوگوں نے پوچھا: تو تو درپے قتل تھا، یہ کیا ہوا؟

بادشاہ نے جواب دیا: جب وہ میرے پاس آئے تو ان کے دائیں بائیں دو شیر تھے اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اگر میں نے ہاتھ اٹھایا تو وہ مجھے چیر ڈالیں گے۔“

(کشف المحجوب: ۱۴۱)

ربانی حفاظت کا اس سے ملتا جلتا واقعہ پہلے بھی پیش آچکا ہے۔

ابن ہشام لکھتے ہیں (ترجمہ) ”قریشی سردار جب رسول اللہ ﷺ کو اپنے دام میں لانے میں ناکام رہے تو بہت شپٹائے۔ ابو جہل نے کہا: کل جب یہ نماز میں سجدہ کریں گے تو میں ایک بھاری پتھر مار کر ان کا سر پاش پاش کر دوں گا، پھر جو ہوگا، دیکھا جائے گا..... اگلے دن رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ نماز شروع کی، سجدے میں گئے تو ابو جہل ایک بھاری پتھر اٹھا کر آگے بڑھا، قریب پہنچا تو اچانک واپس بھاگا، رنگ اڑا ہوا تھا، رعب طاری تھا، ہاتھ پتھر پر چپکے ہوئے تھے، یہاں تک کہ پتھر اس کے ہاتھوں سے گر گیا۔

قریشی سردار اس کی طرف لپکے، پوچھا: ابوالحکم! کیا ہوا؟

بولاً: حسب ارادہ میں ان کی طرف بڑھا، لیکن جب قریب ہوا تو ایک ز اونٹ آڑے آ گیا، واللہ میں نے کسی اونٹ کی ویسی گردن، ویسا سر اور ویسے دانت نہیں دیکھے، وہ تو مجھے کھانے ہی لگا تھا!“ (تہذیب سیرت ابن ہشام: ۶۸)

بڑی شان ہے اُس کی جس نے رسول کی طرح آل رسول کی مدد فرمائی۔

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

لوگ کہتے ہیں کہ اہل بیتؑ کا قافلہ جب دمشق پہنچا تو یزید نے بہت اکرام کیا، اظہار ندامت کیا، باہم صلح صفائی ہو گئی، آخر کو سب آپس میں رشتہ دار تھے!

یہ من گھڑت باتیں یزید کے جرم کی سنگینی کو کم کرنے کے لیے کی جاتی ہیں اور سادہ لوح لوگ اس سے دھوکہ میں آ جاتے ہیں۔

امام باقرؑ کی ایک مناجات اس دھوکے کی قلعی کھولتی ہے۔

”آپ کے خادم خاص کی روایت ہے کہ کچھ رات گئے آپ اوراد سے فارغ ہو کر بلند آواز سے یوں مناجات کرتے:

”میرے اللہ! میرے مولا!

رات آ گئی، دنیا والوں کی بادشاہی ختم ہوئی،

آسمان پر تارے نکل آئے،

خلقت خواب غفلت میں کھو گئی،

آنکھیں بند ہو گئیں،

آوازیں گم ہو گئیں،

لوگ اہل دنیا کی بارگاہوں سے چل دیے،

بنو امیہ بستر استراحت میں چلے گئے

اپنے خزانے محفوظ کر لیے،

اپنے دروازے بند کر لیے،
نگہبان اور پہرے دار مقرر ہو چکے،
حاجت مند ان کے دروازے چھوڑ کر جا چکے،
لیکن باری تعالیٰ!

تو زندہ اور قائم ہے
دیکھنے والا اور جاننے والا ہے
سونا اور اونگھنا تیری ذات پاک سے بعید ہے،
جو یہ نہیں سمجھتا، وہ کسی نعمت کے قابل نہیں،

اے خدا

ایک چیز تجھے دوسری چیز سے غافل نہیں کرتی
تیری بقا شب و روز کے تغیر سے بالاتر ہے،
جو دعا کرے تیرے دروازے اس پر کھل جاتے ہیں
تیری توصیف کرنے والے پر تیرے خزانے کھلے ہیں،
جو سوالی تیرے در پر آتا ہے کبھی خالی نہیں جاتا،
جو دعا کرتا ہے کبھی مایوس نہیں لوٹتا

اے خدا

جب مجھے موت اور قبر کے حساب کا خیال ہو تو کون سی مسرت مجھے اپنا سکتی ہے!
جب ملک الموت میرے سامنے ہو تو میں دنیا کی کونسی منفعت کی آرزو کر سکتا ہوں!
میں ہر چیز تیری ذات پاک سے مانگتا ہوں
تو واحد و لا شریک ہے
تیری بارگاہ میں دعا ہے کہ

بوقت مرگ سکون بے حساب عطا فرما
 اور یوم حساب راحت بے عذاب مرحمت فرما“
 آپ یہ مناجات کرتے تھے اور روتے تھے،
 ایک رات خادم نے پوچھا:
 میرے اور میرے باپ دادا کے سردار!
 یہ اشک باری کب تک؟
 فرمایا:

”اے دوست! یعقوبؑ کا ایک یوسفؑ گم ہو گیا تھا، وہ اس قدر روئے کہ بصارت جاتی
 رہی اور آنکھیں سفید ہو گئیں، میرے تو اٹھارہ اقربا کربلا میں گم ہو گئے، میں غم میں
 یعقوبؑ سے کم نہیں کہ اپنے اقارب کے فراق میں میری آنکھیں سفید نہ ہو جائیں!“
 (کشف المحجوب: ۱۴۱، ۱۴۲)

اگر تمام رنجشیں ختم ہو گئی تھیں تو شب کے سناٹوں میں یہ درد بھری مناجاتیں کیسی؟
 سکوت کا معنی صلح نہیں ہوتا!
 انداز بدلنے سے موقف نہیں بدلتا!

امام جعفر صادقؑ

اسی جماعت (صدق و صفا) میں شامل ہیں یوسف سنت، جمال طریقت، غواص معرفت، زینت تصوف ابو محمد جعفر بن محمد بن علی بن حسین بن علی رضی اللہ عنہم، بلند حال اور نیک سیرت تھے، ان کا ظاہر آراستہ اور باطن پیراستہ تھا، تمام علوم میں انہوں نے حسین اشارات چھوڑے ہیں، مشائخ کرام میں دقیق کلام اور وقوف معانی کے لیے مشہور ہیں۔

”حکایت ہے کہ داؤد طائی امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

فرزند رسول! مجھے کوئی نصیحت فرمائیے، میرا دل سیاہ ہو گیا ہے!

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

آپ اپنے زمانے کے زاہد ہیں، میری نصیحت کی کیا ضرورت ہے؟

داؤد طائی نے عرض کیا:

آپ فرزند رسول ﷺ ہیں، باری تعالیٰ نے آپ کو سب پر فضیلت دی ہے، سب کو نصیحت کرنا آپ کا منصب ہے۔

امام صاحبؑ نے فرمایا:

مجھے اس بات کا خوف ہے کہ حشر کے دن میرے جدا مجد ﷺ میری گرفت نہ کریں کہ میں نے حق متابعت ادا نہیں کیا، نسب سے یہ چیز درست نہیں ہوتی، اس کے لیے حسن معاملہ کی ضرورت ہے۔

داؤد طائی رو پڑے اور بولے:

اے خدا!

جس کی فطرت میں نبوت کا اثر ہو،

جس کی طبیعت میں اصول ہوں،

جس کے جدا مجد رسولؐ ہوں

جس کی جدہ محترمہ بتول ہوں

ان کے سامنے داؤد کا کیا مقام کہ اپنے حسن معاملہ پر ناز کر سکے!

”یہ بھی روایت ہے کہ ایک روز اپنے خدام میں بیٹھے ہوئے تھے، فرمایا:

آؤ! باہم عہد کریں کہ روز قیامت جسے بھی نجات نصیب ہو، وہ سب کی شفاعت کرے گا۔
خدام نے عرض کیا:

حضور فرزند رسول ﷺ کو کس کی شفاعت کی ضرورت ہے، آپ کے جدا مجد تو تمام
خلائق کے شفیع ہیں!

فرمایا:

میں اپنے افعال پر شرمسار ہوں، اپنے جدا مجد ﷺ کو کیا منہ دکھاؤں گا!“

(کشف المحجوب: ۱۴۳، ۱۴۴)

یہ ہیں سادات کرام!

سچے سادات کے حالات یونہی اجلے اجلے، خیالات اسی طرح روشن روشن اور باتیں
خوشبو خوشبو ہوتی ہیں۔

یہ حضرات درحقیقت سیادت و شرافت کا معیار ہیں، اسی لیے اولیاء و صلحا انہیں اپنا امام
مانتے ہیں۔ حضرت داتا گنج بخشؒ اتنے حالات تحریر کرنے کے بعد فرماتے ہیں ”اگر
میں سب اہل بیتؑ کا ذکر کروں اور ہر ایک کے مناقب معرض تحریر میں لاؤں تو اس
کتاب میں گنجائش ممکن نہیں۔ طریقت کو ماننے والے ہوں یا اس کا انکار کرنے والے،
اس قدر سب کے لیے کافی ہے، بشرطیکہ ان کے عقل کو ادراک کی توفیق حاصل ہو۔“

(کشف المحجوب: ۱۴۴)

پہلی صدی میں اہل بیتؑ کے ساتھ جو کچھ ہوا، اسے اہل نظر کس نظر سے دیکھتے تھے،
حضرت داتا گنج بخشؒ کی تحریر میں اس کی خبر ملتی ہے:

”خداوند عزوجل نے ہمیں ایسے دور میں پیدا کیا ہے جس میں لوگ ہوا و ہوس کو شریعت

کہتے ہیں

طلبِ جاہ، طلبِ حکومت اور تکبر کو عزت اور علم جانتے ہیں، خلق خدا سے ریاکاری کو خوف خدا گردانتے ہیں

کینہ پروری کو حلم و بردباری، لڑائی کو مناظرہ، حماقت کو عظمت، منافقت کو زہد، ہوس کو سلوک، ہذیان طبع کو معرفت، دل کی دھڑکن اور نفس کی تاویلات کو حجت، الحاد کو فقر، جود و انکار کو تزکیہ، زندقہ و بے دینی کو فنا، ترک شریعت کو طریقت اور فتنہ پردازی کو معاملت سمجھتے ہیں،

یہاں تک کہ ارباب حقیقت مغلوب ہو کر رہ گئے اور اہل باطل ہر طرف چھا گئے، جس طرح پہلے دور میں آنحضور ﷺ کے اہل بیتؑ پر آل مروان غلبہ پا گئے تھے۔“

ہر زمانے میں قطب اہل بیتؑ سے ہوتا ہے

علامہ سید محمود آلوسی بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اہل بیتؑ کو آیہ تطہیر سے سرفراز کیا ہے، اس آیت میں ”اذہاب رجس“ کا حاصل اخلاق سیئہ سے تخلیہ ہے اور ”تطہیر“ کا حاصل اخلاق حسنہ سے تخلیہ ہے۔

اہل سلوک، جانتے ہیں کہ تخلیہ اور تخلیہ ہی دوا ایسے ہو ہیں جن کی مدد سے حظیرۃ القدس کی جانب پرواز ہو سکتی ہے اور محبت و انس کے گھونسلوں میں وقوف نصیب ہو سکتا ہے، چونکہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے اہل بیتؑ کو یہ سرعطا فرمائے ہیں، اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ عبادت ظاہرہ میں شرکت کے باوجود اہل بیتؑ کے عابدین دوسرے عبادت گزاروں کی نسبت حسن اخلاق اور تزکیہ و تصفیہ میں بلند مقام رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ تمام سلاسل طریقت انہی پر منتهی ہوتے ہیں، حتیٰ کہ اولیاء کرام

کے ایک گروہ کی تورائے یہ ہے کہ ہر زمانے میں قطب انہی میں سے ہوتا ہے۔
 میں نے امام ربانی مجدد الف ثانی کے مکتوبات میں دیکھا ہے کہ ”مقام قطبیت
 بطور اصالت صرف مشہور ائمہ اہل بیتؑ کو حاصل تھا، ان کے بعد دوسروں کو بطور
 نیابت حاصل ہوا، یہاں تک کہ السید الشیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا دور آیا تو انہیں یہ
 مرتبہ بطور اصالت حاصل ہوا، پھر ان کے انتقال کے بعد جسے بھی یہ مرتبہ ملا، بطور
 نیابت ملا، پھر جب مہدیؑ آئیں گے تو بطور اصالت مرتبہ قطبیت پائیں گے،
 جیسا کہ دوسرے ائمہؑ نے پایا۔“

”ظاہر ہے کہ یہ معرفت کشف کے ذریعے ہی حاصل ہو سکتی ہے اور مجھے یہ شرف کہاں
 حاصل! البتہ میرا خیال یہ ہے کہ قطب تو دوسروں میں بھی ہو سکتا ہے، لیکن قطب
 الاقطاب صرف اہل بیتؑ میں ہوتا ہے۔“ (روح المعانی: ۲۲/۲۰، ۱۹ بہ اختصار)

اہل بیتؑ کے بارے میں علامہ آلوسیؒ کا مسلک

سورہ دھر حضرت علیؑ، حضرت فاطمہؑ کے بارے میں نازل ہوئی یا نہیں؟
 علامہ محمود آلوسیؒ اس پر بحث کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

ترجمہ: ”اگر یہ سورت ان حضرات کے بارے میں نازل نہ بھی ہوئی ہو تو بھی ان کے
 مقام و مرتبہ میں کوئی فرق نہیں پڑتا، اس لیے کہ ان کا طبقہ ابرار میں شمول نہ صرف
 امر جلی ہے بلکہ اوّلیٰ ہے، سو یہ یہ ہی ہیں،

ان کے بارے میں ایک شخص اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہے کہ علیؑ مومنین کے مولا اور
 نبی ﷺ کے وصی ہیں، فاطمہؑ عجلوہا شہ احمدی اور جزء محمدی ہیں،

رہے حسنؑ و حسینؑ! تو گلشن نبوت کی بہار اور جوانان جنت کے سردار ہیں۔

اور اس بات میں رخص کا کوئی شائبہ نہیں، بلکہ اس کے سوا جو کچھ کہا جائے، میرے

نزدیک وہ گمراہی ہے:

انا عبد الحق لا عبد الهوى

لعن الله الهوى فيمن لعن

میں بندہ حق ہوں، بندہ ہوی نہیں، ملعونوں کے ساتھ اہل ہوی پر اللہ کی لعنت ہو

نکتہ لطیفہ

سورہ دھر اس جنتی جوڑے کے بارے میں نازل ہونے کا قول مانا جائے تو اس میں ایک لطیف علمی نکتہ ہے:

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے نہایت دلکش انداز میں ابرار کے لیے جنت کی نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے اور جنتی مناظر کی حسین تصویر کشی کی ہے، لیکن ان نعمتوں میں حور عین کا ذکر نہیں، حالانکہ دوسری سورتوں میں یہ تذکرہ موجود ہے!

وجہ یہ ہے کہ یہ سورت علیؑ و فاطمہؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس میں سیدہ فاطمہؑ کی نسوانی غیرت کا لحاظ رکھتے ہوئے حور کا ذکر نہیں فرمایا کہ بتولؑ کے دل کو ٹھیس نہ پہنچے!

(روح المعانی: ۱۸۱/۲۹)

جب خود خدا خاتونِ جنت کی اتنی دلداری فرمائے تو رسول خدا فاطمہؑ کے ہوتے ہوئے علیؑ کو دوسرے نکاح سے روکیں تو اس پر تعجب کیوں ہو!

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ائمہ اہل بیتؑ ہر دور میں اہل علم و ایمان کا مرجع رہے

ابن حجر مکیؒ ”تاریخ نیشاپور“ سے نقل فرماتے ہیں:

ترجمہ: ”امام علی رضاؑ نیشاپور تشریف لائے اور بازار میں داخل ہوئے تو حافظ ابو زر عہ رازی اور حافظ محمد بن اسلم طوسی بے شمار طلبہ علم و حدیث کے ساتھ خدمت والا میں حاضر ہوئے۔ آپؑ بند پاکی میں تشریف فرما تھے۔ حافظ رازی اور حافظ طوسی دونوں نے نہایت عاجزی سے درخواست کی کہ حاضرین کو درشن دیجیے اور اپنے آبائی سلسلے سے کوئی حدیث روایت کیجئے!

آپؑ نے سواری ٹھہرانے اور خدام کو پردہ اٹھانے کا حکم دیا، خلق خدا نے آپؑ کے روئے مبارک کی زیارت سے آنکھیں ٹھنڈی کیں، آپؑ کے دو گیسو تھے، جو کندھوں پر لٹک رہے تھے، وارنگی کی کیفیت یہ تھی کہ لوگوں کی آہیں تھمتی نہ تھیں، نالہ و بُکا رکتا نہ تھا، کچھ لوگ مٹی میں لوٹ پوٹ ہو رہے تھے اور کچھ بے خودی میں سواری کے پاؤں چوم رہے تھے۔
(گویا بقول شاعر:

پڑے ہیں ترے کوچے میں لاکھوں
مجروح، مقتول، مذبوح، بے مل

آٹھویں پشت میں حسن نبوی کی جھلک کا یہ اثر تھا، تصور کیجیے خود حسن نبوی کا کیا حال ہوگا!)
علماء پکار رہے تھے: لوگو! چپ ہو جاؤ!
جب خاموشی چھا گئی تو حافظ رازی اور حافظ طوسی نے املاے حدیث کی استدعا کی۔

اس پر آپؑ یوں محور وایت ہوئے:
”مجھے حدیث بیان کی میرے ابا موسیٰ کاظم نے
اپنے ابا جعفر صادق سے

انہوں نے اپنے ابا محمد باقر سے
 انہوں نے اپنے ابا زین العابدین سے
 انہوں نے اپنے ابا حسین سے
 انہوں نے اپنے ابا علی بن ابی طالب سے
 انہوں نے فرمایا: مجھے بیان فرمایا میرے حبیب اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک رسول
 اللہ ﷺ نے

کہ مجھے جبریل نے بیان کیا

کہ میں نے رب العزت کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

”لا الہ الا اللہ میرا قلعہ ہے، جس نے یہ کلمہ پڑھا وہ میرے قلعے میں داخل ہو گیا اور

جو میرے قلعے میں داخل ہو گیا، وہ میرے عذاب سے بچ گیا“

بس آپؐ نے یہ حدیث روایت کی، پردہ گرانے کا حکم دیا اور روانہ ہو گئے۔

آپ کے تشریف لے جانے کے بعد ان لوگوں کو شمار کیا گیا، جو باقاعدہ قلم دوات لائے

اور لکھ رہے تھے، تو تقریباً بیس ہزار تھے۔ (یعنی باقی لوگ ان کے علاوہ تھے۔)

(الصواعق: ۲۰۵)

یہ واقعہ شہادت دے رہا ہے کہ ہر دور میں علماء و عوام کے دلوں پر حکومت

ائمہ اہل بیتؑ کی رہی، ظالم و جابر حکمران عوام کی گردنوں پر تو مسلط ہوتے رہے، جبر

اور خوف سے ان کی زبانیں تو خاموش رہیں، لیکن ان کا قلبی تعلق برابر اہل بیتؑ سے

رہا، جس کا اظہار وقتاً فوقتاً وہ اپنے عمل سے کرتے رہے۔

پھر دیکھیے امام علی رضاؑ نے حدیث روایت کی تو کونسی؟

لا الہ الا اللہ کی اہمیت اور فضیلت کی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ لا الہ الا اللہ پشت در پشت اہل بیتؑ کی گھٹی میں

پڑا ہوا تھا، پھر وہ ملوکیت کے سامنے کیسے سر جھکاتے! آمریت سے کیسے سمجھوتہ کرتے!

اور غور کیجئے تو ظاہر ہوگا کہ کلمہ گو مسلمانوں کی اہل بیتؑ سے محبت و عقیدت اسی کلمے کی وجہ سے تھی، کیونکہ یہ حضرات اپنے علم و عمل سے اس کلمے کے علمبردار تھے۔ حق تعالیٰ نے سچ فرمایا: ”ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات سیجعل لهم الرحمن ودا“ (مریم: ۹۶)

(ترجمہ) ”یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کرتے رہے، عنقریب رحمان ان کے لیے دلوں میں مودت پیدا فرمائے گا۔“

اس آیت کو آیت مودت کے ساتھ ملا کر پڑھیے تو یہ خوبصورت حقیقت سامنے آتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں سے اہل بیتؑ کی مودت چاہی، اللہ تعالیٰ نے مودت ایمان اور عمل صالح کی جزا قرار دی، پھر ہر دور میں خواص و عوام نے اہل بیتؑ سے والہانہ مودت کا برتاؤ رکھا تو گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے تکوینی طور پر قرآن کی تفسیر کر دی گئی کہ اہل بیتؑ ہمارے یہاں ایمان و عمل صالح کا کامل نمونہ ہیں اور ہم نے اپنے حبیب ﷺ کی مراد پوری کر دی!

نیز اس واقعہ سے مسلمانوں میں علم حدیث حاصل کرنے کا ذوق و شوق بھی ظاہر ہوتا ہے۔

اسماء اہل بیتؑ کی برکت سے جنون دور ہو جاتا ہے

امام احمد بن حنبلؒ نے مذکورہ بالا سند کے بارے میں فرمایا:

”اگر یہ سند مجنون پر پڑھی جائے تو اس کا جنون دور ہو جائے گا۔“

(الصواعق: ۲۰۵)

سوچنے کی بات ہے کہ جن مبارک ہستیوں کے اسماء سے جنون کا فور ہو جائے، کیا وہ خود مجنون تھے؟

امام اہل سنت احمد بن حنبلؒ، جن کی محبت سنی ہونے کی علامت قرار دی گئی ہے، وہ اس سند کو جنون کا علاج تجویز کریں اور آج کا نام نہاد سنی انہی نفوس قدسیہ کو مجنون سمجھے!

انا لله وانا اليه راجعون

حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات کو عجلت پسند، ناعاقبت اندیش اور جنونی کہنے والے دراصل خود مجنون ہیں۔

غضب یہ ہے کہ ان ائمہ ہدیٰ کے تذکرے کو بھی ناجائز کہا جاتا ہے اور بیان مناقب کو غیر ضروری قرار دیا جاتا ہے۔

ایک بزرگ اہل علم نے چاہا کہ یزیدیوں نے ائمہ اہل بیتؑ کے بارے میں جو شبہات اور وساوس پھیلا رکھے ہیں، ان کے ازالے کے لیے ایسا رسالہ لکھا جائے، جو اہل بیتؑ کے فضائل اور ائمہ اہل بیتؑ کے تذکرے پر مشتمل ہو۔ انہوں نے مشورے کے لیے عصر حاضر کے ایک نامور عالم، جنہیں امام اہلسنت بھی کہا جاتا ہے، کو خط لکھا۔ انہوں نے جواب میں لکھا:

”علماء عوام کے لیے اطباء کی مانند ہیں، اطباء پر فرض ہے کہ مریضوں کے حال کے مناسب علاج تجویز کریں۔

ٹی، بی اور کینسر کے مریضوں کے سامنے گھی دودھ کی فضیلت چہ معنی؟ میرے خیال میں فضائل اہل بیت کی عوام کو قطعاً ضرورت نہیں.....“

ائمہ اہل بیت کے تذکرے کو ”میں مفاسد کثیرہ قبیحہ بدیہہ کی وجہ سے ناجائز سمجھتا ہوں، بعض بزرگوں کے اس حکم سے بہت افسوس ہوا۔“

اندازہ کیجیے کہ قرونِ خیر کے امام اہلسنت ان ائمہ اہل بیتؑ کے محض اسماء کو باعث شفا قرار دیں اور ہمارے دور کے امام اہل سنت تذکرے کو بھی ناجائز سمجھیں!

سوچئے ہم کہاں تھے اور کہاں آ پہنچے ہیں!

فالی اللہ المشتکی۔

یزیدی سلوک پر مسیحیوں کا دل فگار طعنہ

”امام حسینؑ کا سر مبارک جب یزید کے پاس لایا گیا تو سبط ابن جوزیؒ کی تحقیق کے مطابق عمومی مجلس میں تو اس نے اظہار افسوس کیا اور ابن زیاد کو برا کہا، لیکن خصوصی مجلس میں سر اقدس پر چھڑی مار مار کر اپنے کینے کی آگ ٹھنڈی کی اور اس کا رنامے پر ابن زیاد کی انتہائی عزت افزائی کی اور اس سے اتنی اپنائیت کا اظہار کیا کہ اسے اپنے گھر خواتین کے پاس لے گیا۔

اتفاق سے اُن دنوں قیصر کا نمائندہ وہاں موجود تھا، اس نے سر اقدس کے ساتھ یزید کا یہ سلوک دیکھا تو تعجب سے کہا: ”ہمارے پاس خر عیسیٰ کا ایک گھر (Hoof) ہے جسے ہم نے ایک جزیرے میں ایک گرجا گھر میں حفاظت سے رکھا ہوا ہے، ہم ہر سال دور دور سے اس کی زیارت کے لیے حاضر ہوتے ہیں، اس کے لیے نذریں مانتے ہیں اور اس کی یوں تعظیم کرتے ہیں جیسے تم اپنے کعبہ کی تعظیم کرتے ہو، لیکن (اپنے نبیؐ کے بیٹے سے تمہارا سلوک دیکھ کر) میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ تم باطل پر ہو۔“ (معاذ اللہ)

وہاں موجود ایک اور ذمی نے کہا:

”میرے اور داؤدؑ کے درمیان ستر پشیتیں ہیں، اس کے باوجود یہود میری تعظیم و تکریم کرتے ہیں اور تم نے اپنے نبیؐ کا بیٹا قتل کر ڈالا؟!“ (الصواعق: ۱۹۹)

اب بھی اگر کوئی یزیدی فکر کو درست سمجھے اور اس کے سیاہ کارناموں کی وکالت کرے تو اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ

”ختم اللہ علی قلوبہم و علی سمعہم، و علی ابصارہم

(البقرہ: ۷)

غشاوة، ولہم عذاب عظیم“

امام حسینؑ..... ایک نورانی ستون

سانحہ کربلا کے بعد ”خولی بن یزید اصبحی امام حسینؑ کا سر لے کر قصر امارت گیا، لیکن دروازہ بند ہو چکا تھا، لاچار اپنے گھر آیا اور سر ایک ٹب (Tub) کے نیچے رکھ دیا، کمرے میں داخل ہوا اور اپنے بستر میں گھس گیا۔

اس کی بیوی نوار بنت مالک نے پوچھا:

کیا خبر ہے؟ تمہارے پاس کیا ہے؟

بولا: تمہارے لیے زندگی بھر آسودگی کا سامان لایا ہوں، آج تمہارے پاس

گھر میں حسینؑ کا سر ہے!

بیوی پیٹ اٹھی: ”کمبخت! لوگ سونا اور چاندی لائے اور تو رسول اللہ ﷺ کی بیٹی کے بیٹے حسینؑ کا سر لے آیا، نہیں واللہ تیرا اور میرا سر ایک کمرے میں کبھی جمع نہیں ہوں گے“

بیوی کہتی ہے: میں اپنے بستر سے اٹھی اور کمرے سے باہر نکل آئی، اس نے دوسری بیوی اسدیہ کو اپنے پاس بلا لیا اور میں بیٹھی (ادھر ادھر) دیکھنے لگی۔

واللہ میں نے دیکھا کہ آسمان سے اس ٹب تک مسلسل چمکتے نور کا ایک ستون سا بنا ہوا ہے اور میں نے دیکھا کہ کچھ سفید پرندے اس ٹب کے گرد پھڑ پھڑا رہے ہیں اور یہ منظر مسلسل تھا۔“ (الحسن والحسین: ۱۳۵)

شہادت کے بعد امام حسینؑ کے سر مبارک پر نور آپؑ کے موقف کی غیبی تصدیق ہے اور اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ مسئلہ خلافت میں ہدایت کے نورانی ستون امام حسینؑ ہیں۔

یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے جس سے اس روایت کی تائید ہوتی ہے۔ طالب علمی کے باقاعدہ دور میں مجھے کچھ عرصہ ایک ولی اللہ کی خدمت کی

سعادت حاصل رہی۔ نقشبندی سلسلے سے تعلق رکھتے تھے، امی تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے علم و فہم سے بہرہ مند فرمایا ہوا تھا

ایک مرتبہ دوران گفتگو میں فرمایا:

”میں نے لاہور میں حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار مبارک پر مراقبہ کیا تو دیکھا بندھا ہوا ایک نور ہے، جو آسمان سے سیدھا حضرت کے مزار پر پڑ رہا ہے۔“
قرن حاضر میں ایک سید کے مزار کا یہ حال ہے تو قرن اول میں سید الساداتؒ کا کیا حال ہوگا!

حقیقت میں یہ اہل حق کے باطن کا نور ہے، جسے اللہ تعالیٰ کبھی ظاہر فرما دیتا ہے۔
عجیب بات ہے کہ مشاہدہ حق کا منظر ایک جیسا ہے اوپر روایت میں جس حقیقت کو نورانی ستون سے تعبیر کیا گیا، امی بزرگ نے اسی حقیقت کو اپنی سادہ زبان میں ”بندھے ہوئے نور“ یا ”نور کی لاٹ“ سے بیان فرمایا۔
معلوم ہوا کہ حقیقت ہر دور میں ایک ہی رہتی ہے، اگرچہ انداز بیان بدلتے رہتے ہیں!

امام حسینؑ کے سر مبارک پر نور صرف کوفہ ہی میں نہیں، دمشق کے راستے میں بھی رہا۔

اس کے لیے آئندہ روایت ملاحظہ فرمائیے!

سر مبارک کے احترام کا صلہ

”امام حسینؑ کا سر اقدس جب کوفہ سے دمشق لایا جا رہا تھا، راستے میں جہاں پڑاؤ ہوتا، پہرے دار سر اقدس کو ایک نیزے پر چڑھا دیتے اور پہرہ دیتے۔

ایک مقام پر کسی راہب نے یہ دیکھا تو پوچھا: یہ کس کا سر ہے؟

بتلایا گیا تو اُس نے کہا: تم بہت برے لوگ ہو، یوں کرو کہ دس ہزار دینار

لے لو اور آج رات یہ سر مجھے اپنے پاس رکھنے کی اجازت دے دو۔

انہوں نے کہا: ٹھیک ہے۔

راہب وہ سر گر جا گھر لے گیا، اُسے غسل دیا، خوشبو لگائی، اور آسمان کے رُخ پر اپنی گود میں رکھ لیا اور صبح تک بیٹھا روتا رہا، اس دوران میں اس نے دیکھا کہ سر مبارک سے ایک نور پھوٹا اور آسمان کی طرف بلند ہوا۔

یہ کرامت دیکھ کر اُس نے گر جا گھر اور اس کی سہولتیں چھوڑ دیں، مسلمان ہو گیا اور باقی زندگی اہل بیتؑ کی خدمت میں بسر کر دی۔ (الصواعق: ۱۹۹)

آنکھیں کھلی ہوں تو خواہ عیسائی ہو، نور نظر آ جاتا ہے، اور اندھا کیا دیکھے، خواہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو؟

راہب نے سراقہ کا احترام کیا، اللہ تعالیٰ نے ایمان کی دولت عطا فرمائی، اور جن لوگوں نے توہین کی، یقیناً وہ ایمان سے محروم ہوئے۔

دُنیا رہی نہ دین

”ان مذکورہ بالا پھرے داروں کے پاس بہت سے دینار تھے، جو انہوں نے حسینی لشکر سے لوٹے تھے، ایک پڑاؤ پر انہوں نے تقسیم کے لیے تھیلیاں کھولیں تو دیکھا کہ سب دینار ٹھیکریاں بن چکے ہیں اور ہر ٹھیکری پر ایک جانب لکھا ہے:

”ولا تحسبن الله غافلاً عما يعمل الظالمون“ (ابراہیم: ۴۲)

(ترجمہ) ”تو ہرگز خیال نہ کر کہ اللہ ظالموں کے کرتوتوں سے غافل ہے۔“

اور دوسری جانب یہ نقش ہے:

”وسيعلم الذين ظلموا اي منقلب ينقلبون“ (الشعراء: ۲۲۷)

(ترجمہ) ”اور ظلم کرنے والوں کو عنقریب پتہ چل جائے گا کہ کس کروٹ

(الصواعق: ۱۹۹)

الٹتے ہیں۔“

شاہ ولی اللہؒ کے حکیمانہ علوم امام حسنؑ اور امام حسینؑ کا فیض ہیں

حضرت شاہ ولی اللہؒ (۱۱۱۴ھ-۱۱۷۶ھ) کو برصغیر میں جس حکمت و استقامت کے ساتھ خدمت دین کی توفیق ہوئی، اس کی مثال نہیں ملتی۔ آپ کے بیان کردہ دینی اسرار و حکم دور جدید کے عقلیت پسند ذہن کے لیے وجہ تسلی ہیں، آپ کے سیاسی افکار آج بھی اسلامی انقلاب برپا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور آپ کے بعد آنے والے اسلامی زعماء حکما بھی آپ کے خوشہ چیں ہیں، اس لیے آپ بجا طور پر مسند الہند ہیں۔

آپ کو علم و حکمت کا یہ خزانہ کہاں سے حاصل ہوا؟

اس کا سراغ ”فیوض الحرمین“ سے ملتا ہے۔ ۱۱۴۳ھ میں آپ حرمین شریفین کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے اور تقریباً دو سال وہاں قیام پذیر رہے۔ اس دوران میں آپ کو جو روحانی مشاہدات ہوئے، انہیں آپ نے ”فیوض الحرمین“ کے نام سے قلمبند کیا ہے۔ اس میں چھٹا مشاہدہ یہ بیان فرمایا ہے:

”۱۱۴۴ھ ماہ صفر کی دسویں تاریخ کو میں نے مکہ معظمہ میں خواب میں دیکھا کہ حسن اور حسین رضی اللہ عنہما میرے گھر تشریف لائے ہیں، حضرت حسنؑ کے ہاتھ میں ایک قلم ہے، جس کی نوک ٹوٹی ہوئی ہے، انہوں نے میری طرف ہاتھ بڑھایا تا کہ یہ قلم مجھے عطا کریں، اس کے ساتھ فرمایا یہ میرے نانا رسول اللہ ﷺ کا قلم ہے، اس کے بعد انہوں نے قدرے توقف کیا اور فرمانے لگے کہ ذرا ٹھہر جاؤ تا کہ حسینؑ اس قلم کو ٹھیک کر دیں، کیونکہ اب یہ قلم ویسا نہیں رہا، جیسا کہ پہلے تھا، چنانچہ حضرت حسینؑ نے ان سے یہ قلم لیا اور اسے ٹھیک کر کے مجھے عطا فرمایا، مجھے اس سے بے حد خوشی ہوئی۔

اس کے بعد ایک چادر لائی گئی، جس میں سبز اور سفید رنگ کی دھاریاں تھیں، یہ چادر حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ کے سامنے رکھی گئی، حضرت حسینؑ نے یہ چادر اٹھائی اور فرمایا کہ یہ چادر میرے نانا رسول اللہ ﷺ کی ہے، اس کے بعد انہوں نے یہ چادر مجھے اوڑھائی، میں نے تعظیم و احترام کے خیال سے اوڑھنے کے

بجائے اسے اپنے سر پر رکھ لیا اور اس نعمت کے شکر میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرنے لگا، اس کے بعد یکبارگی میری آنکھ کھل گئی۔“ (فیوض الحرمین: ۱۱۴)

اس خواب میں قلم نبوی علم و حکمت سے عبارت ہے، جو امام حسنؑ نے آپؐ کو دینے کا فیصلہ کیا۔

شاہ ولی اللہؒ کے دور میں نفس پرستوں نے دینی علوم کو دنیا طلبی کا ذریعہ بنا رکھا تھا، اس لیے قلم کی نوک ٹوٹی ہوئی نظر آئی۔

پھر امام حسینؑ نے قلم لگا کر یہ قلم آپؐ کو عطا فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ شاہ ولی اللہؒ کی اصلاحی اور تجدیدی شان دراصل امام حسینؑ کا فیض ہے۔

نیز اس مشاہدے میں یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ امام حسنؑ نے قلم کی اصلاح خود نہیں فرمائی، بلکہ اصلاح کے لیے امام حسینؑ کو دیا، اس سے معلوم ہوا کہ امام حسینؑ کی شخصیت پر اصلاحی اور تجدیدی رنگ غالب تھا، چنانچہ آپؐ کی حیات مقدسہ اس کی شہادت دیتی ہے۔

چادر مبارک عبارت ہے سایہ رحمت و شفقت سے، گویا شاہ ولی اللہؒ کو سرور دو عالم ﷺ کا سایہ رحمت حاصل ہوا اور امام حسینؑ کے ذریعے حاصل ہوا۔

پھر امام حسینؑ نے تو چادر آپؐ کو اوڑھائی، لیکن آپؐ نے ازراہ تعظیم اسے لپیٹ کر سر پر رکھ لیا، گویا آپؐ نے اپنے آپ کو امام حسینؑ کی سرپرستی میں دے دیا۔

اس روحانی مشاہدے سے یہ واضح ہو گیا کہ شاہ ولی اللہؒ کے حکیمانہ علوم اور انقلابی افکار امام حسینؑ کا فیض ہیں۔

طرفہ تماشا ہے کہ آج کا نام نہاد انقلابی شاہ ولی اللہؒ کے تو گن گاتا ہے لیکن امام حسینؑ کی انقلابی اور اجتہادی مساعی کا انکار کرتا ہے! غالباً یہی وجہ ہے کہ اسلامی انقلاب کی کوششیں بار آور نہیں ہو رہی ہیں۔

اسلامی نظام اور خلافت راشدہ کی منزل پانے کے لیے حسینؑ کی امامت و قیادت کو تسلیم کرنا پڑے گا، ورنہ یونہی حیران و سرگرداں گھومتے رہیں گے۔

سید احمد شہیدؒ کی ولایت و عزیمت بھی اُنہی کا عطیہ ہے

امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہیدؒ (۱۲۰۱ھ..... ۱۲۳۶ھ) اپنی صدی کے مجدد اور عزم و عزیمت کے نشان تھے، لاکھوں انسانوں کو آپؑ سے ہدایت ملی اور سرزمین ہند آپؑ کے ولولہ جہاد سے گونج اٹھی۔

آپؑ کو ولایت و عزیمت کا یہ مقام کہاں سے حاصل ہوا؟
حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ یہ راز کھولتے ہیں:

”ایک دن جناب ولایت مآب علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ اور جناب سیدۃ النساء فاطمہ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو خواب میں دیکھا۔ پس جناب علی مرتضیٰ نے آپؑ کو اپنے دست مبارک سے غسل دیا اور آپؑ کے بدن کو خوب اچھی طرح سے مل کر دھویا، جس طرح والدین اپنے بچوں کو نہلاتے دھلاتے ہیں، پھر جناب حضرت فاطمہ الزہراءؑ نے ایک نہایت نفیس لباس اپنے دست مبارک سے آپؑ کو پہنایا۔ پس اس واقعہ کے سبب سے کمالات طریق نبوت نہایت جلوہ گر ہوئے اور مقبولیت ازلی جو کہ ازل الازل میں مخفی تھی، منصفہ ظہور پر آ گئی.....“

(خاتمہ صراط مستقیم)

آپؑ کے حال پر اہل بیتؑ کی یہ شفقت و عنایت مسلسل رہی:

”سفر حج میں مدینہ منورہ پہنچنے سے دو رات پہلے آپؑ کی طبیعت سخت ناساز تھی، بخار اور درد سر کی شدت تھی، رات کو آپؑ نے خواب میں دیکھا کہ آنحضرت ﷺ حضرت علیؑ، حضرت فاطمہؑ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم تشریف لائے ہیں، اور ہر ایک نے آپؑ کے سینے پر ہاتھ رکھا، تشفی اور تسلی اور مختلف بشارتیں دیں۔“

(تاریخ دعوت و عزیمت: ۳۷۲/۶)

تمام سلاسلِ طریقت ائمہ اہل بیتؑ کا فیض ہیں

پوری دنیا میں تصوف کے چار سلسلے زیادہ پائے جاتے ہیں:

چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ، سہروردیہ،

ان سلاسل سے وابستہ اولیاء نے ہر دور میں اسلام کی حفاظت و اشاعت کے

لیے عظیم خدمات انجام دیں، آج بھی اہل اسلام اپنی روحانی اصلاح کے لیے انہی سلسلوں سے منسلک ہوتے ہیں۔

ان روحانی نہروں کا منبع کیا ہے؟

شاہ ولی اللہؒ ”فیوض الحرمین“ ص: ۱۹۹ پر اپنا بتیسواں مشاہدہ بیان فرماتے ہیں:

”میں نے ائمہ اہل بیت رضوان اللہ علیہم کی قبور کی طرف توجہ کی تو میں نے

اُن کا ایک خاص طریقہ دیکھا، اور اُن کا یہی طریقہ اولیا کے طریقوں کی اصل

اور بنیاد ہے..... ائمہ اہل بیتؑ کا طریقہ نسبت ”یادداشت“ کی طرف التفات سے

عبارت ہے.....“

اس کے بعد شاہ صاحبؒ نے اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے، جو دقیق ہے۔

البتہ دوسرے مقام پر نسبت یادداشت کی یہ وضاحت مذکور ہے: ”یادداشت عبارت

ہے ذات واجب الوجود کی طرف خالص توجہ کرنے سے، ایسی توجہ جو الفاظ اور تخیلات

سے مجرد ہو۔“ (فیوض الحرمین: ص ۸۱)

سے مجرد ہو۔“

مسئلہ تفصیل کا حکیمانہ حل

مسئلہ تفصیل شروع ہی سے علماء و صوفیاء کے درمیان زیر بحث چلا آ رہا ہے، امام شاہ ولی اللہ فیوض الحرمین میں اپنے بانیسویں مشاہدے میں اس کا حکیمانہ حل پیش فرماتے ہیں:

”حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کس اعتبار سے افضل ہیں؟ باوجود اس کے کہ حضرت علیؑ اس امت کے پہلے صوفی، پہلے مجذوب اور پہلے عارف ہیں، یہ کمالات سوائے ان کی ذات کے، اور کسی میں نہیں ہیں، اور اگر تھوڑے سے کسی میں ہیں بھی تو وہ محض بنی ﷺ کے طفیلی کی حیثیت سے۔ میں نے یہ سوال رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کیا تو مجھے بتایا گیا کہ آپؐ کے نزدیک فضیلت کلی کا مدار امور نبوت پر ہے، جیسے علم کی اشاعت، لوگوں سے دین کی اطاعت اور اسی طرح کے امور جو نبوت سے تعلق رکھتے ہیں..... اور وہ فضیلت جس کا مرجع ولایت یعنی جذب اور فنا ہے، تو یہ ایک جزئی فضیلت ہے، اور ایک اعتبار سے یہ فضیلت کم درجے کی بھی ہے۔

اس ضمن میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا تو حال یہ تھا کہ وہ سرتاپا امور نبوت کے لیے وقف ہو گئے تھے۔

اور میں نے ان دونوں کو اپنے مشاہدہ باطنی میں یوں دیکھا کہ فوارے کی طرح ان سے پانی اُبل رہا ہے۔

الغرض خدا تعالیٰ کی وہ عنایت جس کا مرکز و موضوع رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس تھی، وہ بعینہ ان دونوں بزرگوں کے وجود گرامی میں صورت پذیر ہوئی۔ یہ دونوں کے دونوں اپنے اس کمال کی وجہ سے بمنزلہ اُس عرض کے ہیں، جس کا جوہر کے بغیر قیام ممکن نہیں ہوتا، اور جوہر کے لیے اُس کا ہونا وجہ تکمیل ہوتا

ہے..... اور اسی وجہ سے یہ دونوں بزرگ رسول اللہ ﷺ کے جوار میں مدفون ہیں..... گو حضرت علیؑ نسب کے اعتبار سے نیز اپنی جبلت اور محبوب فطرت کے لحاظ سے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے زیادہ آپؐ سے قریب تھے، اور ”جذب“ میں بھی قوی تر اور ”معرفت“ میں بھی بلند تر تھے، لیکن اس کے باوجود نبی ﷺ اپنے منصب نبوت کے کمال کے پیش نظر حضرت علیؑ سے زیادہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی طرف مائل تھے۔

اسی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ وہ علما جو معارف نبوت کے حامل ہیں، وہ شروع سے حضرت علیؑ پر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو فضیلت دیتے چلے آئے ہیں، اور وہ علماء جو معارف ولایت کے حامل ہیں، وہ حضرت علیؑ کو افضل مانتے رہے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ بہت سے روزمرہ کے واقعات بظاہر معمولی ہوتے ہیں، لیکن ان واقعات کی ایک معنوی اساس ہوتی ہے، ان میں سے ایک حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا رسول اللہ ﷺ کے پاس دفن ہونے کا واقعہ ہے (کہ اس سے شیخینؒ کی فضیلت کلی کا اشارہ ملتا ہے) (فیوض الحرمین: ۱۷۱، ۱۷۲)

اسی حقیقت کو حضرت سید غوث علی شاہ قلندر پانی پٹیؒ (۱۲۱۹ھ..... ۱۲۹۷ھ)

نے یوں بیان فرمایا ہے:

”حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کو لوگوں نے چین نہیں لینے دیا، اگر حضرت

کے زمانے میں گڑبڑ نہ ہوتی تو لوگوں کے سینے معرفت سے پھاڑ دیتے۔

ایک شخص مکان کا قبالہ (بیع نامہ) لکھوانے آیا تو آپؐ نے یوں تحریر فرمایا:

”هذا ما اشترى ميت من ميت دار افي بلدة المذنبين

و سكنة الغافلين، الحد الاول منها ينتهي الى الموت

والثاني الى القبر والثالث الى الحساب والرابع اما

الى الجنة واما الى النار“

(ترجمہ: یہ ایک گھر ہے جو گناہ گاروں کے شہر اور غافلوں کی رہائش گاہوں کے اندر ایک مردے نے دوسرے مردے سے خریدا ہے، اس کی پہلی حد موت تک پہنچتی ہے، دوسری قبر تک، تیسری حساب تک اور چوتھی حد جنت تک یا جہنم تک)“
بھلا جب یہ سوچ ہو تو سلطنت کا کام کیسے چلے!

اور سلطنت کے لیے رعب و سطوت بھی امر ضروری ہے، آپؑ کے دل میں تو شان رحم غالب تھی، اسی وجہ سے سلطنت میں فتور پڑا، جب جانتے کہ امیر معاویہؓ حضرت عمرؓ کے زمانے میں سرتابی کرتے۔ ایک بار حضرت عمرؓ نے تکلف و تزئین کی باز پرس کے لیے ان کو طلب کیا تھا، خوف کے مارے تھرا گئے، جسم کا پنے لگا، عذر و معدرت کر کے جان بچائی، ورنہ بیخ و بن تک اکھاڑ ڈالتے۔ اور حضرت علیؓ مرتضیٰؓ کی یہ کیفیت تھی کہ جب امیر معاویہؓ نے جنگ کی اور کنارہ دریا پر قبضہ کیا تو آپؓ کے لشکریوں کا پانی بند کر دیا، لشکر والوں نے حملہ کیا اور اُس مقام سے غنیم کو ہٹا دیا، آپؓ نے اہل لشکر سے ارشاد فرمایا: ”جیسے تم پر پانی بند کیا گیا تھا تم اُن پر پانی بند نہ کرنا، اِخواننا بغوا علینا لیسوا بکفۃ ولا بفسقۃ“ (یہ ہمارے بھائی ہیں، انہوں نے ہمارے خلاف بغاوت کی ہے، نہ تو یہ کافر ہیں اور نہ ہی فاسق) (تذکرہ غوثیہ: ۳۰۹)

امام حسینؑ نے بھی کربلا میں اسی عالی ہمتی اور جوانمردی کا ثبوت دیا تھا، سچ ہے: الولد سر لا بیہ۔

صحابہ کرامؓ اور اہل بیت عظامؓ کے بارے میں ہمارا عقیدہ

”التفہیمات الالہیہ“ میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کا ایک وصیت نامہ مذکور

ہے، اس میں پانچویں وصیت میں فرماتے ہیں:

”آنحضرت ﷺ کے صحابہؓ کے حق میں نیک اعتقاد رکھنا چاہیے اور زبان پر

ان کے مناقب کے سوا اور کوئی ذکر نہیں آنا چاہیے۔

اس مسئلے میں دو گروہوں نے غلطی کی ہے۔

ایک گروہ یہ گمان کرتا ہے کہ صحابہؓ کے سینے آپس میں صاف تھے اور ان کے درمیان

جھگڑے نہیں ہوتے تھے۔

یہ سرتاپا وہم ہے، کیونکہ مشہور روایات ان کے باہمی جھگڑوں کی شہادت

دیتی ہیں اور ان روایات کا انکار نہیں ہو سکتا۔

دوسرے گروہ نے جب دیکھا کہ یہ سب چیزیں صحابہؓ سے منسوب ہیں تو ان کے خلاف

انہوں نے زبان لعن و طعن کھولی اور اس طرح وہ ہلاکت کی وادی میں جا گرے۔

مجھ فقیر کے دل میں یہ بات ڈالی گئی ہے کہ اگرچہ آپؐ کے صحابہؓ معصوم نہیں

تھے اور ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض عوام صحابہؓ سے ایسی چیزیں صادر ہوئی ہوں کہ

اگر ویسی چیزیں دوسروں سے صادر ہوتیں تو وہ جرح و طعن کے مستوجب بنتے، لیکن

ہمیں ان کی لغزشوں کے بارے میں زبان روکنے کا حکم دیا گیا ہے اور ان کی جرح

و طعن سے عبادت کے طور پر منع کیا گیا ہے۔ اس میں ایک مصلحت ہے، اور وہ

مصلحت یہ ہے کہ اگر صحابہؓ کی جرح و طعن کا دروازہ کھول دیا گیا تو آنحضرت ﷺ

سے روایت کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا اور سلسلہ روایت منقطع ہونے سے ملت کا

شیرازہ درہم برہم ہو جائے گا..... مزید براں جیسے آپؐ کے صحابہؓ کے حق میں اچھا

اعتقاد رکھنا چاہیے، اسی طرح آپؐ کے اہل بیتؓ کا عقیدت مند ہونا چاہیے اور ان

میں سے جو صالح تھے، ان کے اور زیادہ تعظیم کرنی چاہیے۔

”قد جعل الله لكل شيء قدراً“ (الطلاق: ۳)

ترجمہ: ”بے شک اللہ نے ہر شے کی ایک قدر مقرر کی ہے۔“

(ارمغان شاہ ولی اللہ: ۵۱۷)

بارہ امام قطب تھے

اسی پانچویں وصیت میں شاہ ولی اللہؒ مزید فرماتے ہیں:

”اس فقیر کو معلوم ہوا ہے کہ بارہ امام رضی اللہ عنہم نسبتوں میں سے ایک نسبت کے قطب تھے، اور تصوف کا رواج ان کے زمانے کے ختم ہونے پر شروع ہوا۔ جہاں تک عقیدہ و شرع کا تعلق ہے تو وہ حدیث پیغمبر ﷺ کے سوا اور کسی چیز سے نہیں لیا جاسکتا، ان ائمہ کی قطبیت ایک باطنی امر ہے، تکلیف شرعی کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔“ (ارمغان شاہ ولی اللہ: ۵۱۸)

اور حضرت خواجہ گیسو درازؒ سیدنا علیؑ اور سیدنا حسینؑ کی استقامت اور اتباع شریعت کے تذکرے کے بعد فرماتے ہیں:

”یہ اوصاف اور اخلاق تھے حضرت علیؑ اور امام حسینؑ کے، بارہ کے بارہ امام اسی طرح کی سیرت اور اخلاق سے آراستہ تھے، نبی کا نور ان میں پیوست تھا، ان لوگوں کا باطن اسی نور نبی سے منور تھا، سبحان اللہ امام زین العابدینؑ کیسے سردار تھے، ہر طرح کے اوصاف و محامد سے مزین تھے اور سب سے بڑھ کر وہ فرزند حسین بن علیؑ تھے۔ امام جعفر صادقؑ کے کیا کہنے وہ ایک عظیم انسان تھے، اسرار الہی اور معانی قرآن کو انہوں نے کتنے عمدہ انداز سے پیش کیا ہے، ان کا سینہ علم کا سمندر تھا۔ وہ بجا طور پر علوم و معارف میں امیر المومنین علیؑ کے مشابہ اور ثانی تھے۔ ان لوگوں میں ایسی سروری تھی جس کے بیان سے زبان قاصر ہے۔“ (جوامع الکلم: ۱۹۳)

امت میں اہل بیتؑ سفینہ نوحؑ کی مانند ہیں

عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ

کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

”آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر کوئی شخص ابوذرؓ سے زیادہ سچا اور بات

کا پکا نہیں۔“

یہی سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ باب کعبہ پکڑ کر کھڑے ہو گئے اور

فرمانے لگے: جو مجھے پہچانتا ہے وہ تو پہچانتا ہی ہے، جو نہیں پہچانتا، وہ پہچان لے میں

ابوذر ہوں، میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

”آگاہ رہو! تمہارے اندر میرے اہل بیت کا مقام سفینہ نوحؑ کی مانند ہے،

جو اس میں سوار ہو گیا، بچ گیا، جو پیچھے رہا، ہلاک ہوا۔“

(مشکوٰۃ المصابیح: مناقب اہل بیتؑ، مرقاة المفاتیح: ۱۱/۳۹۹)

گذشتہ اوراق میں آپ نے علماء و صلحاء کی اہل بیتؑ سے محبتوں اور عقیدتوں کے جو

تذکرے پڑھے، یہ درحقیقت سفینہ نوحؑ پر سوار ہونے کی کوششیں ہیں۔

فتنوں کے موجودہ سیلاب میں اللہ تعالیٰ ہمیں بھی سفینہ نوحؑ میں پناہ

عطا فرمائے۔

دارالعلوم دیوبند کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اپنے مشہور قصیدہ

بہارِ یہ کے آخر میں اپنی عقیدت کا یوں اظہار کرتے ہیں:

بس اب درود پڑھ اُس پر اور اُس کی آل پہ تو

جو خوش ہو تجھ سے وہ اور اُس کی عترتِ اطہار

الہی اُس پر اور اُس کی تمام آل پہ بھیج

وہ رحمتیں کہ عدد کرنے سکے اُن کو شمار

(قصائد قاسمی)

واقعہ کربلا نبوی پیشگوئیوں کے آئینے میں

رسول اللہ ﷺ نے آئندہ رونما ہونے والے حالات کی خبریں دی ہیں، یہ پیشگوئیاں سراسر نصیحت اور شفقت ہیں، تاکہ ان حالات میں امت جادۂ حق پر قائم رہ سکے۔

کتب تاریخ سے ہٹ کر، واقعہ کربلا کا نبوی اخبار کے آئینے میں جائزہ لیں تو حق اور باطل نہایت واضح ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔ خیال رہے کہ دین میں ان پیشگوئیوں کی بڑی اہمیت ہے، اسی لیے محدثین نہایت اہتمام سے انہیں روایت کرتے ہیں:

شرارِ امت..... خیارِ امت

ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جب میری امت متکبرانہ چال چلنے لگے گی اور بادشاہوں کے بیٹے، فارس اور روم کے بیٹے ان کی خدمت کرنے لگیں گے تو اللہ تعالیٰ امت کے شریروں کو امت کے شریفوں پر مسلط کر دے گا۔“ (مشکوٰۃ عن الترمذی: باب تغیر الناس)

ملا علی قاریؒ اس روایت کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

”یہ حدیث دلائل نبوت میں سے ہے، اس لیے کہ آپؐ نے جیسے خبر دی تھی، ویسے ہی ہوا، جب فارس اور روم فتح ہوئے، ان کے اموال اور اسبابِ جمال ہاتھ آئے اور ان کی اولاد کو قید کر کے خدمت گزار بنالیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے پہلے قاتلین عثمانؓ کو ان پر مسلط کر دیا، یہاں تک کہ انہوں نے حضرت عثمانؓ کو قتل کر دیا، پھر نبی امیہ کو نبی ہاشم پر مسلط کر دیا، پھر انہوں نے جو کیا وہ سب کے سامنے ہے۔“ (مرقاۃ: ۱۰/۹۴)

اس حدیث سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ امت میں شرار کون تھے اور

خیار کون؟

چند بیوقوف قریشی لڑکوں کے ہاتھوں میری امت ہلاک ہوگی

امام بخاری کتاب الفتن میں درج بالا عنوان کے تحت اپنی سند سے روایت کرتے ہیں کہ عمرو بن یحییٰ نے بیان کیا کہ مجھے میرے دادا نے بتلایا کہ ایک مرتبہ میں مدینہ میں مسجد نبوی میں ابو ہریرہؓ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، مروان بھی ہمارے ساتھ تھا، ابو ہریرہؓ نے بیان کیا کہ میں نے صادق و مصدوق ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

”هلكة امتی علی ایدی غلۃ من قریش“

”قریش کے چند لڑکوں کے ہاتھوں میری امت ہلاک ہوگی“

اس پر مروان نے کہا: ان لڑکوں پر اللہ کی لعنت

ابو ہریرہؓ نے فرمایا: اگر میں چاہوں تو ان کا نام و نسب بھی بیان کر سکتا ہوں۔

پھر جب بنو مروان کو شام میں اقتدار ملا تو میں اپنے دادا کے ساتھ ان کے

پاس جایا کرتا تھا، جب وہ انہیں دیکھتے کہ نو عمر لڑکے ہیں، تو ہمیں فرماتے: لگتا ہے کہ

یہ لوگ انہی میں سے ہیں!

ہم کہتے: آپ زیادہ جانتے ہیں۔“ (صحیح بخاری: ۱۰۴۶/۲)

صحیح بخاری، صفحہ مذکورہ کے حاشیہ: ۳ میں کرمانی کے حوالے سے مذکور ہے کہ

”ان نو عمر لڑکوں میں پہلا یزید تھا، اُس پر نازل ہو جس کا وہ مستحق ہے“

ابی ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”ستر (۷۰) کے

سرے سے اور بچوں کی امارت سے اللہ کی پناہ مانگا کرو۔“

(مشکوٰۃ مع مرقاۃ ۷/۲۲۸ عن احمد و البیہقی)

یہی وجہ تھی کہ سیدنا ابو ہریرہؓ یہ دعا کیا کرتے تھے: ”اے اللہ! مجھے ساٹھ کا

(فتح الباری ۱/۱۱۵)

سال اہد بچوں کی امارت کا زمانہ نہ آنے پائے“

اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی اور آپ بچگانہ مزاج یزید کے

برسراقتدار آنے سے ایک سال پہلے ۵۹ھ میں وفات پا گئے۔

حضرت عمر فاروقؓ فرمایا کرتے تھے:

”رب کعبہ کی قسم مجھے معلوم ہے کہ عرب کب ہلاک ہوں گے، جب ان کی قیادت وہ شخص کرے گا جس نے جاہلیت کا زمانہ نہیں دیکھا اور اسلام میں بھی اس کو رسوخ اور پختگی حاصل نہیں ہے۔“
(البدایہ والنہایہ: ۲۳۲/۸)

حضرت عمرؓ کا یہ ارشاد بھی درحقیقت درج بالا حدیث کی روشنی ہی میں تھا۔ یزید اور اس کے ہم مزاج مروانی بادشاہوں کے عہد میں اہل حق پر مصائب آئے، امت فتنہ و فساد میں مبتلا ہوئی، ظلم و جور کا بازار گرم ہوا، چنانچہ یہ لوگ اپنے کرتوتوں کی وجہ سے ان پیشگوئیوں کا مصداق قرار پاتے ہیں۔

میرے اہل بیت کو ستایا جائے گا

عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ ”ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ بنی ہاشم کے چند نوجوان آ گئے، جب نبی ﷺ نے انہیں دیکھا تو آپ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور آپ کا رنگ بدل گیا۔

میں نے عرض کیا: ہم آپ کے چہرے پر مسلسل ناگوار آثار دیکھ رہے ہیں! فرمایا: ہم اہل بیت کے لیے اللہ نے دنیا کے مقابلے میں آخرت پسند فرمائی ہے، میرے اہل بیت میرے بعد جلد ہی دیکھیں گے کہ انہیں ستایا جائے گا، جلا وطن کیا جائے گا اور دھتکارا جائے گا.....“
(سنن ابن ماجہ: ۲۹۹)

چنانچہ ایسے ہی ہوا، اور جن لوگوں نے اہل بیت کو دکھ پہنچا کر رسول اللہ ﷺ کو رلایا، ابدی رونا ان کا مقدر قرار پایا۔

تم پر ابتلا آئے گا

حضرت حذیفہؓ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جن جن لوگوں نے اسلام کا اقرار کیا ہے، انہیں گن کر مجھے بتلاؤ، ہم نے عرض کیا: ”یا رسول اللہ! کیا آپ کو ہم پر کوئی اندیشہ ہے، جبکہ ہماری تعداد چھ سو سے سات سو کے درمیان ہے“ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تم نہیں جانتے، ہو سکتا ہے کہ تم پر ابتلا آئے“ حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں: چنانچہ ہم پر ابتلا آیا، یہاں تک کہ ایک شخص صرف چھپ کر ہی نماز پڑھ سکتا تھا۔“ (سنن ابن ماجہ: ۲۹۱)

پہلی مرتبہ یہ ابتلا حضرت عثمانؓ کی شہادت کے ہنگامے میں ہوا، جبکہ اہل حق کے لیے نماز پڑھنا دشوار ہو گیا۔
پھر فتنہ حرہ میں بھی یہی صورت پیش آئی۔

قبر مبارک سے اذان کی آواز

ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ ”فتنہ یزید کے ایام میں مدینہ منورہ میں مسجد نبوی میں سعید ابن المسیبؓ کے سوا کوئی نہ بچا تھا، اور انہیں بھی انہوں نے ایک دیوانہ بوڑھا سمجھ کر چھوڑ دیا تھا (آپ نابینا بھی ہو چکے تھے) ان تین دنوں میں سعیدؓ نماز کے وقت قبر انور سے اذان کی آواز سنا کرتے تھے۔“ (مرقاۃ: ۱۰/۱۰۱، الامامۃ والسیاستہ: ۲۱۲/۱)
اور دارمی کی روایت میں ہے کہ آپ نماز کے وقت ضریح انور سے سینے کی گھٹی گھٹی سی آواز سنا کرتے تھے، اس سے پتا چل جاتا تھا کہ نماز کا وقت ہو چکا ہے۔
(چنانچہ آپ اذان دے کر نماز پڑھ لیتے تھے)

نبی اکرم ﷺ تو اپنی زندگی کی طرح قبر مبارک میں بھی نماز کے لیے متفکر اور بے چین ہوں، لیکن کچھ لوگ آ کر آپؐ کی مبارک مسجد میں نظام عبادت تک کو معطل کر دیں، کیا ایسے لوگ اہل حق ہو سکتے ہیں؟

وہ حدیث ذہن میں رہے کہ مؤمن اور کافر کے درمیان فرق نماز سے ہوتا ہے!
ملا علی قاریؒ قبر انور سے تلقین کی تائید میں واقعہ نقل کرتے ہیں۔

”مشاہدے میں آیا ہے کہ بہت سے لوگ، بچے بھی اور بڑے بھی، سونے کی حالت میں تلاوت کرتے ہیں۔

ایک عجیب حکایت

اس سے بھی عجیب تر وہ حکایت ہے جو ایک مرید نے بیان کی کہ وہ اور اس کے شیخ سحر کے وقت دس دس آیات ایک دوسرے کو سنایا کرتے تھے، شیخ کا انتقال ہو گیا، مرید حسب عادت بوقت سحر قبر کے قریب بیٹھ گیا اور اپنی منزل پڑھنے لگا، دس آیات پوری ہوئیں تو قبر سے شیخ کی آواز سنائی دی، انہوں نے حسب معمول دس آیات پڑھیں اور چپ ہو گئے، دور کا یہ قصہ اسی طرح چلتا رہا، مرید نے کہیں یہ قضیہ اپنے دوست سے بیان کر دیا تو حجاب واقع ہو گیا اور پھر آواز سنائی نہ دی۔ (مرقاۃ: ۱۰/۱۰۱)

خلافت کے بعد ملوکیت آئے گی

(۱) ابی عبیدہؓ اور معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اسلامی حکومت کا آغاز تو نبوت و رحمت سے ہوا ہے، پھر خلافت و رحمت کا دور آئے گا، پھر ایسی ملوکیت ہوگی جس میں ظلم اور اذیت پائی جائے گی، پھر ملوکیت سراسر جبر و قہر، تکبر اور فساد فی الارض ہو جائے گی، بادشاہ ریشم کو، بدکاری کو اور شرابوں کو حلال قرار دے لیں گے، اس کے باوجود انہیں رزق بھی ملے گا اور ان کی مدد بھی ہوگی، یہاں تک کہ اللہ سے جا ملیں گے۔“ (مشکوٰۃ: باب الانذار والتخذیر عن البہقۃ)

یہ حدیث بھی دلائل نبوت سے ہے، رسول اللہ ﷺ نے جیسے خبر دی، واقعات اُسی ترتیب سے رونما ہوئے۔

(۲) نعمان بن بشیرؓ رازدار نبوت حدیفہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ

نے فرمایا: ”جب تک اللہ چاہے گا تم میں نبوت رہے گی، پھر اللہ تعالیٰ اسے اٹھالے گا..... پھر خلافت علی منہاج النبوت کا دور آئے گا اور جب تک اللہ چاہے گا خلافت رہے گی، پھر اللہ تعالیٰ اسے بھی اٹھالے گا..... پھر کاٹ کھانے والی ملوکیت آئے گی اور جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا، رہے گی، پھر اللہ تعالیٰ اسے بھی اٹھالے گا۔ پھر جابرانہ ملوکیت آئے گی اور جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا، رہے گی، پھر اسے بھی اللہ تعالیٰ اٹھالے گا..... پھر خلافت علی منہاج النبوت کا دور آئے گا..... اتنا فرما کر آپ خاموش ہو گئے۔“

اس حدیث کے ایک راوی حبیب کہتے ہیں کہ جب عمر بن عبدالعزیزؒ کا دور آیا تو میں نے یہ حدیث انہیں لکھ بھیجی، نصیحت بھی کی اور یہ بھی کہا کہ ”مجھے امید ہے کہ کاٹ کھانے والی اور جابرانہ ملوکیت کے بعد آپ امیر المومنین ہیں..... عمر بن عبدالعزیز یہ پڑھ کر مسرور ہوئے۔“ (مشکوٰۃ، باب الانذار والتحذیر، عن احمد والبیہقی)

راوی حدیث کی یہ وضاحت خود بتلا رہی ہے کہ قرن اول میں لوگ خلافت و ملوکیت کے درمیان فرق سے آشنا تھے اور جو واقعات و حالات پیش آئے، اس حدیث کی روشنی میں انہیں کس نظر سے دیکھتے تھے، اور اس حدیث سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں کی اصل دلچسپی کسی خاندان سے نہیں بلکہ طرز حکومت سے تھی!

(۳) رازدار نبوت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا:

”یا رسول اللہ! کیا اس خیر (نظام اسلام) کے بعد شر ہوگا، جیسا کہ اس سے پہلے (دور جاہلیت میں) شر تھا؟

فرمایا: ہاں

میں نے عرض کیا: تو عصمت کی صورت؟

فرمایا! تلوار

(ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں: مراد یہ ہے کہ ایسے شر کے دور میں بچنے کی صورت یہ

ہے کہ تلوار اٹھائے۔ قنَادُہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد مرتدین کا وہ گروہ ہے، جس نے عہد صدیقی میں سراٹھایا تھا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ارشاد علی و معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان مقاتلے کو بھی شامل ہو، کیونکہ حق علیؑ کے ساتھ تھا اور عصمت معاویہؓ سے قتال میں تھی، جیسا کہ حدیث عمارؓ: ”تقتلک الفئۃ الباغیۃ“ سے ظاہر ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا بھی ارشاد ہے: ”فقاتلوا الی تبغی حتی تفری الی امر اللہ“..... (مرقاۃ: ۱۰/۱۲۲) حذیفہؓ کہتے ہیں، پھر میں نے عرض کیا:

”کیا تلوار کے بعد کچھ باقی رہے گا؟“

فرمایا: ہاں! آنکھوں میں کھٹکتی امارت ہوگی اور کدورت آمیز صلح ہوگی.....“

(مشکوٰۃ کتاب، الفتن، عن ابی داؤد)

ملا علی قاریؒ اس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

”اس میں حسنؓ و معاویہؓ کی باہم صلح کی جانب اشارہ ہے، جس کے نتیجے میں حسنؓ حکومت سے دستبردار ہو گئے اور معاویہؓ امیر بن گئے۔ اس حدیث سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس صلح کی وجہ سے معاویہؓ خلیفہ نہیں بنے، ہاں کچھ لوگوں کو اس کے خلاف وہم ہوا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔“ (مرقاۃ: ۱۰/۱۲۲)

خلافت علی منہاج النبوت کتنی مدت رہے گی

رسول اکرم ﷺ کے غلام سفینہؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو یہ فرماتے سنا:

”خلافت تیس برس رہے گی، پھر ملوکیت ہوگی“

(مشکوٰۃ، کتاب الفتن، عن احمد و ترمذی و ابی داؤد)

ملا علی قاریؒ رقم طراز ہیں:

”حسنؓ کے چھ ماہ ملا کر خلافت تیس سال پر ختم ہو گئی، معاویہؓ کا دور خلافت میں شامل نہیں ہے۔“ (مرقاۃ: ۱۰/۱۰۶)

مولانا محمد منظور نعمانی لکھتے ہیں:

”خلافت علی منہاج النبوة اور خلافت راشدہ جس کو اس حدیث میں ”خلافت النبوة“ کہا گیا ہے، بس ان تیس سالوں تک رہی..... اس کے بعد طور طریقوں میں تبدیلی کا عمل شروع ہو گیا اور شدہ شدہ خلافت علی منہاج النبوة کی جگہ بادشاہت کا رنگ آ گیا۔“ (معارف الحدیث: ۲۴۴/۷)

خلافت و ملوکیت میں کیا فرق ہے؟

ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں:

”خلافت وہ ہے جس میں حکمران اپنی سیرت اور انداز حکومت سے ثابت کر دے کہ وہ خود مختار نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کا فرماں بردار ہے۔“

جب حکمران سنت کی مخالفت کریں اور اپنی سیرت کو بدل ڈالیں تو وہ ملوک ہیں، خواہ اُن کا لقب خلفاء ہو“ (مرقاۃ: ۱۰/۱۲۳)

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ محاسبہ نفس کرتے ہوئے اپنے بارے میں متفکر تھے، اس پر ایک شخص نے عرض کیا:

”امیر المؤمنین! بادشاہ و خلیفہ میں فرق ہے۔“

خلیفہ کی شان یہ ہے کہ وہ ناحق وصول کرتا ہے نہ بے جا خرچ کرتا ہے، بحمد اللہ آپ ایسے ہی ہیں۔

بادشاہ وہ ہے جو رعیت پر جبر کرے، جس سے جتنا چاہے لے، اور جسے جتنا چاہے دے، کسی ضابطے کا پابند نہ ہو۔“ (تاریخ الخلفاء: ۱۴۳)

’زیت‘ خون میں ڈوب جائے گا

حضرت ابو ذرؓ ایک دن رسول اللہ ﷺ کے ساتھ گدھے پر سوار تھے، جب مدینہ کی آبادی سے باہر نکلے تو آپؐ نے انہیں چند باتیں فرمائیں، اُن میں ایک بات یہ تھی:

ہے کہ تلوار اٹھائے۔ قنادہؒ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد مرتدین کا وہ گروہ ہے، جس نے عہد صدیقی میں سراٹھایا تھا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ارشاد علیؑ و معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان مقاتلے کو بھی شامل ہو، کیونکہ حق علیؑ کے ساتھ تھا اور عصمت معاویہؓ سے قتال میں تھی، جیسا کہ حدیث عمارؓ: ”تقتلک الفئة الباغیة“ سے ظاہر ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا بھی ارشاد ہے: ”فقاتلوا الی تبغی حتی تفی الی امر اللہ“..... (مرقاۃ: ۱۰/۱۲۳)

حذیفہؓ کہتے ہیں، پھر میں نے عرض کیا:

”کیا تلوار کے بعد کچھ باقی رہے گا؟“

فرمایا: ہاں! آنکھوں میں کھٹکتی امارت ہوگی اور کدورت آمیز صلح ہوگی.....“

(مشکوٰۃ کتاب، الفتن، عن ابی داؤد)

ملا علی قاریؒ اس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

”اس میں حسنؓ و معاویہؓ کی باہم صلح کی جانب اشارہ ہے، جس کے نتیجے میں حسنؓ حکومت سے دستبردار ہو گئے اور معاویہؓ امیر بن گئے۔ اس حدیث سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس صلح کی وجہ سے معاویہؓ خلیفہ نہیں بنے، ہاں کچھ لوگوں کو اس کے خلاف وہم ہوا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔“

(مرقاۃ: ۱۰/۱۲۳)

خلافت علی منہاج النبوت کتنی مدت رہے گی

رسول اکرم ﷺ کے غلام سفینہؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو یہ فرماتے سنا:

”خلافت تیس برس رہے گی، پھر ملوکیت ہوگی“

(مشکوٰۃ، کتاب الفتن، عن احمد و ترمذی و ابی داؤد)

ملا علی قاریؒ رقم طراز ہیں:

”حسنؓ کے چھ ماہ ملا کر خلافت تیس سال پر ختم ہو گئی، معاویہؓ کا دور خلافت میں شامل نہیں ہے۔“

(مرقاۃ: ۱۰/۱۰۶)

مولانا محمد منظور نعمانی لکھتے ہیں:

”خلافت علی منہاج النبوة اور خلافت راشدہ جس کو اس حدیث میں ”خلافت النبوة“ کہا گیا ہے، بس ان تیس سالوں تک رہی..... اس کے بعد طور طریقوں میں تبدیلی کا عمل شروع ہو گیا اور شدہ شدہ خلافت علی منہاج النبوة کی جگہ بادشاہت کا رنگ آ گیا۔“ (معارف الحدیث: ۲۴۴/۷)

خلافت و ملوکیت میں کیا فرق ہے؟

ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں:

”خلافت وہ ہے جس میں حکمران اپنی سیرت اور انداز حکومت سے ثابت کر دے کہ وہ خود مختار نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کا فرماں بردار ہے۔“

جب حکمران سنت کی مخالفت کریں اور اپنی سیرت کو بدل ڈالیں تو وہ ملوک ہیں، خواہ اُن کا لقب خلفاء ہو“ (مرقاۃ: ۱۰/۱۲۳)

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ محاسبہ نفس کرتے ہوئے اپنے بارے میں متفکر تھے، اس پر ایک شخص نے عرض کیا:

”امیر المؤمنین! بادشاہ و خلیفہ میں فرق ہے۔“

خلیفہ کی شان یہ ہے کہ وہ ناحق وصول کرتا ہے نہ بے جا خرچ کرتا ہے، بحمد اللہ آپ ایسے ہی ہیں۔

بادشاہ وہ ہے جو رعیت پر جبر کرے، جس سے جتنا چاہے لے، اور جسے جتنا چاہے دے، کسی ضابطے کا پابند نہ ہو۔“ (تاریخ الخلفاء: ۱۲۳)

’زیت‘ خون میں ڈوب جائے گا

حضرت ابوذرؓ ایک دن رسول اللہ ﷺ کے ساتھ گدھے پر سوار تھے، جب مدینہ کی آبادی سے باہر نکلے تو آپؐ نے انہیں چند باتیں فرمائیں، اُن میں ایک بات یہ تھی:

”ابوذر! اس دن تیری حالت کیسی ہوگی، جب مدینے میں ایسا قتل عام ہوگا کہ ”زیت“ کا سنکستان خون میں ڈوب جائے گا..... (مشکوٰۃ، کتاب الفتن، عن ابی داؤد) ملا علی قاریؒ تور بشتیؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”زیت“ کا سنکستان مدینہ کے غربی حوہ کا حصہ ہے، دور یزیدی میں ۶۳ھ میں اسی مقام پر مسلم بن عقبہ مزی کی کمانڈ میں ظالم لشکر نے پڑاؤ کیا تھا اور پھر تین دن یا پانچ دن ان ظالموں نے (یزید کی اجازت سے) مدینہ کی حرمت کو پامال کیا، مردوں کو قتل کیا اور بدکاریاں کیں۔ پھر خدا کی پکڑ آئی، پانی میں نمک کی طرح گھل گیا اور حرین کے درمیان ایک مقام پر مر گیا۔

باطل پرست یونہی خسارے میں رہتے ہیں۔“ (مرقاۃ: ۱۰/۱۲۷، ۱۰/۱۳۸)

پانی میں نمک کی طرح گھل جائے گا

سعد بن ابی وقاص روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جو بھی اہل مدینہ سے برائی کا ارادہ کرے گا، اللہ اُسے آگ میں سیسے کی طرح پگھلا دے گا یا پانی میں نمک کی طرح گھلا دے گا۔“ (صحیح مسلم: ۴۴۰/۱) یہ حدیث معمولی لفظی فرق کے ساتھ حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی صحیح مسلم: ۴۴۵/۱ اور صحیح بخاری: ۲۵۲/۱ پر مروی ہے۔

حدیث کا مقصود یہ ہے کہ اہل مدینہ سے برا سلوک کرنے والا آخرت میں آگ میں سیسے کی طرح پگھلے گا اور دنیا میں پانی میں نمک کی طرح گھل جائے گا۔ امام نوویؒ محدث قاضی عیاضؒ کے حوالے سے اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

”جس طرح اُن لوگوں کی شان و شوکت ختم ہو کر رہ گئی، جنہوں نے بنو امیہ کے دور حکومت میں اہل مدینہ سے جنگ کی تھی، جیسے مسلم بن عقبہ کہ وہ اس جنگ کے

بعد مدینہ سے واپسی کے سفر میں ہلاک ہو گیا، پھر اُسے اس مہم پر بھیجنے والا یزید بھی اس کے پیچھے پیچھے موت کے منہ میں چلا گیا اس جرم میں شریک دوسرے لوگوں کا انجام بھی ایسا ہی ہوا“ (شرح صحیح مسلم: ۴۴۱/۱)

رسول اللہ ﷺ کی پیش گوئی سچ ثابت ہوئی، اہل مدینہ کو لوٹنے والوں کا انجام نہایت بھیانک ہوا۔

واقعہ حرہ آخر ذوالحجہ ۶۳ھ میں پیش آیا، یزید تو اس واقعے کے اڑھائی ماہ بعد عین عالم شباب میں ۱۴ ربیع الاول ۶۴ھ کو پانی میں نمک کی طرح گھل کر مر گیا۔ اس کی داستانِ موت گذشتہ صفحات میں گذر چکی ہے۔

مسلم بن عقبہ مرّی کا انجام

اس واقعہ ہانکہ کے دوسرے بڑے مجرم مسلم بن عقبہ مرّی، جسے اہل سیر اسراف فی القتل وجہ سے مسرف کے نام سے یاد کرتے ہیں، کی موت اس سے بھی ہولناک ہوئی۔

مدینہ طیبہ کی لوٹ مار کے بعد مسلم بن عقبہ نے دربار سجایا، لوگوں سے یہ بیعت لیتا تھا کہ ہو ہم یزید کے غلام ہیں، اُسے ہماری جان و مال پر مکمل اختیار حاصل ہے، ہم طاعت و معصیت ہر حال میں اُس کا کہا مانیں گے۔

انہی لوگوں میں یزید بن عبداللہ بن زمعہ بھی تھے..... آپ حضرت ام المؤمنین ام سلمہؓ کے نواسے ہیں اور آپ کے والد عبداللہ بن زمعہؓ ام المؤمنینؓ کے بھانجے بھی ہیں..... ان سے بھی اسی بیعت کا مطالبہ ہوا تو انہوں نے کہا: میں معروف میں اُس کی بیعت کرتا ہوں کہ کتاب و سنت کے مطابق اُس کی اطاعت کروں گا۔

مسلم یہ سن کر تیغ پا ہو گیا اور انہیں شہید کر دیا۔ یہ ظلم دیکھ کر یزید کی باندی، جو اُن کی ام ولد بھی تھیں، نے قسم اٹھائی کہ اگر میرا بس چلا تو میں اس ظالم کو، زندہ یا مردہ، آگ میں جلاؤں گی۔

اُس وقت مکہ مکرمہ پر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی حکومت تھی۔ مسلم مدینہ کو تاخت و تاراج کرنے کے بعد مکہ مکرمہ پر حملے کے ارادے سے روانہ ہوا۔ محرم ۶۳ھ کے ابتدائی دن تھے، واقعہ حسرہ کو تین دن گزر چکے تھے، سفر جاری تھا کہ حرص و ہوس اور بے حیائی کا پیلا پن صفاوی پانی کی شکل میں پیٹ میں بھر گیا اور مسلم اسی زہریلے پانی میں نمک کی طرح گھل کر مر گیا، اُس کے رفقا اُسے قدید نامی جگہ میں دفن کر کے آگے بڑھ گئے۔

ادھر یزیدؓ کی ام ولد اپنی قسم پوری کرنے کے لیے دو یا تین دن کا فاصلہ رکھ کر اپنے خدام کے ساتھ لشکر کے پیچھے چل رہی تھی، لشکر روانہ ہونے کے بعد یہ وہاں جا پہنچی اور اپنے خدام کو حکم دیا کہ سر کی طرف سے قبر کھود کر لاش نکال لاؤ۔

خدام نے قبر کھولی تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک اڑدھا گردن میں لپٹا ہوا ہے اور اس کے ناک کے نتھنوں سے اس کا مغز چوس رہا ہے۔

خدام گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے اور کہا: محترمہ! واپس چلیے، اللہ تعالیٰ نے اسے اس کے شر کی سزا دے دی ہے۔

وہ بھی اپنے ارادے کی پکی تھی، کہا: میں اپنی قسم پوری کر کے رہوں گی، جاؤ، پاؤں کی طرف سے قبر کھود کر لاش کھینچ نکالو۔

قبر کھودی گئی تو دیکھا کہ اُس اڑدھے نے اپنی دم سے اس کی ٹانگوں کو جکڑا ہوا ہے۔

اس اللہ کی بندی نے ایک طرف ہو کر دو رکعت نماز (حاجت) ادا کی اور دعا کی کہ یا اللہ! میں قسم پوری کرنا چاہتی ہوں، اس اڑدھے کو میرے راستے سے ہٹا دے۔ پھر اس نے ایک چھری لے کر اڑدھے کی دم پر ماری تو وہ سر کی جانب سے سرک کر باہر نکل گیا، پھر لاش قبر سے نکالی گئی، پہلے سولی پر لٹکائی گئی پھر آگ میں جلائی گئی، یوں اہل مدینہ سے داؤ کھیلنے والا سیسے کی طرح آگ میں پگھل گیا۔

مسلم بن عقبہ اور یزید کا یہ عبرت ناک انجام بہت جلد سامنے آ گیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: اہل مدینہ کا برا چاہنے والے کو اللہ تعالیٰ بہت جلد ہلاک کرتا ہے:

دیدي کہ خونِ ناحق پروانہ شمع را

چنداں اماں نداد کہ شب را سحر کند

(یہ واقعہ وفاء الوفاء باخبار دارالمصطفیٰ ﷺ: ۱/۱۳۵، ۱۳۶ میں تفصیل

سے مذکور ہے، نیز الامامة والسياسة: ۱/۲۱۹، ۲/۱۱)

شر قریب آ گیا

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”تباہی ہے عرب کے لیے اُس شر سے جو قریب آ چکا ہے، فلاح پا گیا وہ

جس نے اپنا ہاتھ روک لیا۔“ (مشکوٰۃ، کتاب الفتن، عن ابی داؤد)

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: ”طبریؒ نے تو کہا ہے کہ اس حدیث میں شر سے مراد

عثمانؓ کا سانحہ شہادت اور علیؓ کے دور خلافت کی جنگیں ہیں، لیکن میں کہتا ہوں کہ اس کی

زیادہ واضح مراد حسینؑ اور یزید کا قضیہ ہے، اس لیے کہ اس قضیے کے شر سے عرب و عجم

سبھی متاثر ہوئے۔“ (مرقاۃ: ۱۰/۱۳۴)

ان فتنوں سے امت کو کیا نقصان پہنچا؟

سعید ابن المسیبؒ فرماتے ہیں: ”پہلا فتنہ یعنی شہادت عثمانؓ کا سانحہ رونما ہوا

تو اصحابؓ بدر میں سے کوئی نہ بچا، دوسرا فتنہ یعنی فتنہ حرہ برپا ہوا تو اصحابؓ حدیبیہ

میں سے کوئی نہ رہا، پھر تیسرا فتنہ (یعنی مکہ مکرمہ پر لشکر کشی) پیدا ہوا تو لوگوں میں کوئی خیر

باقی نہ رہی“ (مقصود ہے کہ صحابہ کرامؓ، جو خیر البریہ تھے، کی اکثریت دنیا

(صحیح بخاری: ۵۷۳/۲)

سے رخصت ہو گئی)

اور ظاہر ہے کہ ان فتنوں کے ذمے دار وہ لوگ ہیں، جنہوں نے کتاب و سنت سے ہٹ کر نظام مملکت چلانے کی کوشش کی۔

کیا یہ لوگ قابل احترام ہیں؟

اللہ تعالیٰ کی نسبت سے بیت اللہ اور مکہ واجب الاحترام، رسول اللہ ﷺ کی نسبت سے مدینہ طیبہ واجب الاحترام، قرابت رسول ﷺ کی نسبت سے عترت اطہار واجب الاحترام، صحبت رسول ﷺ کی نسبت سے صحابہ کرام واجب الاحترام، اللہ تعالیٰ کے حکم سے چار مہینے: ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب واجب الاحترام، لیکن یزید اور اس کے عمال نے پہلے محرم الحرام میں عترت اطہار کی حرمت پامال کی، پھر ذوالحجہ میں مدینہ طیبہ اور صحابہ کرام کی حرمت پامال کی، پھر محرم الحرام میں مکہ مکرمہ اور صحابہ کرام کی حرمت پر حملہ کیا، ان دوہری دوہری حرمتوں کو پامال کرنے کے باوجود کیا یزید اب بھی قابل احترام ہے؟!

اور سب کچھ معلوم ہونے کے باوجود یزیدی اقدامات کا دفاع کرنے والے قابل احترام ہیں؟

امام حسینؑ اپنی ذات میں ایک امت تھے (چند سوانحی نقوش)

امام حسینؑ کی شخصیت شہادت کربلا کے حوالے سے زیادہ مشہور ہے۔ اس سے کچھ لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ امام حسینؑ کو بس ایک نسبی شرف حاصل تھا، کربلا کے اتفاقی حادثے سے آپؑ کو شہرت حاصل ہو گئی، علاوہ ازیں دیگر محاسن سے آپؑ کا دامن خالی ہے!

حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے، آپؑ کی شخصیت اتنے محاسن و محامد سے آراستہ ہے کہ نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں!

آغوش نبوت میں

امام حسینؑ ۵ شعبان ۴ھ میں پیدا ہوئے، جبکہ آپؑ کے بڑے بھائی امام حسنؑ نصف رمضان ۳ھ میں پیدا ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ کا انتقال ربیع الاول ۱۱ھ میں ہوا، اس طرح یہ دونوں بھائی اپنی اپنی زندگی کے ابتدائی ۶، ۷ سال براہ راست رسول رحمت ﷺ کے زیر تربیت رہے۔

دونوں کے کان میں اذان رسول اللہ ﷺ نے دی۔

دونوں کو گھٹی رسول اللہ ﷺ نے اپنے لعاب مبارک کے ساتھ دی

دونوں کا نام خود رکھا

دونوں کو رسول اللہ ﷺ نے مسلسل اپنی دعاؤں کے حصار میں رکھا

دونوں کی آپؑ نے ایسی نگرانی فرمائی کہ ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ کھجوریں جب توڑی

جاتیں تو لوگ صدقے کی کھجوریں آپؑ کی خدمت میں لاتے، آپؑ کے پاس کھجوروں کا

ڈھیر لگا ہوا تھا، حسنؑ اور حسینؑ ان کھجوروں کے ساتھ کھیلنے لگے، اس اثنا میں ایک

(حسنؑ، کمافی الصحیح للبخاری: ۲۰۲/۱) نے کھجور پکڑی اور منہ میں ڈال لی، رسول اللہ ﷺ

نے دیکھ لیا تو خود منہ سے کھجور نکال دی اور فرمایا:

”کیا تمہیں معلوم نہیں کہ آل محمد صدقہ نہیں کھاتے!“ (صحیح بخاری: ۱۳۸۵)

دونوں کو رسول اللہ ﷺ لڑکھرانے اور گرنے سے بچاتے تھے۔

دونوں کو رسول اللہ ﷺ اپنے ساتھ چمٹاتے تھے، چومتے تھے اور سونگھتے تھے اور فرماتے تھے: ”یہ دونوں میری دنیا کے مہکتے پھول ہیں۔“

☆ امام حسینؑ کو خاص طور پر رسول اللہ ﷺ اپنی زبان مبارک چساتے تھے، ابن حبان ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ”نبی ﷺ اپنی زبان نکال کر حسینؑ کو دکھاتے، بچہ آپؑ کی زبان کی سرخی دیکھتا تو خوشی سے آپؑ کی طرف اچھلتا“

(الحسینؑ حفیداً وشہیداً: ۱۴)

امام حسینؑ کو خاص طور پر لسانِ نبوت چسانا درحقیقت لسانِ حسینؑ میں کلمہ حق وعدل ودیعت فرماتا تھا! چنانچہ مستقبل میں اس زبان سے جس شان کے ساتھ کلمہ حق بیان ہوا، تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی، یہ رسول اللہ ﷺ کا فیضانِ نظر تھا۔

آپ حدیث روایت کرتے ہیں

۶، ۷ سال کی عمر ایسی ہے کہ اگر بچہ ذہین و فطین ہو تو بہت کچھ اخذ کر لیتا ہے، امام حسینؑ کو اللہ تعالیٰ نے جودتِ طبع اور ذکاوت و فطانت سے خوب خوب بہرہ مند کیا تھا، چنانچہ آپؑ رسول اللہ ﷺ سے کئی احادیث روایت کرتے ہیں:

(۱) مسند احمد اور سنن ترمذی میں آپؑ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”البخیل من ذکر عندہ فلم یصل علی“

”بخیل ہے وہ جس کے پاس میرا ذکر ہو، پھر مجھ پر صلوٰۃ نہ بھیجے“

صلی اللہ علیہ وآلہ وبارک وسلم

(۲) مسند احمد میں آپؑ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنہ“

”حسین مسلمان وہ ہے جو لا یعنی کام ترک کر دے“

دیکھیے! بچپن ہی میں کیسی عجیب اور مفید بات ذہن میں بٹھلا لی!

(۳) طبرانی میں آپؐ سے روایت ہے کہ ”ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: میں کم حوصلہ اور کم زور ہوں! فرمایا: ”ایسے جہاد کی طرف آ جاؤ جس میں کاٹنا نہیں، حج“

(الحسینؑ حفیداً و شہیداً: ۲۶، ۲۷)

لڑکپن، جوانی سیدنا علیؑ کی زیر نگرانی

اور علمی ذوق و شوق

☆ رسول اللہ ﷺ کے انتقال پر طلال کے بعد دونوں بھائیوں کا بچپن، لڑکپن اور جوانی سیدنا علیؑ کی زیر نگرانی گزری۔

اس عرصے میں دونوں بھائی کس ذوق و شوق سے حصول علم میں مصروف رہے، اس کا اندازہ ایک واقعے سے ہوتا ہے:

شمال ترمذی میں روایت ہے، امام حسنؑ بن علیؑ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے ماموں ہند بن ابی ہالہ سے رسول اللہ ﷺ کا سراپا دریافت کیا..... ہند بڑے شوق سے سراپاے مبارک بیان کیا کرتے تھے اور مجھے اشتیاق تھا کہ میں اُن کی زبان سے سنوں..... چنانچہ انہوں نے تفصیل سے رسول اللہ ﷺ کا سراپا بیان کیا۔ (روایت میں یہ تفصیل مذکور ہے)

امام حسنؑ کہتے ہیں کہ میں نے (اپنی علمی سبقت ثابت کرنے کے لیے) کچھ عرصہ یہ روایت (اپنے دل میں) چھپائے رکھی۔ پھر میں نے یہ حدیث حسینؑ سے بیان کی تو میں نے دیکھا کہ وہ مجھ سے سبقت لے چکے ہیں۔ نہ صرف یہ حدیث ماموںؑ سے پوچھ چکے ہیں بلکہ ابا جانؑ سے رسول اللہ ﷺ کے گھر میں تشریف لانے، باہر تشریف لے جانے اور روزمرہ زندگی گزارنے کا طریقہ بھی معلوم کر چکے

ہیں!“ (اس کے بعد امام حسینؑ سے یہ نہایت پیاری حدیث تفصیل سے مروی ہے)
 (شمائل ترمذی، باب ماجاء فی تواضع رسول اللہ ﷺ)
 اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بچپن ہی سے امام حسینؑ کو سبقت اور فراست سے نوازا تھا۔ چنانچہ ”جب امام حسنؑ حضرت معاویہؓ سے آمادہ صلح تھے، امام حسینؑ اس فیصلے کو درست نہیں سمجھ رہے تھے اور اہل شام سے قتال پر اصرار کر رہے تھے..... (امام حسنؑ کے پیش نظر کچھ اور مصلحت تھی اور حدیث رسول ﷺ بھی اپنا کام کر رہی تھی!)..... انہوں نے امام حسینؑ کو سختی سے روکا، آپؑ خاموش ہو گئے اور فیصلہ تسلیم کر لیا“ (البدایہ والنہایہ) لیکن امام حسینؑ کے خدشات بعد میں صحیح ثابت ہوئے۔

کمال علمی ظاہر ہوتا ہے

☆ آپؑ نے علم اور تقویٰ کے ماحول میں آنکھ کھولی اور پرورش پائی، ”علم کا باب“ تو آپؑ کے گھر میں کھلتا تھا اور تقویٰ کی آپؑ کو گھٹی ملی تھی، اس لیے فطری طور پر آپؑ اپنے دور میں شریعت، طریقت اور حقیقت کے امام تھے۔
 ابن عساکر اپنی تاریخ دمشق، میں لکھتے ہیں:

ترجمہ: ”ایک مرتبہ ابن عباسؓ لوگوں میں بیٹھے حدیث بیان کر رہے تھے کہ نافع بن ازرق کھڑا ہوا اور کہنے لگا:

ابن عباس! آپ لوگوں کے سامنے چھوٹے چھوٹے مسئلے بیان کرتے رہتے ہو، ذرا اپنے اُس اللہ کا حال تو بیان کرو، جس کی عبادت کرتے ہو!
 سوال کی بے باکی اور شدت سے ابن عباسؓ نے اپنا سر جھکا لیا، حسین بن علیؑ بھی ایک طرف بیٹھے ہوئے تھے، فرمایا:

ابن ازرق میرے پاس آؤ۔

کہنے لگا: میں نے آپ سے نہیں پوچھا

ابن عباسؓ نے فرمایا: ابن ازرق! یہ اہل بیت نبوت کے فرد ہیں، اور

یہی تو علم کے وارث ہیں!

وہ حسینؑ کی طرف متوجہ ہوا تو آپؑ نے اُسے فرمایا:

”نافع! جس نے اپنے دین کی بنیاد قیاس پر رکھی، ہمیشہ التباس میں پڑا

رہے گا، جب گرے گا، اوندھے منہ گرے گا، منہاج کے بارے میں پوچھتا ہی رہے گا، کجی کے ساتھ سفر کرے گا، راستے سے بھٹکا رہے گا، فضول باتیں کہتا رہے گا۔

ابن ازرق! میں اپنے الہ کی وہی شان بیان کرتا ہوں، جو اُس نے خود بیان کی

اور میں اُس کی وہی تعریف کرتا ہوں، جو اُس نے خود اپنی تعریف کی، اُس کا حواس سے

ادراک نہیں ہو سکتا، اُسے لوگوں سے قیاس نہیں کیا جاسکتا، وہ قریب ہے لیکن چمٹا ہوا

نہیں، دور ہے لیکن سمٹا ہوا نہیں، وہ اکیلا ہے، اجزا سے پاک ہے، اُسے آیات سے پہچانا

جاتا ہے اور علامات سے بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے سوا کوئی الہ نہیں، بڑا ہے اور بلند ہے“

ابن ازرق رو پڑا، بولا:

حسین! کتنا حسین ہے تیرا کلام!

فرمایا: مجھے بتلایا گیا ہے کہ تو میرے ابا، میرے بھائی اور میرے بارے میں

کفر کی شہادت دیتا ہے؟

ابن ازرق بولا: حسین! واللہ میں یہ بات کہتا تھا، لیکن تم لوگ تو اسلام کے مینارے

اور احکام کے ستارے ہو۔

حسینؑ نے فرمایا: میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں

بولا: پوچھیے

امام حسینؑ نے سورۃ الکہف کی آیت: ۸۲ تلاوت کی، جس کا ترجمہ یہ ہے:

”اور وہ جو دیوار تھی، سودو یتیم لڑکوں کی تھی اس شہر میں، اور اُس کے نیچے اُن کا خزانہ گڑا تھا اور اُن کا باپ صالح تھا.....“ (یہ دیوار گرنے کے قریب تھی، حضرت خضرؑ نے بلا معاوضہ یہ دیوار سیدھی کر دی تھی تاکہ خزانہ محفوظ رہے)

امام حسینؑ نے پوچھا: ان لڑکوں کی یہ حفاظت کس وجہ سے ہوئی؟

ابن ازرق نے جواب دیا: باپ کی وجہ سے

فرمایا: تو اُن کا باپ بہتر تھا یا رسول اللہ ﷺ؟

(ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر اعتبار سے اُن یتیم لڑکوں کے باپ سے

بہتر تھے، تو کیا اللہ ہمارے ابا کی وجہ سے ہماری اور ہمارے ایمانی خزانے کی حفاظت نہیں فرمائے گا؟)

(الحسینؑ حفیداً و شہیداً: ۲۳، ۲۴)

مسند تدریس کوزینت بخشتے ہیں

حصول علم کے بعد آپؑ تدریس میں بھی مشغول رہے۔

ابن عساکر اپنی ”تاریخ دمشق“ میں روایت کرتے ہیں:

”معاویہؓ نے ایک قریشی سے فرمایا:

جب تم مسجد نبویؐ میں داخل ہو اور وہاں ایک ایسا حلقہ دیکھو، جس میں لوگ یوں بیٹھے ہوں گویا اُن کے سروں پر پرندے ہیں، تو وہ ابو عبد اللہ (حسینؑ) کا حلقہ ہوگا، اُن کا تہبند نصف پنڈلی تک ہوگا، اور اُس حلقے میں مزاح اور یادہ گوئی قسم کی کوئی چیز نہیں ہوگی“

(الحسینؑ حفیداً و شہیداً: ۲۲)

یہ نقشہ بالکل رسول اللہ ﷺ کی مجلس کا ہے۔ گذشتہ سطور میں ایک روایت کا ذکر گزرا ہے، جس میں امام حسینؑ نے سیدنا علیؑ سے رسول اللہ ﷺ کا طرز زندگی دریافت کیا تھا، زیر نظر روایت یہ شہادت دے رہی ہے کہ امام حسینؑ نے اُس روایت کو اپنی زندگی میں جذب کر لیا تھا، اس لیے آپؑ صرف صورت ہی میں نہیں، سیرت میں بھی رسول اللہ ﷺ کے شبیہ تھے!

افسوس! کچھ لوگوں کو اب بھی امام حسینؑ کی زندگی میں عجلت پسندی، ناعاقبت اندیشی اور جاہ طلبی کی بوسنگھائی دیتی ہے، لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلیٰ العظیم! تواضع اور انکساری کا نمونہ

امام حسینؑ کی طبیعت میں تواضع اور انکساری تھی۔

ابن عسا کر روایت کرتے ہیں کہ ”ایک مرتبہ آپؑ گذر رہے تھے، دیکھا، صفہ میں چند مساکین بیٹھے کھا رہے ہیں، انہوں نے آپؑ کو دعوت دی، آپؑ اتر آئے، فرمایا: اللہ تکبر کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا، چنانچہ ان کے ساتھ کھانا کھالیا، پھر فرمایا: میں نے تمہاری دعوت قبول کی، تم میری دعوت قبول کرو گے! انہوں نے کہا: جی ہاں! آپؑ انہیں اپنے گھر لے گئے اور اپنی اہلیہ رباب سے فرمایا: گھر میں جو کچھ ہے نکال دو!“

سخاوت آپؑ کی وراثت

سخاوت تو آپؑ کی جدی وراثت تھی۔

ایک مرتبہ ایک سوالی مدینے کی گلیوں میں مانگتا پھرتا تھا، پھرتے پھرتے امام حسینؑ کے دروازے پر آ پہنچا، دروازہ کھٹکھٹایا اور دو شعر پڑھے۔ امام حسینؑ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے، آپؑ نے نماز مختصر کی، باہر تشریف لائے، دیکھا کہ ایک حاجت مند اور فاقہ زدہ اعرابی ہے، اندر تشریف لے گئے اور آواز دی: قنبر!

لیک یا ابن رسول اللہ! قنبر نے جواب دیا

فرمایا: ہمارے نفقے سے تمہارے پاس کتنا بچا ہوا ہے؟

دو سو درہم، اُس نے جواب دیا، اور وہ بھی آپؑ نے حکم دیا تھا کہ گھر والوں

میں تقسیم کر دوں،

فرمایا: سب لے آؤ، اُن سے زیادہ حقدار آ گیا ہے،

چنانچہ دوسو درہم اعرابی کو دے دیے اور کمی کی معذرت بھی کی، اعرابی تعریف کرتا ہوا خوش خوش چلا گیا“ (الحسینؑ حفیداً و شہیداً: ۲۴)

”ایک مرتبہ امام حسنؑ امام حسینؑ اور عبداللہ بن جعفرؑ حج کے لیے روانہ ہوئے، راستے میں بھوک پیاس نے گھیر لیا، سامان ختم ہو چکا تھا، دیکھا ایک خیمہ ہے، وہاں پہنچے تو ایک بڑھیا بیٹھی تھی۔

پوچھا: پینے کے لیے کچھ؟

بڑھیا نے کہا: ہاں، انہوں نے اونٹ بٹھلا دیے،

اُس کے پاس صرف ایک چھوٹی بکری تھی، اسے دوہ لو اور دودھ پی لو، بڑھیا نے کہا۔

انہوں نے ایسے ہی کیا، پھر پوچھا، کھانے کے لیے کچھ؟

صرف یہی بکری ہے، اور کچھ نہیں، اُس نے کہا، میں تمہیں قسم دیتی ہوں کہ تم میں سے کوئی اسے ذبح کر لے، اتنے میں میں ایندھن مہیا کر لوں، بس اسے بھون لو اور کھاؤ۔

انہوں نے یہی کہا، اس کے یہاں رُکے رہے، یہاں تک کہ موسم ٹھنڈا ہو گیا، جب وہاں سے چلنے لگے تو اُسے کہا:

خاتون! ہم قریشی لوگ ہیں، ادھر جا رہے ہیں، جب ہم صحیح سالم واپس آئیں تو ہمارے پاس آنا، ہم انشاء اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ حسن سلوک کرایں گے..... اور چل دیے۔

بڑھیا کا شوہر واپس آیا، اُس نے اُسے قصہ بتلایا تو وہ غضبناک ہوا، بولا: کمبخت! ناواقف لوگوں کے لیے ہماری بکری ذبح کر دی، پھر کہتی ہے قریشی لوگ تھے! ایک لمبے عرصے کے بعد بڑھیا اور اُس کا شوہر قحط سالی کی مصیبت میں گرفتار ہو کر مدینہ طیبہ پہنچے، مینگنیاں چنتے تھے (اور گزارا کرتے تھے) ایک دن بڑھیا کسی گلی سے گذر رہی تھی اور مینگنیاں چن کر بورے میں ڈال رہی تھی، اتفاق سے

امام حسنؑ اپنے گھر کے دروازے پر بیٹھے تھے، آپؑ نے بڑھیا کو دیکھا تو پہچان لیا، اُسے آواز دی اور فرمایا:

اللہ کی بندی! مجھے پہچانتی ہو؟

نہیں، اس نے کہا،

”میں فلاں دن، فلاں سال، فلاں منزل پر تمہارا ایک مہمان تھا“

”میرے ماں باپ آپ پر قربان، میں آپ کو نہیں پہچان رہی“

”ٹھیک ہے، تم مجھے نہیں پہچان رہی، میں تو تمہیں پہچان رہا ہوں“

امام حسنؑ نے فرمایا اور اپنے غلام کو حکم دیا: صدقے کی بکریوں سے ایک

ہزار بکریاں اس کے لیے خرید لو اور اسے ایک ہزار دینار بھی دے دو۔

پھر اُسے اپنے غلام کے ساتھ اپنے بھائی حسینؑ کے پاس بھیج دیا۔

غلام اُسے لے کر امام حسینؑ کے پاس پہنچا تو انہوں نے بھی پہچان لیا۔

پوچھا: بھائی جان نے کیا سلوک کیا؟

بتلایا گیا تو فرمایا: اتنا ہی میری طرف سے بھی دے دو۔

پھر غلام اُس بڑھیا کو عبد اللہ بن جعفرؑ کے پاس لے گیا، انہوں نے بھی

پہچان لیا، حسینؑ کا حسن سلوک سنا تو فرمایا:

واللہ! اگر پہلے میرے پاس آ جاتی تو میں اُن دونوں کو (نیکی کی اس دوڑ میں)

تھکا دیتا، حکم دیا کہ میری طرف سے دو ہزار بکریاں اور دو ہزار دینار اسے دے دو۔

وہ بڑھیا (جب آئی تھی تو غریب ترین تھی اور جب) مدینہ طیبہ سے واپس

گئی تو امیر ترین خاتون تھی۔“ (الحسن والحسین: ۳۰)

لاریب: ایں خانہ ہمہ آفتاب است

طبیعت موزون تھی

آپ کا دل زہد و ورع سے لبریز تھا، اس کے ساتھ طبیعت موزون تھی، قلبی

کیفیات میں کبھی تموج برپا ہوتا، تو اس طرح کے اشعار کا روپ دھار لیتیں:

لئن كانت الدنيا تعدّ نفيسة
فقد ارثوا ب الله أغلى وأنبى
وإن كانت الأبدان للموت أنشت
فقتل سيل الله بالسيف أفضل
وإن كانت الأرزاق شيئاً مقدراً
فقلة سعى المرء في الكسب أجمل
وإن كانت الأموال للترك جمعت
فما بال متروك به المرء يخل

”اگر دنیا کوئی نفیس چیز شمار کی جاتی ہے تو آخرت اس سے زیادہ قیمتی اور بلند تر ہے۔
اگر یہ ابدان موت ہی کے لیے پیدا کیے گئے ہیں تو اللہ کے راستے میں تلواریں سے قتل ہو
جانا افضل ہے۔

اگر رزق تقدیر میں لکھی ہوئی کوئی چیز ہے تو کسب معاش میں قلیل سعی جمیل تر ہے۔
اور اگر اموال چھوڑنے ہی کے لیے اکٹھے کیے جاتے ہیں تو آدمی کو کیا ہوا کہ اُس چیز پر
بخل کرتا ہے، جسے چھوڑ جانا ہے۔“ (الحسینؑ حفیداً و شہیداً: ۲۵)

ذوق عبادت فطری تھا

ذوق عبادت فطری تھا، کثرت سے روزے رکھتے تھے، اور اکثر نماز میں
مشغول رہتے تھے۔ (الحسنؑ و الحسینؑ: ۷۷)

ابن عساکر روایت کرتے ہیں کہ حسینؑ بن علیؑ نے 25 حج پیدل کیے، جبکہ
بہترین اونٹنیاں ساتھ ہوتی تھیں۔ (الحسینؑ حفیداً و شہیداً: ۲۶)

پیدل حج افضل ہے، امام حسینؑ نے اپنی طبیعت کے مطابق افضل عمل اختیار فرمایا

قلبِ اطہر پر خوفِ الہی طاری رہتا تھا

حضرت خواجہ گیسو دراز سید محمد حسینیؒ (۷۲۱ھ - ۸۲۵ھ) سلسلہ چشتیہ کے عظیم شیخ گزرے ہیں۔ آپ ایک حکایت بیان فرماتے ہیں، جسے پڑھ کر دل دہل جاتا ہے اور آنکھیں کھل جاتی ہیں:

”ایک رات حضرت خواجہ حسن بھریؒ کعبہ سے متصل حرم میں عبادت میں مشغول تھے۔ کعبہ کی چھت سے کسی کی آواز آرہی تھی۔ کعبہ کی چھت پر چونکہ کوئی آجا نہیں سکتا، اس لیے ان کو خیال آیا کہ پتا چلانا چاہیے کہ کون شخص اوپر موجود ہے، اس خیال کے تحت وہ چھت پر گئے، دیکھا کہ ایک آدمی چھت سے اس طرح چمٹا ہوا ہے جیسے زمین پر پانی سے بھیگا کپڑا پڑا ہوا ہو، اور وہ زار زار رو رہا ہے اور کہہ رہا ہے:

خداوند کریم! مجھے نہیں معلوم کہ میرا انجام کیا ہوگا؟

یہ جسم دوزخ کی آگ میں جلایا جائے گا یا نجات پائے گا؟
یہ آنکھیں جہنم کے بھڑکتے شعلے دیکھیں گی یا اپنے مولا کی زیارت سے ٹھنڈی ہوں گی؟
یہ حلق دوزخ کے تھوہڑ کا مزا چکھے گا یا جنت کے پھلوں کا؟
یہ معدہ آتشیں کھانوں سے بھرا جائے گا یا جنتی نعمتوں سے؟

اسی طرح کی باتیں کہہ کہہ کر اللہ کے حضور ملالہ و زاری کر رہا ہے۔

خواجہ حسن بھریؒ نے اپنے دل میں کہا کہ پتہ نہیں کون گھنکار شخص ہے جو موقع پا کر اس طرح گریہ و زاری کر رہا ہے۔ اوپر جانے کے بعد وہ کھڑے رہے اور یہ سوچ کر کہ اس شخص کی گریہ و زاری میں مغل نہیں ہونا چاہیے، نیچے اتر آئے، کہ جب یہ نیچے اترے گا، دیکھ لیں گے کہ کون شخص ہے۔ جب وہ شخص چھت سے نیچے اتر تو حسن بھریؒ آگے بڑھے، دیکھا کہ یہ تو امیر المومنین حضرت حسینؑ ہیں۔ وہ چیخ مار کر ان کے قدموں سے لپٹ گئے اور عرض کیا:

اے فرزند رسول خدا! آپ کی عظمت اور بزرگی تو اتنی زیادہ ہے کہ بیان نہیں کی جاسکتی، اور اگر یہ نہ بھی ہوتی تو کیا فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ کے لیے کافی نہیں ہیں،

علیؑ کافی نہیں ہیں، خود محمد رسول اللہ ﷺ کافی نہیں ہیں؟

یہ سن کر امیر المومنین حسینؑ کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو گئیں اور فرمایا:

اے حسن! سنو، جس روز یہ آیت **وَأَنْزِلُ عُشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ** (ڈراؤ اپنے قریبی

رشتہ داروں کو) نازل ہوئی پیغمبر علیہ السلام نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بلا کر فرمایا:

”اے فاطمہ! اپنے آپ کو دوزخ سے خود بچا، اس لیے کہ میں اللہ کے

سامنے تیرے لیے کسی چیز کا مالک نہیں ہوں“

پھر امیر المومنین امام حسینؑ نے فرمایا کہ اے حسن! جب باپ محمدؐ کی رسالت

فاطمہؑ کو فائدہ نہ پہنچا سکی تو علیؑ کے باپ ہونے اور فاطمہؑ کے ماں ہونے سے مجھے کب

فائدہ پہنچ سکتا ہے؟“

یہ سن کر خواجہ حسن بھریؒ زار زار رونے لگے کہ جب فاطمہ کو محمد ﷺ جیسے

باپ اور حسینؑ کو علیؑ اور فاطمہؑ جیسے ماں باپ سے (نجات کا) فائدہ نہیں پہنچ سکتا تو حسن

لولوی کسی شمار میں ہے اور اس کا کہاں ٹھکانا ہے!“ (جوامع الکلم: ۸۶)

شجاعت آپ کو گھٹی میں ملی

شجاعت و بسالت میں آپؑ سیدنا علیؑ کے سچے وارث تھے، ”جمل، صفین

وغیرہ تمام مغازی میں آپؑ امیر المومنینؑ کے ساتھ رہے“ (البدایہ والنہایہ: ۸/۱۵۰)

غالباً اس فطری جرأت اور استقامت کی وجہ ہی سے امیر المومنین سیدنا علیؑ ”فأنا

وحسین“ فرما کر امام حسینؑ کی شخصیت کو اپنی شخصیت کے ساتھ ضم کر لیا کرتے تھے!

(الحسین حفیداً و شہیداً: ۱۶)

صحابہ کرامؓ آپؑ کی تعظیم کرتے تھے

امام حسینؑ ہنجر کے اعتبار سے تمام صحابہؓ میں چھوٹے تھے، لیکن تمام صحابہؓ آپؑ

کی تعظیم و توقیر کرتے تھے اور آپؑ کے اخلاق و اطوار کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتے تھے، حتیٰ

کہ سیدنا ابوبکرؓ، سیدنا عمرؓ، سیدنا عثمانؓ آپؑ کے ساتھ تعظیم و تکریم سے پیش آتے تھے۔

(البدایہ والنہایہ: ۸/۱۵۰)

غور کیجئے! ابن کثیرؒ یہ روایت نہیں فرما رہے کہ صحابہؓ آپؑ کے ساتھ شفقت سے پیش آتے تھے، بلکہ یہ کہہ رہے ہیں کہ صحابہؓ اجلہ صحابہؓ تعظیم و تکریم سے پیش آتے تھے، سچ ہے:

قدر جوہر شاہ بداند یا بداند جوہری

قدر دانوں اور مرتبہ شناسوں نے تعظیم و توقیر کی اور دنیا پرست اندھوں نے

گھوڑوں تلے روند ڈالا!

ہمہ گیر شخصیت

الغرض امام حسینؑ کی شخصیت صرف کربلا تک محدود نہیں، بلکہ اتنی ہمہ گیر ہے کہ اُس کی تعبیر صرف قرآن مجید کے ان الفاظ سے ہو سکتی ہے:

”كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ شَاكِرًا

لِأَنْعَمِهِ، اجْتَبَاهُ وَهَدَاهُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝ (النحل: ۱۲۰-۱۲۱)

آپؑ اپنی ذات میں ایک امت تھے، اللہ کے فرماں بردار تھے، یک سو ہو کر رہنے والے تھے، مشرکین سے آپؑ کا کوئی تعلق نہیں تھا، اُس کی نعمتوں کا شکر گزار تھے، اللہ نے آپؑ کو چن لیا اور صراطِ مستقیم پر چلایا..... کربلا کے افق سے تو آپؑ کی شخصیت کا سورج صرف طلوع ہوا!

(مذکورہ بالا اوصاف اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل ابراہیمؑ کے بیان فرمائے ہیں، اگر ہزاروں سال بعد اللہ تعالیٰ فرزند ابراہیمؑ میں یہی اوصاف پیدا فرما کر اُسے اُسوۂ ابراہیمیؑ کا شاہد بنادے تو اس پر حیرانی کیسی!

لیس علی اللہ بمستنکر

ان یجمع العالم فی واحد

امام حسنؑ اور امام حسینؑ صحابی بھی ہیں

عظمت صحابہؓ ایک حق ہے، لیکن کچھ لوگ عظمت صحابہؓ کی بات ڈھال کے طور پر استعمال کرتے ہیں، اب امام حسینؑ بھی صحابی ہیں، ان پر جرح و تنقید کیسے کی جائے؟ اس کے لیے انہوں نے راہ یوں صاف کی کہ صحابی وہ ہے جس نے عقل و شعور اور بلوغت کے ساتھ صحبت اٹھائی ہو، رسول اللہ ﷺ کا جب انتقال ہوا تو امام حسینؑ بہت کم سن تھے، اس لیے آپؐ زمرہ صحابہؓ میں داخل نہیں۔

آئیے ایک نظر اس پر بھی!

امام بخاریؒ صحابی کی تعریف یہ بیان فرماتے ہیں:

”من صحب النبی ﷺ اور آہ من المسلمین فہو من اصحابہ“

(صحیح بخاری: ۵/۵۱۱)

ترجمہ: ”جس نے نبی ﷺ کی صحبت اٹھائی یا آپؐ کی زیارت کی اور ہو بھی مسلمان تو وہ آپؐ کا صحابی ہے۔“

چنانچہ ایمان کے ساتھ جس نے بھی آپؐ کو دیکھا، قریب سے دیکھا یا دور سے، چھوٹی عمر میں دیکھا یا بڑی عمر میں یا نابینا تھا لیکن آپؐ کی مجلس میں بیٹھا تو وہ زمرہ صحابہؓ میں شمار ہوگا۔

امام حسنؑ اور امام حسینؑ اس تعریف کے مطابق صحابی قرار پاتے ہیں اور اگر کسی کو امام بخاریؒ کی تعریف پر اعتراض ہو تو کیا کہا جاسکتا ہے! پھر امام حسنؑ اور امام حسینؑ کو صرف شرف صحبت ہی نہیں بلکہ شرف روایت بھی حاصل ہے۔

امام بخاریؒ نے کتاب العلم میں یہ باب قائم فرمایا ہے:

”باب متی یصح سماع الصغیر“

یعنی کم سن بچے کا سماع کب صحیح قرار دیا جائے گا؟ اور اس میں انہوں نے محمود بن الربیعؒ کی یہ روایت ذکر کی ہے:

ترجمہ: مجھے نبی ﷺ کی یہ بات یاد ہے کہ آپؐ نے ڈول سے پانی لے کر میرے منہ پر کھلی فرمائی تھی، میں (اس وقت) پانچ برس کا تھا“ (بخاری: ۱۷۱۷)

امام بخاریؒ کا مقصد یہ ہے کہ کم سن بچہ اگر سمجھ دار ہے، خواہ پانچ سال کا ہو، اس کا سماع معتبر ہے، اس کی روایت قبول کی جائے گی۔

امام حسنؑ اور امام حسینؑ کا فہم و شعور محتاج کلام نہیں:

بالائے سرش ز ہو شمندی
می تافت ستارہ بلندی

اور رسول اللہ ﷺ کی وفات کے وقت امام حسنؑ کی عمر سو اسات سال اور امام حسینؑ کی عمر ساڑھے چھ سال سے زیادہ تھی، چنانچہ جو انان جنت کے ان دونوں سرداروں کی روایات محدثین نے صحیح تسلیم کی ہیں اور اپنے مجموعوں میں نقل کی ہیں۔ سب سے زیادہ مرویات امام اہل السنۃ احمد بن حنبلؒ نے اپنے مسند میں روایت کی ہیں۔

ان میں سے کچھ روایات گذشتہ صفحات میں گذر چکی ہیں، ایک روایت یہاں ذکر کی جا رہی ہے، جو سانحہ کربلا سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔

امام ابن ماجہؒ اپنی سند سے سیدہ فاطمہ بنت الحسینؑ سے اور وہ اپنے والد گرامی امام حسینؑ سے روایت کرتی ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

”جسے کوئی مصیبت پہنچی پھر کبھی اسے اپنی مصیبت یاد آئی اور اس نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ لیا، اگرچہ یہ مصیبت عہد قدیم میں واقع ہوئی ہو، تو اللہ تعالیٰ اسے اتنا ہی اجر عطا فرماتا ہے، جتنا روز مصیبت عطا فرمایا تھا“۔ (سنن ابن ماجہ: ۱۱۵)

امام حسینؑ پر مصیبت واقع ہوئی تھی اور اس مصیبت سے صرف اہل بیتؑ نہیں، پوری امت نے متاثر ہونا تھا اور پھر اس مصیبت کا تذکرہ دنوں، مہینوں اور سالوں

نہیں، تا قیامت ہونا تھا، اس پس منظر میں امام حسینؑ کی زبان سے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان مستقل دلیل نبوت ہے۔

اور مصیبت کے موقع پر جو لوگ انا للہ وانا الیہ راجعون کہتے ہیں قرآن مجید کی روشنی میں ”انہی لوگوں پر ان کے رب کی خاص عنایتیں اور رحمت ہوتی ہے اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہوتے ہیں“ (البقرہ: ۱۵۷)

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو مومن مصیبت کے موقع پر اپنے بھائی سے تعزیت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے عزت و کرامت کا لباس پہنائے گا“ (سنن ابن ماجہ: ۱۱۵)

قرآن مجید اور ان احادیث سے معلوم ہوا کہ آداب شرع کی رعایت رکھتے ہوئے مصائب امامؑ کا ذکر عین ہدایت ہے اور اس سے دنیا اور آخرت میں رحمتیں اور کرامتیں حاصل ہوتی ہیں۔

اور روایت بالا سے جہاں امام حسینؑ کی شان تحدیث ظاہر ہوتی ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن و سنت کا چرچا آلِ اطہارؑ کے صرف مردوں تک محدود نہیں تھا، بلکہ اس گھرانے کی عفت مآب خواتین بھی علم نبوت سے آراستہ تھیں۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا؟ قرآن خود فرماتا ہے:

”وَ اذْکُرْنَ مَا یُتْلٰی فِیْ بُیُوتِکُنَّ مِنْ آیٰتِ اللّٰهِ وَالْحِکْمَةِ اِنَّ اللّٰهَ کَانَ لَطِیْفًا خَبِیْرًا“ (الاحزاب: ۳۴)

سنن بیہقی: ۲/۳۰۷ پر مذکور ہے:

”حسینؑ بن علیؑ بن ابی طالب نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ

نے فرمایا: ”مریض اگر ہو سکے کھڑا ہو کر نماز پڑھے، اگر کھڑا نہ ہو سکے تو بیٹھ کر نماز پڑھے، پھر اگر سجدہ نہ کر سکے تو اشارہ کرے اور سجدے کا اشارہ رکوع کے اشارے سے

پست کرے، اور اگر بیٹھ کر بھی نماز نہ پڑھ سکے تو قبلہ رخ ہو کر دائیں پہلو پر لیٹ کر نماز پڑھے اور اگر دائیں پہلو پر لیٹنا بھی بس میں نہ ہو، تو چپت لیٹ کر نماز پڑھے، اس طرح کہ اس کے پاؤں قبلے کی سمت ہوں۔“

یہ روایت ”الفقه الحنفی وأدلته“: ۱/۲۵۰ پر مریض کی نماز کے باب میں حکم کی دلیل اور تفصیل کے طور پر ذکر کی گئی ہے۔

اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ امام حسنؑ اور امام حسینؑ نہ صرف صحابی ہیں بلکہ صاحب روایت بھی ہیں اور آپؐ کی روایات سے فقہاء استدلال بھی کرتے ہیں! خیال رہے کہ یہ تمام بحث اُن قواعد کی روشنی میں ہے جن کے تحت ایک عام شخص صحابی قرار پاتا ہے۔

امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی شخصیت ان قواعد سے بالا ہے، یہ حضرات خاص حیثیت کے حامل ہیں۔

صحابیت کے یہ اصول بالفرض آپؐ کی شخصیت پر منطبق نہ ہوتے تو بھی آپؐ کا مقام صحابی کے مقام سے فزوں تر ہی رہتا۔ اس لیے ان پاکیزہ نہاد شخصیات کو عمومی قواعد سے ہٹ کر پڑھنا اور پرکھنا چاہیے۔

خود رسول اللہ ﷺ نے بچپن میں حسنینؑ کو خاص حیثیت عطا فرمائی۔

آئیے ایک دو واقعے اس حوالے سے پڑھتے ہیں!

رسول اللہ ﷺ نے امام حسنؑ اور امام حسینؑ سے خصوصی بیعت لی

ترجمہ: امام جعفرؑ اپنے والد امام محمد باقرؑ سے روایت کرتے ہیں کہ ”رسول اللہ ﷺ نے حسن و حسین، عبد اللہ بن عباس اور عبد اللہ بن جعفر سے بیعت لی، جبکہ یہ نابالغ بچے تھے۔ آپؐ نے ہمارے سوا کسی بچے سے بیعت نہیں لی“ (البدایہ والنہایہ: ۲۲۶/۸)

امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی خصوصی گواہی

محمد بن سعد لکھتے ہیں:

ترجمہ: ”آپؐ خطوط پر کبھی گواہ کا نام بھی لکھواتے تھے، کبھی ایک گواہ، کبھی دو، کبھی زیادہ، ایک خط پر حسنؑ اور حسینؑ کی گواہی موجود ہے“ (الطبقات الکبریٰ: ۱/۲۸۹) دیکھیے کم سنی کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے آپؐ کی گواہی کو معتبر قرار دیا، اس سے امت میں آپؐ کی خاص حیثیت ظاہر ہوتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ سے خصوصی قرابت

محمد بن سعد بصری زہری لکھتے ہیں:

ترجمہ: ”حضرت علیؑ ہر سال منادی کراتے تھے کہ جس کسی کا رسول اللہ ﷺ پر کوئی حق ہو، وہ ہم سے طلب کرے۔ پھر حسنؑ اور حسینؑ نے بھی یہی عمل جاری رکھا“۔ (الطبقات الکبریٰ: ۲/۳۱۹)

یزید کی سند مردود ہے

امام حسینؑ کا علمی و روحانی مقام ہم پڑھ چکے، اب یزید کا حال بھی پڑھ لیجئے۔ ابوالفرج ابن الجوزیؒ اپنی کتاب ”المنتظم فی تواریخ الملوک والامم“ میں لکھتے ہیں:

”یزید نے اپنے والدؑ کی وساطت سے رسول اللہ ﷺ سے حدیث روایت کی ہے اور یزید تک ہماری سند بھی متصل ہے، لیکن امام احمد سے پوچھا گیا: کیا یزید سے حدیث روایت کی جاسکتی ہے؟ فرمایا: نہیں، اس میں کوئی عزت نہیں۔

اس لیے ہم نے یزید کی وساطت سے کوئی حدیث روایت نہیں کی“

(الحسینؑ حفیداً وشہیداً: ۳۲)

ان جلیل القدر ائمہ حدیث کی اس احتیاط سے یزید کی شخصیت کو سمجھنا اور واقعہ کربلا کے بارے میں صحیح نتیجے تک پہنچنا ہمارے لیے آسان ہو جاتا ہے۔

یزید کے بارے میں چند اکابر علمائے کی آراء

یزید کی شخصیت کے بارے میں صحابہ کرامؓ اور اکابر علماء و فقہاء کی آراء گزشتہ صفحات میں آپ نے پڑھیں، مزید چند آراء ملاحظہ کیجئے:

☆ مسند الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ (۱۱۱۲ھ - ۱۱۷۶ھ)

رقم طراز ہیں:

ترجمہ: ”یزید شام میں اور مختار عراق میں داعیان ضلالت تھے..... بالاتفاق قرون خیر میں کچھ لوگ منافق یا فاسق تھے، حجاج بن یوسف، یزید بن معاویہؓ اور مختار ثقفی اسی ٹولے میں شامل ہیں۔“ (حجۃ اللہ البالغہ: ۲/۲۱۳، ۲/۲۱۵)

خیال رہے کہ ابو عبید بن مسعود ثقفیؓ جلیل القدر صحابی ہیں اور مختار انہی کا بیٹا ہے۔

☆ مشہور محدث اور فقیہ قاضی ثناء اللہ پانی پٹیؒ (۱۱۴۳ھ - ۱۲۲۵ھ)

سورۃ النور، آیۃ استخلاف: ۵۵ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

اس آیت میں جن مؤمنین صالحین سے خلافت کا وعدہ فرمایا گیا، ان کا مصداق اولین خلفاء راشدینؓ ہیں اور آیت کے آخر میں یہ جو فرمایا:

”ومن کفر بعد ذلک فاولئک ہم الفاسقون“ (النور: ۵۵)

ترجمہ: ”اور اس کے بعد جس نے کفر کیا تو یہی لوگ فاسق ہیں۔“

یہ یزید بن معاویہؓ کی طرف اشارہ ہے کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کے نواسےؓ اور اہل بیتؓ نبوی کو قتل کیا، آپؐ کی عترت کی توہین کی اور اس پر فخر کیا۔

(تفسیر مظہری: ۶/۵۵۳)

☆ بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تحقیق و اثبات شہادت

امام حسینؑ کے عنوان سے مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ کے نام اپنے ایک مکتوب فارسی میں

تحریر فرماتے ہیں:

ترجمہ: ”جس وقت امیر معاویہؓ نے یزید پلید کو اپنا ولی عہد بنایا تھا تو وہ علانیہ فاسق نہ تھا“ (ص: ۷۶)

”پوشیدہ خرابیوں کی وجہ سے، جو یزید میں پائی جاتی تھیں، وہ فضیلتوں سے محروم رہا، جس طرح منافقین اللہ کی رضا سے محروم رہے۔“ (ص: ۷۷)

”امیر معاویہؓ کے انتقال کے بعد یزید نے پر پرزے نکالنے شروع کیے، خواہش نفس کا اسیر ہو گیا، ہاتھوں میں جام آ گیا، علانیہ فاسق ہو گیا، نماز ترک کر دی، اور ہم نے جو اصول بیان کیے ہیں، ان کی روشنی میں وہ اس قابل تھا کہ اسے معزول کر دیا جاتا“ (ص: ۷۸)

”حضرت امام حسینؑ سید الشہداء کی جان نازنین پر جو کچھ گذرا، وہ سب جانتے ہیں، باعث اس کا فقط حق گوئی تھا، ورنہ یزید کا کلمہ کہہ دیتے تو جان کی جان بچتی اور الثامال و دولت اور اعزاز و اکرام ہوتا۔“ (ہدیۃ الشیعہ: ۱۷۳)

”حضرت امام حسینؑ یزید پلید سے خلافت مغصوبہ کے طالب ہوئے، یہاں تک کہ نوبت شہادت کو پہنچی“ (ہدیۃ الشیعہ: ۲۸۱)

☆ ہمارے اسلاف عموماً یزید کو پلید کے لاحقے کے ساتھ لکھتے اور بولتے تھے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امت میں ایسا خبیث النفس کوئی اور نہیں ہوا۔

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ حضرت خواجہ غلام فرید فاروقی چشتیؒ کی مدح میں فرماتے ہیں:

”دیگراں بنجیہ کار و خواجہ ما

جامہ عشق پارہ پارہ درید

سرمہ چشم شد بخاری را

خاک پائے غلام خواجہ فرید

حسرتے از دلِ ندیم نہ رفت
کہ نصیبش نہ شد نگاہِ فرید
ہر کہ بدگفت خواجہ مارا
ہست او بے گماں یزید پلید

(سواطع الالهام: ۱۰۲، ۱۰۳)

سراپادینا، سراپادین

نقشبندی سلسلے کے ایک شیخ ہوئے ہیں حضرت مولانا محمد یارؒ، جھنگ سے تعلق رکھتے تھے، ابھی چند سال پہلے انتقال ہوا ہے، عجب صاحب جذب بزرگ تھے، فقیر کو متعدد بار ان کی زیارت کا شرف حاصل ہوا، ان کی سوانح حیات میں ان کا ایک ملفوظ ہے:

”حدیث نبوی ہے کہ ”دنیا کی محبت تمام گناہوں کی جڑ ہے“۔

دنیا میں جتنے مظالم ہوتے ہیں، وہ سب حبِ دنیا کی وجہ سے ہوتے ہیں۔
اگر سراپادینا دیکھنی ہو تو شمر اور ابن زیاد کو دیکھ لیں اور سراپادین دیکھنا ہو تو سیدنا حسینؑ کو دیکھ لیں“
(یادیار مہربان آید ہے: ۹۷)

تاریخ انبیاء علیہم السلام کی سب سے بڑی قربانی

ہر دور میں حق کے سب سے بڑے علمبردار انبیاء علیہم السلام رہے اور حق کی خاطر ہمیشہ بڑی قربانی انبیاء اور ان کے اہل بیت نے دی، کبھی خاندان کا مقاطعہ، کبھی معاشی تکلیفیں، کبھی ترک وطن، کبھی ذہنی اذیتیں اور کبھی جان کا نذرانہ، انبیاء کرام علیہم السلام کی تاریخ ان قربانیوں سے روشن نظر آتی ہے۔

نبی اکرم ﷺ اور آپ کے اہل بیت نے بھی دین کی خاطر ہر نوع کی قربانی دی، لیکن جان کی جتنی بڑی قربانی آپ کے اہل بیت نے، گویا آپ نے، دی، انبیاء کرام علیہم السلام کی پوری تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

سیدنا حمزہؓ کی دردناک شہادت کی نظیر کوئی کہاں سے لائے گا اور سیدنا جعفرؓ کی طرح شہید ہو کر طیار کا اعزاز اور کون پائے گا! یہ شہادتیں کفر و شرک کے مقابلے میں تھیں۔

پھر ظلم و جور اور ملوکیت کے مقابلے میں پہلے شہر کوفہ میں مسلم بن عقیلؓ اور اس کے بعد سرزمین کربلا پر تیس (۲۳) اہل بیتؓ اور کئی متعلقین کی اس انداز میں شہادت کہ گلشن نبوت کے پھولوں کو بھوکا پیاسا رکھ کر پہلے شہید کیا گیا پھر گھوڑوں کے سموں تلے روندنا گیا..... اور امیر المؤمنین سیدنا علیؓ اور امیر المؤمنین سیدنا حسنؓ کی شہادتیں بھی تو اسی حق کی راہ میں تھیں، جس حق کی خاطر کربلا کا سانحہ رونما ہوا..... پھر ان شہداء میں عمر رسیدہ بوڑھوں اور کڑیل جوانوں کے ساتھ شیر خوار بچے بھی شامل ہیں..... علاوہ ازیں سیدنا حمزہؓ اور سیدنا جعفرؓ کو چھوڑ کر باقی تمام شہادتیں اُن لوگوں کے ہاتھوں ہوئیں، جو ایمان کا دعویٰ رکھتے تھے اور محمد و آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صلوٰۃ و سلام پڑھتے تھے..... اس طرح اس قربانی میں جسمانی شہادت کے ساتھ شدید ذہنی اذیت بھی داخل ہے۔

ان کیفیتوں کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کے اہل بیت اطہارؑ کی جانی قربانی ستائیس (۲۷) جانوں پر مشتمل ہے۔

انبیاء کرامؑ کی پوری تاریخ میں اتنی بڑی قربانی آپ کو کہیں نہیں ملے گی، اور جس کی قربانی سب سے بڑی اس کا مقام بھی سب سے بڑا! صلی اللہ علیہ وآلہ وبارک وسلم

یہاں ہم سانحہ کربلا میں مقام شہادت پانے والے اہل بیتؑ کے اسماء گرامی اور تعداد رقم کر رہے ہیں اور اس تفصیل کا اہم ماخذ امام طبرانی کی معجم کبیر ہے:

☆ امیر المومنین سیدنا علیؑ ابن طالب کے آٹھ فرزند:

- (۱) امام حسین بن علی
- (۲) عباس بن علی
- (۳) جعفر بن علی
- (۴) عبد اللہ بن علی
- (۵) عثمان بن علی
- (۶) محمد بن علی
- (۷) ابو بکر بن علی
- (۸) ابراہیم بن علی (کافی الامامة والسياسة: ۷۲/۷۳)

☆ امام حسینؑ کے تین فرزند:

- (۹) علی بن حسین آپ علی اکبر کے نام سے مشہور ہیں۔
- (۱۰) علی بن حسین آپ علی اصغر کے نام سے معروف ہیں۔

(الحسن والحسين: ۷۸)

(۱۱) عبد اللہ بن حسین

☆ امام حسنؑ کے تین فرزند:

(۱۲) ابو بکر بن حسن

(۱۳) عبد اللہ بن حسن

(۱۴) قاسم بن حسن

☆ عبد اللہ بن جعفرؑ بن ابی طالب کے دو فرزند:

(۱۵) عون بن عبد اللہ

(۱۶) محمد بن عبد اللہ

☆ عقیلؑ بن ابی طالب کے چار فرزند:

(۱۷) جعفر بن عقیل

(۱۸) عبد الرحمن بن عقیل

(۱۹) عبد اللہ بن عقیل

(۲۰) مسلم بن عقیل آپؑ کو فہ میں شہید ہوئے۔

☆ مسلم بن عقیل کے دو فرزند:

(۲۱) عبد اللہ بن مسلم

(۲۲) عبد الرحمن بن مسلم (کماروی ابن کثیرؒ، الحسین حنفیہ اوشہیداً: ۲۵۶)

☆ ابوسعید بن عقیل کے فرزند:

(۲۳) محمد بن ابی سعید



رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے۔ ”مولى القوم من أنفسهم“ (مشکوٰۃ مع مرقاۃ ۴/۱۶۹ عن الترمذی والنسائی وابن داؤد) یعنی قوم کا مولیٰ (آزاد کردہ غلام) انہی میں شمار ہوتا ہے، اس طرح درج ذیل دو موالیٰ بھی شہداء اہل بیت میں محسوب ہوں گے:

(۱) سلیمان بن زرین (غلام حسینؑ)

(۲) منجھ بن سہم (غلام حسنؑ)



امام حسینؑ کا رضاعی بھائی:

عبداللہ بن بقطر الحمری

رضی اللہ عنہم اجمعین

امام زین العابدین علی بن حسینؑ (علی اوسط) کو اور حسن بن حسن بن علیؑ کو اور عمر بن حسن بن علیؑ کو کم سنی کی وجہ سے چھوڑ دیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے انہی سے رسول اللہ ﷺ کی نسل جاری فرمائی۔ (الحسینؑ حفیداً وشہیداً: ۱۶۸-۱۶۹) حسن بصریؒ نے فرمایا: ”امام حسینؑ کے ساتھ آپؐ کے اہل بیت کے سولہ ایسے افراد شہید ہوئے کہ اس وقت روئے زمین پر ان کی کوئی مثال نہ تھی“

(الحسینؑ حفیداً وشہیداً: ۲۵۷)

نوٹ: (۱) اس وقت میرے سامنے جو تاریخی مآخذ ہیں ان میں اہل بیتؑ کے یہی اسماء ہیں، جو اوپر مذکور ہوئے، لیکن میرے پاس کربلا کی ایک سی، ڈی ہے، اس میں ”ابراہیم بن مسلم بن عقیل بن ابی طالب“ اور ”محمد بن مسلم بن عقیل بن ابی طالب“ کے مزارات بھی دکھائی دیتے ہیں، نیز محمد رضا کی تالیف ”الحسنؑ والحسینؑ“ کے محقق ڈاکٹر احمد ابوالشباب نے کتاب مذکور کے صفحہ ۱۳۴ پر اپنے فٹ نوٹ میں شیعہ مراجع کے حوالے سے شہداء کربلا میں ”عمر بن علیؑ بن ابی طالب“ اور ”ابوبکر بن حسینؑ

بن علیؑ کے اسماء بھی ذکر کیے ہیں۔ اس طرح ان چار کے ساتھ شہداء اہل بیتؑ کی تعداد اکتیس (۳۱) ہے، اور ایک رضاؑی بھائی اور دو غلاموں کے ساتھ تعداد چونتیس (۳۲) ہو جاتی ہے۔

(۲) تاریخی مآخذ میں شہداء کے اسماء اور تعداد میں کافی الجھاؤ ہے، فقیر نے اس بارے میں بساط بھر تحقیق و تنقیح کی کوشش کی ہے۔ فالحمد للہ علی ذلک

وہ آپس میں رحیم

شہداء اہل بیتؑ کے اسماء گرامی آپ کے سامنے ہیں، ان میں سیدنا علیؑ بن ابی طالب کے بیٹوں میں ابوبکر اور عثمان ہیں اور آپؑ کے ایک فرزند کا نام عمر تھا۔ (المرتضیٰ: ۲۸۲) امام حسنؑ کے بیٹوں کے نام ابوبکر اور عمر ہیں، امام حسینؑ کے ایک بیٹے کا نام ابوبکر ہے۔
الہی یہ کیا ماجرا ہے؟

لوگ تو کہتے ہیں کہ اہل بیتؑ اور خلفاء ثلاثہؑ کے درمیان عداوت تھی، باہم بغض تھا، یہ ایک دوسرے سے نفرت کرتے تھے۔

آج بھی خلفاء ثلاثہؑ کی محبت میں غلو کرنے والے اپنی اولاد میں اہل بیتؑ کے نام نہیں رکھتے اور اہل بیتؑ کی محبت میں غلو کرنے والے خلفاء ثلاثہؑ کے ناموں سے بھاگتے ہیں۔

لیکن سیدنا علیؑ اور سیدنا حسنؑ اور سیدنا حسینؑ نے اپنی اولاد کے نام خلفاء ثلاثہؑ کے ناموں پر رکھے، کیا کوئی دشمن کے نام پر اپنی اولاد کے نام رکھتا ہے!
علاوہ ازیں سیدنا علیؑ نے سیدنا ابوبکرؑ کی بیوہ اسماءؑ بنت عمیس سے نکاح کیا اور ابوبکرؑ کے بیٹے محمدؑ کی پرورش کی، پھر اپنی بیٹی، دختر فاطمہؑ سیدہ ام کلثومؑ کا نکاح سیدنا عمرؑ سے کیا اور ایام فتنہ میں امام حسنؑ اور امام حسینؑ کو سیدنا عثمانؑ کے گھر کے باہر حفاظت کے لیے مقرر فرمایا۔ (تاریخ اسلام، متعلقہ مقامات)

ان حقائق کا واضح نتیجہ یہ ہے کہ خلفاء ثلاثہؑ اور اہل بیتؑ کے درمیان عداوت و نفرت کی باتیں دشمنانِ اسلام کی اڑائی ہوئی ہیں، تاکہ اُن کے نام لیوا آپس میں لڑتے اور مرتے رہیں۔

کاش ہم خلفاء ثلاثہؑ اور اہل بیتؑ کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں مرکزِ رحمت و محبت کی طرف پلٹ آئیں، ورنہ اس کارزارِ ہستی میں بقا مشکل ہے:

تم ہو آپس میں غضبناک، وہ آپس میں رحیم
تم خطا کار و خطابیں، وہ خطا پوش و کریم
چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوجِ ثریا پہ مقیم
پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلبِ سلیم!

تختِ فغفور بھی اُن کا تھا، سریر کے بھی
یوں ہی باتیں ہیں، کہ تم میں وہ حمیت ہے بھی؟

خود کشی شیوہ تمہارا، وہ غیور و خود دار
تم اخوت سے گریزاں، وہ اخوت پہ نثار
تم ہو گفتار سراپا، وہ سراپا کردار
تم ترستے ہو کلی کو، وہ گلستاں بکنار

اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت اُن کی
نقش ہے صفحہٴ ہستی پہ صداقت اُن کی!
(اقبال، جوابِ شکوہ)

رسول و آل رسول ﷺ کا مقام تسلیم و رضا

امتحان، امتحان ہی ہوتا ہے، لیکن کیفیت اور نوعیت بدلنے سے امتحان کی شدت اور حدت بھی بدل جاتی ہے۔

ابراہیمؑ سے خلّت کا امتحان ہوا اور رسول اللہ ﷺ سے محبت کا، دونوں نے تسلیم و رضا کی اعلیٰ مثال قائم فرمائی! لیکن غور کیجئے تو رسول اللہ ﷺ کا امتحان محبت کئی اعتبار سے بڑھا ہوا ہے۔

سیدنا ابراہیمؑ سے خلّت کا امتحان اکلوتے بیٹے کی قربانی کی فرمائش سے ہوا..... سورہ الصافات: ۱۰۲-۱۱۰ میں یہ واقعہ تفصیل سے مذکور ہے..... اور رسول اللہ ﷺ کی محبت کو شہادت حسینؑ کی خبر سے پرکھا گیا۔

ابراہیمؑ کو قربانی کا حکم خواب میں ملا، رسول اللہ ﷺ کو بیداری میں حسینؑ کی شہادت کی خبر دی گئی۔ جیسا کہ ام الفضلؑ اور ام سلمہؓ کی روایات سے معلوم ہوا۔ ابراہیمؑ کو اپنے بیٹے کی قربانی کا حکم ملا، رسول اللہ ﷺ کو بیٹی کے بیٹے کی شہادت کی خبر ملی۔ اپنے بیٹے کا صدمہ صرف اپنے تک محدود رہتا ہے، نواسے کا صدمہ اپنے ساتھ بیٹی کو بھی دل فگار کر دیتا ہے، یہ صدمہ کئی صدموں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ابراہیمؑ نے یہ خواب تین رات دیکھا..... جیسا کہ مفسرین نے لکھا ہے..... تیسرے دن قربانی کر دی، وقت امتحان پورا ہو گیا۔

امام حسینؑ ۵ شعبان ۴ھ کو پیدا ہوئے اور ۱۰ محرم ۶۱ھ کو شہید ہوئے۔ چھپن (۵۶) سال پانچ ماہ، پانچ دن عمر مبارک ہے، اس عمر میں ۶ سال، ۷ ماہ، ۷ دن آغوش رسالت میں بسر ہوئے۔ دوران رضاعت ہی میں رسول اللہ ﷺ حسینؑ کی شہادت سے آگاہ ہو چکے تھے۔ ابتدائی چند ماہ چھوڑ دیے جائیں تو خبر شہادت کے بعد رسول ﷺ نے ۶ سال اور آل رسول ﷺ نے ۵۶ سال انتظار شہادت میں گزارے۔

اتنا طویل امتحان، اللہ اکبر! لا الہ الا اللہ!

ابراہیمؑ نے قربانی خود اپنے ہاتھ سے کی اور عزت و تکریم سے کی، حسینؑ کے بارے میں یہ خبر دی گئی کہ اسے دوسرے لوگ قتل کریں گے اور دوسرے بھی پر ایسے نہیں اپنے، آپؑ کے نام کا کلمہ پڑھتے ہوں گے اور آپؑ کے جگر گوشہ کو قتل کریں گے اور ظلم و ستم کی ساری جاہلی رسمیں اس کے جسم پر، نہیں آپؑ کے جسم پر، پوری کریں گے اور سینوں میں دبی بغض و کینہ کی پرانی آگ کو ٹھنڈا کریں گے۔

ابراہیمؑ کی قربانی کے ثمرات صرف ذات تک محدود رہتے ہیں، رسول اور آل رسول علیہم السلام کی قربانی کے اثرات اسلام کے پورے سیاسی نظام پر پڑتے ہیں اور پوری امت اس کے ثمرات سے بہرہ یاب ہوتی ہے۔

اس طرح رسول و آل رسول علیہم السلام کی قربانی اپنے جدا مجد کی قربانی سے کئی اعتبار سے فوقیت رکھتی ہے اور ایسا کیوں نہ ہو؟ ابراہیمؑ و اسماعیل علیہما السلام نے قربانی کی جو طرح نو ڈالی تھی، حسین علیہ السلام نے اسے پایہ تکمیل تک پہنچایا:

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم

نہایت اس کی حسینؑ، ابتدا ہے اسماعیلؑ

اور جس کی قربانی سب سے اونچی، اس کا مقام بھی سب سے اونچا!

ابراہیمؑ کو قربانی کا صلہ یہ ملا کہ آئندہ نسلیں انہیں ہدیہ سلام پیش کریں گی،

چنانچہ کر رہی ہیں!

رسول اللہ ﷺ کو قربانیوں کی جزا یہ عطا ہوئی:

”ورفعنا لک ذکرک“

چنانچہ آج زمین کی گہرائیوں سے، آسمان کی بلندیوں سے، کائنات کے

تمام کناروں سے ایک ہی آواز بلند ہو رہی ہے:

اللهم صل علی محمد وآلہ وبارک وسلم

امام حسینؑ کی شخصیت اور موقف کو قرآن و حدیث کی روشنی میں پڑھنا چاہیے

قرآن و حدیث کا تمام ذخیرہ اہل بیتؑ کی منقبت بیان کر رہا ہے، البتہ یزیدی امارت قرآنی وعیدوں کی زد میں بھی آتی ہے اور حدیثی پیشگوئیوں کا مصداق بھی ٹھہرتی ہے، جن میں اس امارت کو لعنت سے سرفراز کیا گیا ہے۔

رہی تاریخ! اس میں آزاد مؤرخین امام حسینؑ کے موقف کی تائید کرتے ہیں، اور جہاں ملوکیت نے شب خون مارا، مورخ کے قلم کو پابند کر دیا، وہاں آپ کو یزید کی تعریف بھی مل جائے گی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد جو دور آیا، اس میں اہل بیتؑ کی کردار کشی کی گئی، بالکل اسی انداز میں، جیسے آجکل مخالفین کی ہوتی ہے۔ اموی دور میں خاص طور پر ایسا ہوا، عباسی دور میں بھی اہل بیتؑ سے کچھ بہتر سلوک نہیں ہوا۔ ان ادوار میں ایک مہم کے طور پر اہل بیتؑ کے مثالب اور حکومت وقت کے مناقب پھیلانے گئے۔

یہ تو حق پرست علما اور محدثین جان پر کھیل کر اگر اہل بیتؑ کے مناقب محفوظ نہ کرتے تو حقیقت تاریخ کے دھند لکوں میں ایسے ہی گم ہو جاتی جیسے قرآن سے پہلے حضرت مسیحؑ کی شخصیت اندھیروں میں گم تھی، اور جیسے اب مسیح کے بارے میں صرف وہی روایات قابل قبول ہیں، جو قرآن کے مطابق ہوں، اسی طرح اہل بیتؑ کے بارے میں بھی صرف وہی روایات قبول کی جائیں گی، جو قرآن و حدیث کے مطابق ہوں۔ اہل بیتؑ کے بارے میں تاریخ کی جتنی روایات قرآن و حدیث سے ٹکراتی ہیں، مردود ہیں۔ جن لوگوں نے زندگی میں زور و زور کردار کشی اور توہین کی ہو، انہوں نے پس پشت کیا کچھ نہیں کیا ہوگا؟!

آیا یزید منصب خلافت پر فائز ہو چکا تھا؟

تحریر: سید ابو بکر غزنویؒ

سابق وائس چانسلر اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور

بعض حامیان بنو امیہ کہتے ہیں کہ یزید منصب خلافت پر فائز ہو چکا تھا اور سیدنا حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر شرعاً واجب تھا کہ اس کے ہاتھ پر بیعت کرتے، اس کے خلاف خروج کرنا حضرت امام حسینؑ کے لیے جائز نہ تھا اور خروج کرنے والے کی سزا تو قتل ہی ہے!

اس الزام کو ثابت کرنے کے لیے وہ احادیث و اقوال کے انبار لگا دیتے ہیں: حضور ﷺ نے فرمایا:

”من اتاكم وأمرکم علی رجل واحد یرید أن یفرق جماعتكم فاقتلوه“ (صحیح مسلم: کتاب الامارۃ)
یعنی ”جب تم کسی شخص کی خلافت پر اکٹھے ہو جاؤ اور کوئی دوسرا مدعی خلافت تمہارا شیرازہ بکھیرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو تو اسے قتل کر دو۔“

پھر بعض حضرت حدیفہؓ کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں:

”تكون بعدی ائمة لا یهتدون بهدای ولا یستنون بسنتی و سيقوم فیهم رجال قلوبهم قلوب الشیاطین فی جثمان انس۔ قال: قلت کیف أصنع یا رسول الله إن أدركت ذلک؟ قال: تسمع و تطیع و إن ضرب ظهرك و أخذ مالک فاسمع و اطع“ (مسند احمد، مسلم: کتاب الامارۃ)
یعنی ”میرے بعد ایسے امام ہوں گے جو میرا طور طریق چھوڑ دیں گے، میری سنت پر نہیں چلیں گے، اور عنقریب ان میں ایسے

لوگ حکمران ہوں گے کہ اُن کا جسم تو انسانوں کا ہوگا، مگر دل شیطان کا سا۔ حذیفہؓ کہتے ہیں، میں نے پوچھا: اگر میں ایسا زمانہ پاؤں تو کیا کروں؟ فرمایا: سنو اور اطاعت کرو، اگرچہ تمہاری پیٹھ پر تازیانے لگائے جائیں اور تمہارا مال چھین لیا جائے تب بھی ان کی سنو اور اطاعت کرو۔“

اس میں شک نہیں کہ ایسی احادیث کثرت سے ملتی ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر کسی کی خلافت پر امت کا اجماع ہو جائے تو جنگ و قتال سے بچنے کی خاطر اور ملی اتحاد و یگانگت قائم رکھنے کے لیے اُس کی اطاعت سے روگردانی جائز نہیں ہے، اگرچہ وہ خلیفہ اہلیت و استحقاق کے اعتبار سے اسلام کے ٹھیرائے ہوئے معیار پر پورا نہ اترتا ہو یا فقہی اصطلاح میں یوں کہیے کہ وہ جامع الشروط نہ ہو۔

آئیے اب ہم دیکھیں:

۱۔ آیا یزید منصب خلافت پر فائز تھا؟ کیا اس کے منصب پر خلافت کا اطلاق بھی ہو سکتا ہے؟

۲۔ کیا اس کی حکومت پر امت کا اجماع ہو گیا تھا؟

۳۔ کیا حضرت حسینؑ نے اس پر خروج کیا تھا؟

خلفائے راشدینؑ کے انتخاب پر ایک نظر

ہم خلفائے راشدینؑ کے انتخاب اور یزید کے تقرر کی تاریخ پر ایک نظر ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کیا یزید کی حکومت پر خلافت کا اطلاق ہوتا ہے؟

۱۔ خلیفہ اولؑ کا انتخاب

حضور اکرم ﷺ نے اپنا جانشین خود مقرر نہیں کیا بلکہ انتخاب امت کی مرضی پر چھوڑ دیا۔

سقیفہ بنو ساعدہ میں صد ہا صحابی اکٹھے ہوئے، مہاجرین و انصار کی آپس میں تیز تیز بحثیں ہوئیں، اور آخر سب نے متفقہ طور پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اگلے روز آپ مسجد نبوی میں منبر پر تشریف فرما ہوئے اور عامۃ الناس نے بھی آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ (البدایہ والنہایہ: ۵/۲۳۸)

۲۔ خلیفہ دوم کا انتخاب

حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کا نام ارباب حل و عقد کے سامنے پیش کیا۔ عبدالرحمانؓ ابن عوف، عمرؓ بن خطاب، علیؓ ابن ابی طالب، سعیدؓ ابن زید، ابوالاعورؓ، اسید بن حضیرؓ، اس شوریٰ کے ممتاز افراد تھے اور یہ وہ لوگ تھے جنہیں عوام اپنا نمائندہ سمجھتے تھے۔ ارباب حل و عقد نے پوری آزادی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا۔ صدیق اکبرؓ نے شوریٰ کے بعد مجوزہ نام رائے عامہ حاصل کرنے کے لیے عوام کے سامنے پیش کیا اور ان سے پوچھا: افسر ضون بہ؟ کیا آپ ان کے حق میں ووٹ دیتے ہیں؟ تجویز پر غور کرنے کے بعد سب لوگوں نے کہا: قد رضینا ہم اس تجویز کو منظور کرتے ہیں۔ حضرت علیؓ نے تو لکار کر کہا تھا کہ ہم عمرؓ بن خطاب کے علاوہ کسی اور شخص پر رضا مند نہیں ہوں گے۔

(اسد الغابہ: ۴/۶۹، تاریخ الامم والملوک للطبری: ۴/۵۱، ۵۲)

یہ جو حضرت صدیق اکبرؓ نے حضرت عمرؓ کا نام پیش کیا تو یہ محض ایک تجویز تھی قطعی حکم نہ تھا۔ اگر یہ قطعی حکم ہوتا تو شوریٰ کیوں طلب کیا تھا اور عوام سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی کہ: افسر ضون بہ؟

۳۔ خلیفہ سوم کا انتخاب

حضرت عثمانؓ کا انتخاب بھی استصواب رائے عامہ سے ہوا۔ حضرت عمرؓ مجوسی غلام کے خنجر سے زخمی ہوئے تو فوراً مجلس شوریٰ کا انتخاب کیا

(اس مجلس شوریٰ کے ارکان یہ تھے: علیؑ بن ابی طالب، عثمانؓ بن عفان، سعدؓ بن ابی وقاص، عبدالرحمانؓ بن عوف، زبیرؓ بن عوام، طلحہؓ بن عبید اللہ اور عبداللہ بن عمرؓ) تاریخ الاسلام، ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن، ۱/۳۵۴ قاہرہ)

آپؑ نے مجلس شوریٰ کے ارکان سے فرمایا: میں نے تمہیں مجلس شوریٰ کا رکن محض اس لیے بنایا ہے کہ تم عوام الناس کے سردار ہو اور انہوں نے اپنی قیادت کی زمام تمہارے ہاتھ میں دے رکھی ہے۔ مجھے اطمینان ہے کہ لوگ تم پر اعتماد رکھتے ہیں، اس لیے کہ وہ آگاہ ہیں کہ حضور اکرم ﷺ زندگی بھر تم سے خوشنود رہے ہیں۔“
(تاریخ طبری: ۵/۳۵، ۳۴)

آپؑ نے اپنے بیٹے عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں صاف کہہ دیا تھا: ”لیس له من الاموشیء“ خلافت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے (اسد الغابہ: ۴/۷۵)

(یہ بات قابل غور ہے کہ بیٹے کو مجلس شوریٰ میں تو شامل فرمایا، لیکن اہلیت کے باوجود انہیں منصب خلافت سے الگ رکھنے کی وصیت فرمائی! یہ فیصلہ حضرت عمر فاروقؓ کی دورانہیستی اور حزم و احتیاط کی زریں مثال ہے)

مجلس شوریٰ نے حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف کو اختیار دیا کہ وہ جمہوری مشورے کے بعد حضرت علیؑ اور حضرت عثمانؓ میں سے کسی ایک کا انتخاب کریں۔ تین دن اور تین راتیں مسلسل استصواب رائے عامہ کے بعد حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف نے حضرت عثمانؓ کی خلافت کا اعلان کیا تھا۔

ابن کثیرؒ لکھتے ہیں: از دحم الناس یبایعون عثمانؓ حتی غشوه تحت المنبر ”بیعت کرنے کی غرض سے لوگوں نے حضرت عثمانؓ پر ہجوم کیا حتیٰ کہ منبر کے پاس انہیں ڈھانپ لیا۔“ (البدایہ والنہایہ: ۷/۱۴۵، ۱۴۶)

ابن اثیرؒ نے زید بن وہب سے حضرت علیؑ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حکومت کو خاندانی میراث نہیں سمجھا ورنہ وہ اپنے بیٹے کو امیر نامزد کرتے (اسد الغابہ)

۴۔ خلیفہ چہارمؑ کا انتخاب

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد لوگوں نے حضرت علیؑ سے درخواست کی کہ منصب خلافت آپ سنبھالیے! حضرت علی مرتضیٰؑ نے فرمایا: مجھے امیر مت بناؤ، بہتر یہی ہے کہ تم مجھے وزیر بنالو۔ لوگوں نے جب یہم اصرار کیا تو آپ نے فرمایا: ففی المسجد، فان بیعتی لا تكون خفیا ولا تكون إلا عن رضی المسلمین۔“
تو فیصلہ مسجد میں ہوگا، میری بیعت نہ چوری چھپے ہو سکتی ہے نہ مسلمانوں کی رضامندی کے بغیر ہی۔ (تاریخ الامم والملوک، طبری، ۱۵۲/۵)

(امام حسنؑ کا انتخاب)

اسی طرح امیر المؤمنین سیدنا علیؑ سے زخمی ہونے کی حالت میں جب عرض کیا گیا کہ ”آپ خلیفہ کیوں نہیں مقرر کر دیتے؟“

تو فرمایا ”لا ولكن اترككم كما ترككم رسول الله“ ”نہیں میں تمہیں ویسے ہی چھوڑوں گا، جیسے رسول ﷺ نے تمہیں چھوڑا تھا۔“

عرض کیا گیا: اگر اللہ نے پوچھ لیا کہ امت کو بے سہارا کیوں چھوڑ آئے! فرمایا: عرض کروں گا، جب تک آپ نے مجھے زندہ رکھا، میں، بقدر استطاعت، اصلاح کی کوشش کرتا رہا، اور جب آپ نے مجھے بلالیا تو میں ذمہ داری سے بری ہوا۔“ (ابن کثیر: ۳۲۳/۷)

یہ تقریباً وہی جواب ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام استفسار پر بروز قیامت بارگاہ الہی میں عرض کریں گے۔ کہ (ترجمہ) ”جب تک میں ان میں رہا، انہیں دیکھتا بھالتا رہا، پھر جب آپ نے مجھے اٹھالیا تو آپ ہی ان کے نگران تھے اور آپ تو ہر چیز کی خبر رکھتے ہیں“ (المائدہ: ۱۱)

رسول خدا ﷺ نے سیدنا علیؑ سے فرمایا تھا ”فیک مثل من عیسیٰ“ تجھ میں عیسیٰ

کی کچھ شان پائی جاتی ہے“ (مسند احمد، مشکوٰۃ: ۵۶۵) اس شان کا ایک ظہور جواب مذکور میں بھی ہوا!

بہر کیف! سیدنا علیؑ نے اہلیت کے باوجود اپنے بیٹے یا کسی دوسرے کو خلیفہ نامزد کرنے سے صریح انکار فرمایا۔ اور آپ کی وفات کے بعد عوام نے بیعت عامہ سے سیدنا حسنؑ کو خلیفہ منتخب کیا۔ ابن کثیر، ۱۴/۸

پس خلافت راشدہ کا ہر ہر ورق یہ گواہی دیتا ہے کہ اسلامی نظام حکومت میں خلیفہ کا انتخاب جمہور کے باہم فیصلے سے ہوتا ہے، اہلیت و استحقاق کی بنا پر ہوتا ہے، خاندانی وراثت کے اصول پر نہیں ہوتا۔

وہ ملوکیت ہی ہے جو خاندانی وراثت کی بنا پر ملتی ہے، اور وہ ولی عہدی ہی ہے جس کا تقرر جمہوری مشورے کے بغیر ہوتا ہے۔

حضرت عمرؓ کا اعلان حقیقت

حضرت عمرؓ نے تو صاف کہہ دیا تھا: ”لا خلافة إلا عن مشورة“ عام مشورے کے بغیر خلافت کا قیام نہیں ہو سکتا، (کنز العمال: ۱۲۹/۳)

اور ”من بویع عن غیر مشورة المسلمین فانہ لا بیعة لہ“ ”جس کی علمۃ المسلمین کے مشورہ کے بغیر بیعت کی گئی تو اس کی بیعت نہ ہونے کے برابر ہے۔“

(تاریخ طبری ۵/۳۲۶، ۳۹)

حضرت علیؓ مرتضیٰ کا اظہار حقیقت

امیر معاویہؓ نے حضرت علیؓ کو لکھا تھا کہ تمہیں خلیفہ کس نے بنایا؟

حضرت علیؓ مرتضیٰ نے جواب دیا تھا:

”انہ بایعنی القوم الذین بایعوا أبابکر و عمر و عثمان علی ما بایعوہم علیہ فلم یکن للشاہد أن یختار ولا للغائب أن یرد و انما الشوری للمہاجرین و الانصار فبان اجتمعوا علی رجل و سموہ اماماً کان ذلک رضی اللہ“
(نہج البلاغہ: ۷/۲ مصر)

”جس قوم نے ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ کی بیعت کی تھی اور جن شرائط پر کی

تھی اسی قوم نے انہی شرائط پر میری بیعت بھی کی ہے۔

لہذا جو (مجلس انتخاب میں) موجود تھا، اب اسے بیعت توڑنے

کا اختیار نہیں اور جو غائب تھا اسے بیعت رد کرنے کا اختیار نہیں۔ اور شوریٰ کا حق صرف مہاجرین و انصار کو ہے، وہ اگر کسی پر ایکا کر لیں اور اسے خلیفہ سمجھ لیں تو اسی میں اللہ کی رضا و خوشنودی سمجھی جائے گی“

ایک لمحہ کے لیے اگر علی مرتضیٰؑ کے اس جواب پر ہم غور کریں تو بہت سے مابہ النزاع مسائل کا حل ہم اس جواب میں ڈھونڈ سکتے ہیں اور نہج البلاغہ کا حوالہ عمداً دے رہا ہوں، فبای حدیث بعدہ یؤمنون ؟

یزید کا تقرر

خلافت راشدہ کے بعد بنو امیہ کے دور میں اسلامی حکومت کا وہ نظام جو حضور اکرم ﷺ اور خلفائے راشدینؑ کی پیہم کاوشوں سے تشکیل پایا تھا، زیروزبر ہو گیا اور یزید کی ولی عہدی سے ملوکیت از سر نو مسلمانوں پر مسلط کر دی گئی، اور افسوس کہ یہ تقرر اکابر صحابہؓ کی زندگی میں اور ان کے علی الرغم ہوا۔

چنانچہ مروان نے جب مدینہ میں یزید کی ولی عہدی کا اعلان کیا تو عبدالرحمان بن ابوبکر غزوانی اٹھ کھڑے ہوئے اور علانیہ کہہ دیا: اے مروان! تم جھوٹ بول رہے ہو، تم لوگوں نے محمد (ﷺ) کی امت کے لیے خلیفہ نہیں چنا ہے بلکہ خلافت کو تم نے ہر قلیت (ملوکیت) سے بدل دیا ہے۔ حضرت حسینؑ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے بھی کھڑے ہو کر احتجاج کیا۔

ملوکیت کے اہم ترکیبی عناصر خاندانی وراثت اور شخصی اختیار ہی ہیں اور یہ دونوں عنصر اس تقرر میں بدرجہ اتم موجود تھے۔ استصواب رائے عامہ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ارباب حل و عقد سے بھی مشورہ لینے کی ضرورت نہ سمجھی گئی اور محض قوت کے بل بوتے پر یزید کی حکومت ٹھونس دی گئی۔

(کاش یزید کے تقرر میں خلافت راشدہ کی روشن مثالوں کی پیروی کی جاتی!)

ملوکیت اور خلافت میں فرق صحابہؓ سمجھتے تھے

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ ملوکیت اور جمہوریت کے نظریے آج کی پیداوار ہیں، قرن اول کے مسلمانوں کو ان بحثوں کی کیا خبر تھی!

یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو تاریخ اسلام سے یکسر نا آشنا ہو۔

ایک دفعہ ایک شخص حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ کو دور ہی سے دیکھ کر لرز نے لگا، آپ نے فرمایا: ”ہون علیک، لست بملک“ ڈرو نہیں، میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں۔ (رواہ البخاری)

فتح مکہ سے قبل ابوسفیان نے مسلمانوں کا آہن پوش لشکر دیکھا تو بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا: کتنی عظیم بادشاہت ہے! تو حضرت عباسؓ نے بلا تامل اسے جواب دیا تھا: ابوسفیان! یہ بادشاہت نہیں نبوت ہے! (سیرۃ ابن ہشام۔ روض، فتح مکہ: ۲/۲۹۹)

صدیق اکبرؓ نے منصب خلافت پر فائز ہونے کے بعد پہلی بار جب قوم سے خطاب کیا تو آپ نے کہا تھا: آج روئے زمین کے بادشاہ کہاں ہیں؟ وہ فنا ہو چکے، ہم نے روئے زمین پر خلافت قائم کی ہے، اگر ہم نے بھی ان کی روش اختیار کی تو ہم بھی ان کی طرح نیست و نابود ہو جائیں گے“ (طبری: ۳/۲۱۱)

عہد فاروقی کا یہ واقعہ تو مشہور و معروف ہے کہ جب روم کا سفیر مدینہ پہنچا اور اس نے دریافت کیا کہ تمہارا بادشاہ کہاں ہے؟ تو اس کو صحابہؓ کی طرف سے جواب ملا تھا: ”مالنا ملک بل لنا امیر“ ہمارا کوئی بادشاہ نہیں ہے، ہاں ہمارا امیر ضرور ہے۔

ان واقعات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ صحابہؓ ملوکیت اور خلافت کا فرق اچھی طرح سمجھتے تھے اور ملوکیت کے خلاف ایک شدید جذبہ ان میں موجود تھا۔

پس یہ بات اظہر من الشمس ہو گئی کہ یزید خلیفۃ المسلمین نہ تھا، یہ قیصریت تھی یا بقول حضرت عبدالرحمان بن ابوبکرؓ یوں کہیے کہ یہ ہرقلیت تھی اور بیعت کا تعلق قیصریت یا ہرقلیت سے نہیں ہے، خلافت سے ہے۔

﴿ملوکیت کے جواز کے لیے ایک استدلال کا جواب﴾

بعض لوگ ملوکیت کے جواز میں قرآن مجید کی ان آیات سے استدلال کرتے ہیں:

(۱) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم بنی اسرائیل کو انعامات خداوندی یاد دلاتے ہوئے فرمایا ”اذجعل فیکم انبیاء و جعلکم ملوکاً.....“ (المائدہ: ۲۰) یعنی اللہ نے تم میں انبیاء پیدا کیے اور تمہیں ”ملوک“ بنایا۔

(۲) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد جالوت نامی ظالم بادشاہ بنی اسرائیل پر مسلط ہوا تو انہوں نے پیغمبر وقت سے درخواست کی: ”ابعث لنا ملکا نقاتل فی سبیل اللہ“ ”ہمارے لیے ایک ”ملک“ مقرر کر دیجئے تاکہ (اس کی قیادت میں) ہم اللہ کے راستے میں جہاد کریں۔“

پھر پیغمبر وقت نے فرمایا: ان اللہ قد بعث لکم طالوت ملکا“ ”اللہ نے تمہارے لیے طالوت کو ”ملک“ مقرر کیا ہے۔“ (البقرہ: ۲۴۶/۲۴۷)

لیکن یہ استدلال درست نہیں۔ ان آیات میں معروف معنوں کی ملوکیت مراد نہیں۔ پہلی آیت میں ”جعل فیکم“ اور جعلکم“ کے فرق پر غور کریں اور ”عسی ربکم ان یہلک عدوکم و یتخلفکم فی الارض فینظر کیف تعملون“ (الاعراف: ۱۲۹) کی روشنی میں اس آیت کو دیکھیں۔ ”اعراف“ میں وعدہ فرمایا گیا کہ ”تمہارا دشمن ہلاک کر دیا جائے گا اور تم کو ان کے اموال و املاک کا مالک بنا دیا جائے گا“ (تفسیر عثمانی، ص ۲۱۹) ”المائدہ“ میں یاد دلایا گیا کہ اللہ نے اپنا وعدہ پورا فرمایا کہ تمہیں فرعونوں کے اموال و املاک کا مالک بنا دیا، غلامی کے شکنجے سے نکال کر ملوک یعنی آزاد و خود مختار بنا دیا۔

اور ابن عباسؓ نے یہاں ”ملوک“ کی تفسیر ”اصحاب خدم و حشم“ فرمائی ہے:

(جلالین: ۹۵، معالم: ۱/۲۷۷)

پھر دیکھیے، اسرائیلی پیغمبر حضرت داؤد کے بارے میں قرآن مجید کی صراحت ہے: و آتاه اللہ الملک“ (البقرہ: ۲۵۱) لیکن قرآن انہیں ”ملک“ کے لقب سے یاد نہیں کرتا

بلکہ ارشاد ہے: یاد اؤ دانا جعلنک خلیفۃ فی الارض“ (ص: ۲۶)

اور مذکورہ بالا دوسری آیت میں ”نقاتل فی سبیل اللہ“ کے قرینے سے سمجھ آتا ہے کہ یہاں پیغمبر وقت جو قوم کے رہنما اور نگران ہیں، سے ایک کمانڈر کی درخواست کی گئی اور پیغمبر وقت نے اللہ کی ہدایت پر طاوت کو کمانڈر مقرر فرما دیا۔ تو یہاں ”ملک“ کمانڈر کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ علامہ بیضاویؒ اس کی تفسیر میں رقمطراز ہیں: ”اقم لنا امیراً ننہض معه للقتال یدبر امرہ و نصدر فیہ عن رایہ“ (انوار التزیل: ۱۶۰)

آیت استخلاف (النور: ۵۵) کی روشنی میں یہ اصولی بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری امت اور پہلی امتوں کے مؤمنین صالحین سے خلافت کا وعدہ فرمایا ہے، ملوکیت کا نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خلفاء تو مقرر فرمائے ہیں، لیکن معروف اصطلاحی معنوں میں کبھی کوئی ملک مقرر نہیں فرمایا۔

خلافت اور ملوکیت کے درمیان علمی فرق تو خود آیت استخلاف میں بیان ہوا ہے اور عملی فرق نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس حدیث مبارک میں واضح فرمایا ہے کہ: ”الخلافة بعدی ثلاثون سنة ثم یصیر ملکاً عضواً“ خلافت میرے بعد ۳۰ سال رہے گی، پھر کٹھنی بادشاہت آجائے گی۔ (مسلم، احمد) ﴿

کیا یزید پر امت کا اجماع ہو چکا تھا؟

(الف) حضرت حسینؑ، عبد اللہ بن زبیرؑ اور عبد الرحمان بن ابی بکرؓ کا یزید کے خلاف احتجاج تاریخ کی مسلمہ حقیقت ہے، ان کی آواز کو محض تین آدمیوں کی آواز سمجھنا غلطی ہے، یہ قوم کے مختلف دھڑوں کی آواز تھی۔

سیدنا حسینؑ کچھ خاندانی نجابت اور کچھ ذاتی خصائص کی بنا پر لوگوں کی نگاہوں کا مرکز و محور تھے۔ حضرت عبد اللہ بن جعفرؑ نے جب حضرت حسینؑ کو کوفہ کے سفر سے باز رکھنے کے لیے خط بھیجا تو اس میں لکھا تھا:

”إن هلك اليوم طفی نور الأرض فانک علم

المہتدین ورجاء المؤمنین“ (کامل: ۳/۲۷۷)

”اگر آپ شہید ہو گئے تو دنیا اندھیر ہو جائے گی، اس وقت آپ ہدایت یافتہ لوگوں کے امام ہیں اور مسلمانوں کی امیدیں آپ ہی سے وابستہ ہیں“

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے بھی ان سے کہا تھا کہ:

”اقم فی هذا البلد فانت سید اهل الحجاز“

(کامل: ۲۷۶/۳)

”اسی شہر میں قیام کیجئے کہ آپ باشندگان حجاز کے امام ہیں“

پس یہ کہنا کہ محض دو تین آدمیوں نے مخالفت کی تھی باقی ساری امت تو متفق ہو چکی تھی، حقائق کی سراسر تکذیب ہے۔ حضرت حسینؑ کی آواز ہزاروں انسانوں کی آواز تھی اور ان کا احتجاج ایک جم غفیر کا احتجاج تھا۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ بیزاری اور تنفر کے جذبات جو لوگوں کے دلوں کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے تھے اور حکومت کی قہرمانیت کی وجہ سے بند گھروں میں بھی جن کا اظہار کرتے ہوئے ان کی زبانیں ہکلاتی تھیں، حسین بن فاطمہؑ نے اپنی حق گوئی و بے باکی کی وجہ سے ان جذبات کا اظہار بے خوف و خطر اور برملا کیا۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی زیر کی، سیاستدانی اور عزم کی پختگی سے کون واقف نہیں ہے، حجاز میں حضرت حسین علیہ السلام کے بعد عبداللہ بن زبیرؓ ہی کا وجود تھا جو لوگوں کی نگاہیں اپنی طرف کھینچ سکتا تھا، اسی لیے حضرت ابن عباسؓ نے امام حسینؑ کے مکہ سے رخصت ہو جانے کے بعد عبداللہ بن زبیرؓ سے مزاحا کہا تھا:-

خلالک الجو فیضی واصفری

ونقری ما شئت ان تنقری

یعنی فضا تمہارے لیے خالی ہو گئی ہے خوب چہچہاؤ اور جتنی منقار چلانا چاہتے ہو چلا لو۔

زبیریوں کا دھڑا ایسا طاقت ور دھڑا تھا جسے یزید شکست دینے سے قاصر رہا، پھر یہ سمجھنا کہ عبداللہ بن زبیرؓ کی آواز تنہا ایک فرد کی آواز تھی، سادہ لوحی ہے۔

(ب) خود کوفہ والے بھی یزید کو خلیفہ بنانے کے لیے دل سے آمادہ نہ تھے مگر ان کی مصلحت کوشی اور کم ہمتی سچی بات کہنے سے انہیں باز رکھتی تھی۔ اگر کوفہ والے یزید کے ساتھ تھے تو پھر یہ خطوط کے انبار کون لکھتا رہا جن سے دو خورجین بھر گئے تھے! جن لوگوں نے حضرت امام حسینؑ کے نام خط لکھے، ان میں سے بعض کے نام تو آج تک تاریخ میں محفوظ ہیں، مثلاً سلیمان بن صرد الخزاعی، المسیب بن نجبه، رفاعہ بن شداد، حبیب بن مظاہر، شبث بن ربعی، حجار بن ابجر، یزید بن الحرث، یزید بن رویم، عروہ بن قیس، عمر بن حجاج الزبیدی، محمد بن عمیر اسمعی۔

اگر کوفہ والے یزید کے ساتھ تھے تو ہزاروں آدمیوں نے حضرت امام حسینؑ کے لیے مسلم بن عقیلؓ کے ہاتھ پر بیعت کیوں کر لی تھی؟! (کامل: ۲۶۷/۳)

(ج) نعمانؓ بن بشیر کی معزولی پر جب ابن مرجانہ کوفہ کا عامل بنا تو وہ کوفہ شہر میں ڈھاٹا باندھے ہوئے داخل ہوا تھا۔ ان دنوں حضرت حسینؑ کی آمد کی خبر بھی کوفہ میں گرم تھی، اس کا چہرہ ڈھاٹا میں چھپا ہوا تھا، لوگوں نے سمجھا کہ حسین بن علیؑ آگئے، ان کے چہرے خوشی سے تمٹماٹھے اور فضا مرحبا بک یا ابن رسول اللہ! کی صداؤں سے گونج اٹھی۔

اگر کوفہ والے یزید کی خلافت پر مطمئن ہوتے تو اس گرم جوشی نے امام حسینؑ کا استقبال نہ کرتے۔

فرزدق نے کوفہ والوں کی نبض پر ٹھیک ہاتھ رکھا تھا۔ کوفہ جاتے ہوئے راستے میں حضرت حسینؑ کی فرزدق سے ملاقات ہوئی، حضرت حسینؑ نے پوچھا کہ بتاؤ کوفہ والوں کا کیا حال ہے؟ فرزدق نے کہا:

”قلوب الناس معك، سيفهم مع بني امية“ (کامل ۲۷۷/۳)

”لوگوں کے دل آپ کے ساتھ ہیں مگر تلواریں بنو امیہ کے ساتھ۔“

(د) یہ تھا حال کوفہ و حجاز کا اور یمن میں شیعان علیؑ کی کثرت تھی ہی، حضرت

ابن عباسؓ امام حسینؑ سے کہتے تھے:

”فان أبيت إلا أن تخرج فسر إلى اليمن فان بها

حصوناً و شعاباً و هي أرض عريضة طويلة ولا بيك

بها شيعة“ (کامل: ۲۷۶/۳)

”اگر آپ کو مکہ سے جانا ہی ہے تو یمن چلے جائیے، وہاں قلعے

ہیں، وادیاں ہیں اور وہ ایک لمبی چوڑی سرزمین ہے اور وہاں

آپ کے بابا کے حامی موجود ہیں۔“

ان تاریخی حقائق کی موجودگی میں کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یزید کی حکومت پر

امت کا اجماع ہو چکا تھا!

کیا حضرت حسینؑ نے یزید پر خروج کیا تھا؟

کوفہ والوں نے حضرت حسینؑ کو پے درپے خطوط روانہ کیے اور ان خطوط

میں وہ لکھتے رہے:

”ليس علينا إمام فأقبل لعل الله ان يجمعنا بك على

الحق والنعمان بن بشير في قصر الأمانة لا نجتمع معه

في جمعة ولا عيد ولو بلغنا إقبالك إلينا آخر جناه

حتى نلحقه بالشام إن شاء الله تعالى“ (کامل: ۲۷۶/۳)

”ہمارا کوئی امام نہیں ہے، آپ تشریف لائیے، ہمیں امید ہے کہ

خدا آپ کے ذریعے ہمیں حق پر اکٹھا کر دے گا۔ نعمان بن بشیر

(والی کوفہ) شاہی محل میں ہے، ہم اُس کے پیچھے نہ جمعہ کی نماز پڑھتے ہیں نہ عید کی، اگر آپ کے آنے کی خبر ہمیں مل جائے تو انشاء اللہ ہم اسے شہر سے نکال باہر کریں گے حتیٰ کہ شام تک اسے دھکیل دیں گے“

(نعمان بن بشیر صحابی تھے۔ حضرت حسینؑ کے بارے میں فطری طور پر نرم گوشہ رکھتے تھے، لیکن چونکہ یزید کے عامل تھے، اس لیے اہل کوفہ آپ سے اس قدر ورشت رویہ اپنائے ہوئے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عوام یزید سے کتنی گہری نفرت رکھتے تھے)

حضرت حسینؑ نے دیکھا کہ لوگوں کی نگاہیں ان کی طرف اٹھی ہوئی ہیں اور وہ یزید کو خلیفہ ماننے کے لیے تیار نہیں اور حضرت حسینؑ سمجھتے تھے کہ یزید کے اقتدار میں دین و ملت کی تباہی ہے، ان حالات میں انھوں نے ایک نا اہل کے تسلط سے مسلمانوں کو بچانے کی غرض سے کوفہ والوں کی آواز پر لبیک کہا۔

یہ سمجھنا غلطی ہے کہ وہ خود خلافت کے مدعی تھے، کوفہ کی جانب اُن کی روانگی محض لوگوں کی طلب و خواہش کا جواب تھا:

دَعَانَا وَالْأَسَنَةَ مَشْرَعَات

فَكُنَّا عِنْدَ دَعْوَتِهِ الْجَوَابَا

(”اس نے نیزوں کی چھاؤں میں ہمیں پکارا، تو ہم

اس کی پکار پر سراپا جواب بن گئے!“)

حضرت حسینؑ یزید کی فوجوں سے جنگ کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ اگر جنگ ہی کا ارادہ ہوتا تو وہ حامیان بنو ہاشم کا ایک جم غفیر اپنے ساتھ لے سکتے تھے، اگر جنگ و جدل ہی کا ارادہ تھا تو یوں بے یار و مددگار عورتوں اور بچوں سمیت کوفہ روانہ نہ ہوتے۔

جب یہ بات ثابت ہوئی کہ یزید منصب خلافت پر فائز ہی نہ تھا نہ اس پر امت کا اجماع ہوا تھا لہذا حضرت حسینؑ کا اقدام اس کے خلاف خروج نہ ہوا۔

امام ابن تیمیہؒ نے بھی منهاج السنہ میں یہی فتویٰ دیا ہے کہ امام حسینؑ کی شہادت تک یزید مسند حکومت پر متمکن ہی نہ ہوا تھا:

”والحسین استشهد قبل ان يتولى يزيد على شيء

من البلاد“ (منہاج السنہ: ۲/۲۳۹)

مولانا آزاد غفر اللہ لہ کی رائے بھی یہی ہے۔ وہ ”مسئلہ خلافت“ میں یوں

رقطراز ہیں:

”یہ بالکل غلط ہے کہ حضرت امام حسینؑ اس حالت میں لڑے جب کہ وہ یزید کی حکومت کے مقابلے میں خود مدعی امامت اور طالب خلافت تھے۔ جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں انہوں نے واقعہ کربلا کا دقت نظر سے مطالعہ نہیں کیا۔ حالات میں اچانک ایسی تبدیلیاں ہوئی ہیں کہ اس غلط فہمی کا پیدا ہو جانا عجیب نہیں۔ حضرت امام حسینؑ جب مدینہ سے چلے تو اُن کی حیثیت دوسری تھی، جب کربلا میں حق پرستانہ لڑ کر شہید ہوئے تو اُن کی حیثیت دوسری تھی، دونوں حالتیں مختلف ہیں اس لیے دونوں کا حکم بھی شرعاً مختلف۔ جب وہ مدینہ سے چلے ہیں تو حالت یہ تھی کہ نہ تو ابھی یزید کی حکومت قائم ہوئی تھی، نہ اہم مقامات و مراکز نے اس کو خلیفہ تسلیم کیا تھا اور نہ اہل حل و عقد کا اس پر اجماع ہوا تھا۔ ابتدا سے معاملہ خلافت میں سب سے پہلی آواز اہل مدینہ کی رہی ہے، پھر حضرت علیؑ کے زمانے میں مدینہ کی جگہ کوفہ دار الخلافہ بنا، اہل مدینہ اُس وقت تک متفق نہیں ہوئے تھے، کوفہ کا یہ حال تھا کہ تمام آبادی یک قلم مخالف تھی اور حضرت امام حسینؑ سے بیعت کرنے کے لیے پیہم اصرار و الحاح کر رہی تھی۔ انہوں نے خود خلافت کی حرص نہ کی بلکہ ایک ایسے زمانے میں جب تخت حکومت سابق حکمران سے خالی ہو چکا تھا اور نئے حکمران کی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی، ایک بہت بڑی مرکزی اور مؤثر آبادی (یعنی کوفہ و عراق) کے طلب و سوال کو منظور کر لیا، البتہ اس منظوری میں یہ مصلحت ضرور پیش نظر تھی کہ یزید جیسے نا اہل کی حکومت سے امت کو بچایا جائے۔

اگر کہا جائے کہ امیر معاویہؓ نے اپنی زندگی میں یزید کو ولی عہد مقرر کر دیا تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ شرعاً اولاد کی ولی عہدی کوئی شے نہیں ہے۔ اصلی شرط خلافت کی انعقاد حکومت ہے۔ یزید کو گو ولی عہد مقرر کر دیا ہو لیکن جب تک اس کی خلافت بالفعل قائم نہ ہو جاتی صرف یہ بات کوئی حجت نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب یزید کی ولی عہدی کے لیے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بیعت طلب کی گئی تو انہوں نے صاف انکار کر دیا اور کہا ”لا أبایع لا میروین“ میں دو امیروں سے بیک وقت بیعت نہیں کروں گا۔ یعنی خلیفہ کا اپنی زندگی میں ولی عہد کے لیے بیعت لینا ایک وقت میں دو امیروں کی بیعت ہے، جس کی شرعاً کوئی اصل نہیں۔ (رواہ ابن حبان و تعلقہ فی الفتح)

لیکن جب وہ کوفہ پہنچے تو یکا یک نظر آیا کہ حالت بالکل بدل چکی ہے، تمام اہل کوفہ ابن زیاد کے ہاتھ پر یزید کے لیے بیعت کر چکے تھے اور سرزمین عراق کی وہ بے وفائی و غداری جو حضرت امیرؓ کے عہد میں بارہا ظاہر ہو چکی تھی، بدستور کام کر رہی ہے۔ یہ حال دیکھ کر وہ معاملہ خلافت سے دست بردار ہو گئے اور فیصلہ کر لیا کہ مدینہ واپس چلے جائیں، لیکن ابن سعد کی فوج نے ظالمانہ محاصرہ کر لیا اور مع اہل و عیال کے قید کرنا چاہا۔ وہ اس پر بھی آمادہ ہو گئے تھے کہ مدینہ کی جگہ دمشق چلے جائیں اور براہ راست یزید سے اپنے معاملہ کا فیصلہ کرا لیں، (مولاناؒ نے یہ بات مشہور روایت کے مطابق لکھی ہے) مگر ظالموں نے یہ بھی منظور نہ کیا۔ اب امامؑ کے سامنے صرف دو راہیں تھیں، یا اپنے تئیں مع اہل و عیال قید کرادیں، یا مردانہ وار لڑ کر شہید ہوں۔ شریعت نے کسی مسلمان کو مجبور نہیں کیا ہے کہ ناحق ظالموں کے ہاتھ اپنے تئیں قید کرادے۔ پس انہوں نے دوسری راہ کمال عزیمت و دعوت کی اختیار کی اور خود فروشانہ لڑ کر حالت مظلومی و مجبوری میں شہید ہوئے۔

پس جس وقت کربلا میں میدان کارزار گرم ہوا ہے اس وقت حضرت امام

حسینؑ مدعی خلافت و امامت نہ تھے، نہ اس حیثیت سے لڑ رہے تھے، ان کی حیثیت محض ایک مقدس اور پاک مظلوم کی تھی جس کو ظالموں کی فوج ناحق گرفتار کرنا چاہتی ہے اور وہ اپنے آپ کو زندہ گرفتار کرادینا پسند نہیں کرتا اور چاہتا ہے کہ طاقت و ظلم کے مقابلے میں بے سروسامان حق کی استقامت کا ایک یادگار منظر دنیا کو دکھلا دے۔

تعجب ہے کہ یہ غلط فہمی صدیوں سے پھیلی ہوئی ہے!

(مسئلہ خلافت: ۱۳۸-۱۴۰، مکتبہ احباب، لاہور)

کیا قتل حسینؑ میں یزید کا ہاتھ نہ تھا؟

بعض مصری مؤرخین اور بعض مستشرقین کہتے ہیں کہ یزید کا دامن بالکل بے داغ ہے اور حضرت حسینؑ کا خون فقط ابن زیاد کی گردن پر ہے۔ یزید تو شام میں تھا اور اسے حضرت امام حسینؑ کی آمد کی خبر تک نہ تھی۔

آئیے واقعات کی روشنی میں دیکھیں کہ حقیقت حال کیا ہے؟

(۱) حضرت حسینؑ کی آمد کی خبر جب کوفہ میں پھیل رہی تھی وہاں کے والی اس وقت نعمان بن بشیر تھے، نعمان بن بشیر کے مزاج کی محض نرمی اور دھیمے پن کی بنا پر یزید نے ان کی معزولی کے احکام صادر کیے تھے، عبید اللہ بن زیاد والی بصرہ سے یزید ان دنوں خفا تھا لیکن محض اس کے مزاج کی شدت و غلظت کی بنا پر کوفہ بھی اس کے حوالے کر دیا۔ یزید آگاہ تھا کہ ابن زیاد کے دل میں پتھر کی سی صلابت اور قساوت ہے اور وہ حضرت امام حسینؑ سے ذلت آمیز برتاؤ کرے گا۔ کوفہ آ کر ابن زیاد نے پہلی ہی تقریر میں صاف اعلان کر دیا تھا کہ ”امیر المؤمنین نے مجھے حکم دیا ہے کہ تم میں سے جو ابھی تک ڈانوا ڈول ہے اور بیعت کرنے پر آمادہ نہیں ہے میں اس کے ساتھ سختی سے پیش آؤں، میری تلوار اور تازیانہ اس پر برسے گا، جو بیعت نہیں کرے گا، اس کا خون اور مال ہمارے لیے حلال ہے۔“

ہر وہ شخص جو ابن زیاد کے مزاج سے آشنا ہے، سمجھتا ہے کہ ابن زیاد کا تقرر اور حسین بن علیؑ کا قتل بالکل دو مترادف باتیں ہیں۔

(۲) مؤرخین متفق ہیں کہ مسلم بن عقیل کے قتل کا حکم خود یزید نے صادر کیا تھا، ابن عقیل اور ہانی کے سر یزید کے دربار میں جا چکے تھے، اسے خبر تھی کہ حضرت حسینؑ روانہ ہو چکے ہیں اور ابن زیاد ان کے ساتھ ابن عقیل سے کچھ مختلف برتاؤ کرنے والا نہیں۔ پھر کیا یزید نے ابن زیاد کے نام کوئی ہدایات بھیجیں کہ حسینؑ کے قتل سے باز

رہنا، حالانکہ اُس کے بابائے اسے وصیت کی تھی:

”انظر حسین بن فاطمة بنت رسول الله فانه أحب الناس الى الناس فصل رحمه وارفق به“ (ابن کثیر: ۱۶۲/۸)

”حسین بن فاطمہ بنت رسول اللہ کا خیال رکھنا، وہ لوگوں کی محبوب ترین شخصیت ہیں، ان کے ساتھ صلہ رحمی کرنا اور نرمی سے پیش آنا۔“

فان خرج و ظفرت به فاصفح عنه فان له رحماً ماساً و حقاً عظيماً و قرابةً من محمد (کامل: ۲۵۹/۳)

”اگر وہ خروج کریں اور تو ان پر قابو پا لے تو ان سے درگزر کرنا، تیرے قریبی رشتہ دار ہیں، ان کا بڑا حق ہے، پھر وہ رسول اللہ ﷺ کے قرابت دار بھی ہیں۔“

حضرت حسینؑ کی بھتیجی یعنی حضرت عبداللہ بن جعفر الطیار کی دختر سیدہ ام محمد یزید کے نکاح میں تھیں۔ (جمہرۃ الانساب، ابن حزم: ۶۲)

اس رشتہ کے اعتبار سے یزید حضرت حسینؑ کا بھتیج داماد تھا اور دوسرے رشتہ کے اعتبار سے حضرت حسینؑ اس کے بہنوئی ہوتے ہیں، یعنی حضرت حسینؑ کی زوجہ اولیٰ آمنہ والدہ علی اکبر بن الحسینؑ حضرت معاویہؓ کی حقیقی بھانجی تھیں یعنی میمونہ بنت ابوسفیانؓ کی دختر تھیں۔ (جمہرۃ الانساب، ابن حزم: ۲۵۵)

(۳) حضرت حسینؑ کی روانگی سے قبل یزید نے حضرت ابن عباسؓ کو ایک خط میں لکھا تھا کہ حسینؑ کو سمجھاؤ اور اس سے کہو کہ وہ کوفہ نہ جائے۔ اس خط میں یزید نے کچھ شعر بھی لکھے تھے، ان سے بھی خون حسینؑ کی پیاس صاف جھلک رہی ہے:

”إني لأعلم أو ظناً كماله

والظن يصدق أحياناً فينتظم

ان سوف ينزلکم ماتطلبون بها

قتلیٰ تهاداکم العقبان و الرحم

”میں جانتا ہوں یا ایک خیر و علیم انسان کی طرح گمان کرتا ہوں اور گمان بسا اوقات سچا بھی نکل آتا ہے۔ جس چیز کا تم تقاضا کرتے ہو وہ بہت جلد تم پر نازل ہوگی، عقاب اور کرگس مقتولین کے لاشے تم سے تحفہ لیں گے اور دیں گے۔“

(طبری: ۶/۱۴۱۹، ابن کثیر: ۸/۱۶۴)

پھر یہ سوال بھی ہے کہ ایک صوبائی گورنر مرکزی حکومت سے مشورہ کئے بغیر ایک ایسی سربراہ آوردہ شخصیت کو قتل کرنے کی جسارت کیونکر کر سکتا تھا؟ فرض کیجئے اس نے یزید کی مرضی کے خلاف یہ سب کچھ کیا تو پھر کیا یزید نے اس کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی کی؟ اس نے قاتلین حسینؑ کو قتل کرایا نہ معزول کیا حتیٰ کہ ملامت کا ایک حرف بھی انہیں لکھ کر نہیں بھیجا، ہاں بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ اس نے امام حسینؑ کا سر مبارک دیکھ کر تاسف کا اظہار کیا، اگر یہ تاسف از راہ مدہانت نہ تھا تو قاتلین حسینؑ کے خلاف تادیبی کارروائی کیوں نہ ہوئی؟

(پروفیسر سید ابوبکر غزنویؒ کی تحریر بہ تلخیص پوری ہوئی، اس میں قوسین کے اضافے مرتب کی طرف سے ہیں۔)

یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دینے کا افسانہ

کہا جاتا ہے کہ امام حسینؑ یزید کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے، اس لیے یزید کے بارے میں جو کچھ کہا جاتا ہے، درست نہیں۔
آئیے! روایات کی روشنی میں اس کا جائزہ لیتے ہیں۔

(۱) امام حسینؑ کی زوجہ محترمہ اور سُکینہ بنت حسینؑ کی والدہ ماجدہ رباب بنت امرئ القیس کلبیہ کا غلام ہے عقبہ بن سمعان، اس کا بیان ہے کہ: ”میں حسینؑ کے ساتھ رہا، مدینہ سے مکہ اور مکہ سے عراق اور پھر شہادت تک میں آپؑ سے جدا نہیں ہوا، آپؑ نے مدینہ میں، مکہ میں، راستے میں، عراق میں اور یوم شہادت تک لشکر میں جو جو باتیں فرمائیں، سب میں نے سنیں۔

آگاہ رہو، واللہ! آپؑ نے انہیں ہرگز وہ پیشکش نہیں فرمائی، جس کا لوگ جہ چاکر رہے ہیں کہ آپؑ یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دینے یا کسی سرحد پر جانے کے لیے آمادہ ہو گئے تھے، آپؑ نے تو یہ فرمایا تھا: مجھے چھوڑ دو، میں اس وسیع و عریض مملکت کا دورہ کرتا ہوں، پھر دیکھتے ہیں کہ لوگ کیا فیصلہ کرتے ہیں!“ (طبری: ۴۱۳، ۴۱۴/۵)
(۲) میدان کربلا میں امام حسینؑ اور عمر بن سعد کے درمیان گفتگو چل رہی تھی، اس دوران میں عمر بن سعد نے کہا:

”اپنے ابن عم کی حکومت تسلیم کرنے میں آپ کو کیا مانع ہے؟“
فرمایا: ”معاذ اللہ! میں اپنے اور تمہارے رب کی پناہ میں آیا ہر اس متکبر سے، جو روز حساب میں یقین نہیں رکھتا“ (ابن کثیر: ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰)
یہ وہ بات ہے جو حضرت موسیٰ نے فرعون کی طرف سے قتل کی دھمکی کے جواب میں فرمائی تھی، (المومن: ۲۶، ۲۷)

اس جواب سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یزید کی شخصیت آپؑ کی نگاہ میں کیسی تھی!

(۳) امام حسینؑ حالات پر نظر رکھے ہوئے تھے اور بھانپ چکے تھے کہ یزیدی لشکر قتل و غارت پر تلا ہوا ہے تو آپؑ نے عمر بن سعد سے تین باتیں فرمائیں۔

یاد رہے کہ ابن سعد سے آپؑ ملاقات تنہائی میں ہوتی رہی، کوئی اور تو وہاں موجود نہیں ہوتا تھا، خود ابن سعد نے عبید اللہ ابن زیاد کے نام اپنے مکتوب میں ان باتوں کا ذکر کیا ہے۔

امام ذہبیؒ ”سیر اعلام النبلاء“ میں روایت کرتے ہیں کہ:

امام حسینؑ نے فرمایا: تین میں سے کوئی ایک بات پسند کر لو

(۱) مجھے چھوڑ دو، میں کسی سرحدی علاقے میں چلا جاؤں۔

(۲) یازید کے پاس چلا جاؤں

(۳) یامدینہ لوٹ جاؤں

عمر ابن سعد نے یہ بات قبول کی اور ابن زیاد کو لکھ بھیجی، اس نے جواب دیا: نہیں، یہ کوئی عزت نہیں جب تک وہ میرے ہاتھ پر بیعت نہیں کر لیتا۔ اس پر امام حسینؑ نے فرمایا:

واللہ! یہ نہیں ہوگا۔ (الحسینؑ حفیداً وشہیداً: ۱۸۱)

اس روایت کے سلسلے میں چند نکات قابل غور ہیں:

(۱) عبید اللہ ابن زیاد کو یزید نے مکمل اختیار دے کر بھیجا تھا، دونوں ہم مزاج تھے، کوفہ میں ابن زیاد کا ہونا گویا خود یزید کا موجود ہونا تھا، اس وقت حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ امام حسینؑ سے بیعت سے کم کوئی بات قبول نہ کی جائے، اس لیے ابن زیاد کے ہاتھ پر بیعت سے انکار خود یزید کی بیعت سے انکار تھا۔

(۲) اس سے پہلے امام حسینؑ نے جن تین باتوں کی پیشکش کی، ان میں صرف یزید کے پاس جانے کا ذکر ہے، بیعت کا نہیں، مقصد یہ تھا کہ یہ لوگ ویرانے میں گھیر

کر قتل کرنا چاہتے ہیں، یہاں سے کسی طور نکلا جائے۔

(۳) یزید کے پاس جا کر بھی آپؑ ہر گز بیعت نہ کرتے، جیسا کہ آپؑ نے یہاں سنگین صورت حال میں شدت کے ساتھ بیعت سے انکار کیا۔ اگر آپؑ کے دل میں یزید کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے حوالے سے کوئی نرم گوشہ ہوتا، تو اس سے اچھا موقعہ اور کوئی نہ تھا (۴) آپؑ یزید کے پاس پہنچ کر بھی اپنے موقف کا اظہار کرنا چاہتے تھے، اور وہاں یزید کے لیے آپؑ پر ہاتھ ڈالنا آسان نہ ہوتا۔ آپؑ سرحدی علاقے میں چلے جاتے یا مدینہ لوٹ جاتے، حکومت کے لیے آپؑ کا وجود مستقل خطرہ تھا، اس لیے ابن زیاد، گویا یزید، نہیں چاہتا تھا کہ آپؑ ہاتھ سے نکل جائیں کہ دوبارہ آپؑ پر قابو پانا مشکل ہوگا۔

(۵) امام حسینؑ نے ان باتوں کی پیشکش اتمام حجت کے طور پر فرمائی، بالکل ہائیل ابن آدم کے رنگ میں، جب دیکھا کہ قابیل بہر طور قتل پر تلا ہوا ہے تو فرمایا: (ترجمہ) ”اگر تو میرے قتل کرنے کو اپنا ہاتھ بڑھائے گا تو بھی میں تیرے قتل کے لیے اپنا ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا، میں تو اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ میرا گناہ اور اپنا گناہ تسبی لے کر لوٹو پس اہل جہنم میں داخل ہو جاؤ اور یہی ظالموں کی سزا ہے“ (المائدہ: ۲۸، ۲۹)

امام حسینؑ بھی قتال سے گریز کر رہے تھے اور اس پیشکش کے بعد تو ان کے پاس قتال کا کوئی جواز نہ تھا، لیکن وہ تو قتل پر تلے ہوئے تھے، چنانچہ قتل کر کے قابیل ہی کے انجام کو پہنچے۔

(۶) اس روایت میں صرف یزید کے پاس جانے کا ذکر ہے، اس بات کو کچھ راویوں نے اپنے خیال کے مطابق یوں بیان کر دیا کہ: ”مجھے یزید کے پاس لے چلو، کہ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دوں، پھر وہ خود میرے بارے میں فیصلہ کرے۔“ (طبری: ۵، ۴۱۳، ۴۱۴)

یزید کے پاس جا کر امام حسینؑ کیا کرتے؟ اس بارے میں راوی نے اپنے گمان کو روایت کا حصہ بنا دیا، پھر اس گمان کی چنگاری سے ایسی آگ بھڑکی کہ اچھے لوگ اس کی لپیٹ میں آ گئے۔

امام حسینؑ کے بارے میں کوئی سی روایت پڑھتے ہوئے آپؑ کے خاندانی اوصاف اور شخصی حالات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

یزید کے ہاتھ پر بیعت کی ذلت قبول کرنا امام حسینؑ کے خاندانی اور فطری خصائص کے سراسر منافی تھا، چنانچہ کربلا میں اسی کا تو اظہار ہوا، اس لیے بیعت یزید کی روایت از روے درایت واجب الرد ہے۔

جانوروں تک میں جینز (Genes) کا کردار ماننے والے امام حسینؑ کے بارے میں نہ جانے سب کچھ کیوں بھول جاتے ہیں!

یہاں ایک دلچسپ مکالمہ یاد آ رہا ہے۔

بر عظیم پاک و ہند میں ایک بزرگ گزرے ہیں، نسباً بھی حسنی حسینی، وصفاً بھی حسنی حسینی، تمام عمر انگریز اور فتنوں کے خلاف جہاد میں بسر کی، قید و بند کی صعوبتیں اٹھائیں۔ ایک مرتبہ میری ایک عالم سے ملاقات ہو گئی، جو بیعت یزید کی روایت بہت بیان کیا کرتے تھے اور مذکور الصدر بزرگ سے رشتہ قرابت بھی رکھتے تھے، میں نے کہا: سنا ہے کہ آپ کے بزرگ انگریز سے معافی مانگ کر جیل سے چھوٹے تھے؟

ترخ کر بولے: تم یقین کرتے ہو تو کرو، ہمیں تو یقین نہیں آتا،..... پھر بولتے ہی گئے۔ ذرا تھمے تو میں نے کہا: چودہ سو سال بعد ایک حسنی کے باطل کے سامنے جھکنے کا تو تمہیں یقین نہیں آتا، ایک فاسق و فاجر کے سامنے حسینؑ کے جھکنے کا تمہیں کیسے یقین آ گیا!

اوپر عقبہ بن سمعان کی روایت مذکور ہوئی، جیسا کہ بیان ہوا یہ امام حسینؑ کی اہلیہ محترمہ ربابؑ کا غلام تھا۔ سانحہ کربلا کے بعد گرفتار ہو کر عمر بن سعد کے پاس لایا گیا، پوچھ گچھ سے معلوم ہوا کہ یہ تو غلام ہے تو چھوڑ دیا گیا، اس طرح اس کی جان بچی۔

(طبری: ۴۵۴/۵)

غالباً اللہ تعالیٰ کو اس کے ذریعے سفر کربلا کا سچ ہم تک پہنچانا مطلوب تھا، اس لیے اس کی جان چھڑائی گئی!

کیا یزید مغفرت کی بشارت میں داخل رہا؟

امام بخاریؒ قالِ روم کے باب میں روایت کرتے ہیں:

”امّ حرام نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا:

”میری امت کے وہ مجاہدین جو پہلا بحری جہاد کریں گے، یقیناً (اپنے لیے جنت) واجب کر لیں گے“

امّ حرام کہتی ہیں: میں نے کہا: یا رسول اللہ! میں بھی اُن میں شامل ہوں گی؟.....

فرمایا: تو بھی ان میں ہوگی۔

پھر نبی ﷺ نے فرمایا: میری امت کے وہ مجاہدین جو شہر قیصر پر پہلا حملہ کریں گے مغفرت یافتہ (مَغْفُورٌ لَّهُمْ) ہوں گے“

میں نے عرض کیا: میں اُن میں ہوں گی یا رسول اللہ!

فرمایا: نہیں۔“

(صحیح بخاری: ۴۰۹۱)

شہر قیصر سے مراد قسطنطنیہ ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس شہر پر پہلا حملہ یزید کی سرکردگی میں ہوا، لہذا یزید نے جو کچھ کیا، اس حدیث کی روشنی میں سب معاف ہے۔ یہ استدلال درست نہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ امیر معاویہؓ نے قسطنطنیہ کی مہم پر پہلا لشکر جو روانہ کیا تھا، اس کے امیر سفیان بن عوف تھے، یزید نہ تھا، اس مہم پر چونکہ مغفرت کی بشارت مشہور تھی، اس لیے عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن زبیر، ابوالیوب انصاری اور امام حسینؑ جیسے جلیل القدر صحابہ اس لشکر میں شریک ہوئے۔ (تاریخ اسلام: ۵۸۲/۱)

امیر معاویہؓ نے یزید کو بھی کہا، لیکن اس نے بیماری کا بہانہ بنایا، یہ لشکر وہاں جا کر شدید تکالیف میں گھر گیا، دمشق خبر پہنچی تو یزید اپنے نہ جانے پر خوش ہوا اور کچھ

طربہ اشعار کہے، امیر معاویہ کو پتہ چلا تو آپؓ نے قسم اٹھالی کہ تمہیں بھی سفیانؓ بن عوف کے پاس جانا پڑے گا، تا کہ تم بھی جہاد کی تکلیفوں کا مزا چکھو! چنانچہ موسم گرما میں آپؓ نے یزید کے ساتھ بھاری کمک روانہ کی۔

ابن اثیرؒ نے الکامل: ۳/۴۵۸ پر اور بدر الدین عینیؒ نے عمدۃ القاری: ۱۳/۱۹۸ پر یہ تفصیل ذکر کی ہے، اور عینیؒ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ”یہ جلیل القدر صحابہؓ سفیانؓ بن عوف کی قیادت میں تھے، یزید اس کا اہل ہی نہ تھا کہ یہ اکابر صحابہؓ اُس کے ماتحت ہوتے، بعض نے اس حدیث کو یزید کی منقبت میں شمار کیا ہے، حالانکہ اس حدیث سے یزید کی کوئی منقبت ثابت نہیں ہوتی، اُس کا حال تو مشہور و معروف ہے!“ حاصل یہ کہ شہر قیصر پر حملہ آور ہونے والے پہلے لشکر میں یزید شامل ہی نہ تھا، اس لیے وہ مغفرت کی اس بشارت میں داخل ہی نہ ہوا۔

دوسری بات یہ کہ قرآن و حدیث میں جہاں جہاں اعمال صالحہ پر مغفرت کی بشارت دی جاتی ہے، وہاں اس کا مطلب گزشتہ گناہوں کی مغفرت ہوتا ہے، آئندہ گناہوں کی اجازت نہیں ہوتا۔

اس بات کی وضاحت کے لیے دو حدیثیں پیش کر رہا ہوں، جن میں عمل صالح پر بالکل انہی الفاظ میں مغفرت کی نوید ہے، جو حدیث بالا میں مذکور ہوئے۔

(۱) حضرت انسؓ لیلیۃ القدر کے بعد، عید الفطر کی فضیلت میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد روایت کرتے ہیں:

”جب عید الفطر کا دن آتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کے سامنے اپنے بندوں کی عبادت پر فخر فرماتا ہے اور ان سے دریافت کرتا ہے:

میرے فرشتو! جو اجیر اپنا کام پورا کر لے، اس کی کیا جزا ہے؟

فرشتے عرض کرتے ہیں: ہمارے رب! اس کی جزا یہی ہے کہ اس کی

اجرت پوری پوری اے دی جائے۔

ارشاد ہوتا ہے: میرے فرشتو! میرے بندوں اور میری بندیوں نے میرا عائد کردہ فریضہ پورا کر دیا، آج وہ آوازیں بلند کرتے ہوئے دعا کے لیے نکلے ہیں، مجھے قسم ہے اپنی عزت، اپنے جلال اور اپنے کرم کی اور اپنے علو شان اور اپنی رفعت مکان کی میں ان کی دعا ضرور قبول کروں گا۔

پھر بندوں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

جاؤ، میں نے تمہارے گناہ معاف کیے اور تمہاری برائیوں کو نیکیوں سے بدل دیا۔

پھر بندے مغفرت یافتہ (مغفوراً لہم) ہو کر لوٹتے ہیں“
(مشکوٰۃ، باب لیلۃ القدر: ص ۱۸۲، عن البیہقی)

(۲) ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
”اللہ تعالیٰ کے کچھ فرشتے مسلسل گھومتے پھرتے رہتے ہیں، جب وہ ذکر کے حلقوں سے گزرتے ہیں تو ایک دوسرے کو کہتے ہیں: بیٹھ جاؤ، جب لوگ دعا کرتے ہیں تو وہ آمین کہتے ہیں، جب وہ نبی ﷺ پر درود بھیجتے ہیں تو ان کے ساتھ وہ بھی درود بھیجتے ہیں، یہاں تک کہ لوگ فارغ ہو جاتے ہیں۔

پھر وہ ایک دوسرے سے کہتے ہیں: خوش نصیب ہیں یہ لوگ، مغفرت یافتہ (مغفوراً لہم) ہو کر لوٹ رہے ہیں“ (جلاء الافہام: ص ۲۴، ۲۵)

اب کوئی شخص عید الفطر کی نماز پڑھے اور علماء، صلحاء، اولیاء پر بمباری کروائے، سیرت کانفرنس منعقد کرے اور سیرت پر چلنے والوں کو پابند سلاسل کرے، قرآن خوانی کروا کے اہل قرآن پر گولیاں برسائے،

اور جب کوئی اس ظلم و جور پر نکیر کرے تو اسے کہا جائے:

ناں ناں عید الفطر پڑھ کے، سیرت کانفرنس کروا کے اور قرآن پڑھوا کے یہ شخص مغفرت یافتہ ہو چکا ہے، اسے کچھ نہ کہو!

یقیناً ان حدیثوں کا مقصود یہ نہیں ہے۔

بالکل اسی طرح حدیث بالا کا مفہوم بھی یہ نہیں ہے کہ قسطنطنیہ کی مہم میں شریک ہو کر یزید کو آئندہ تمام جرائم کی اجازت مل گئی تھی، لہذا اُسے کچھ نہ کہو! اس مہم میں شریک ہو کر یقیناً اس کے گزشتہ گناہ معاف ہوئے، لیکن آئندہ جرائم کا اسے جواب دینا ہوگا۔

واقعہ کربلا کے بارے میں قرآن کے اشارات، حدیث کے بیانات اور ائمہ و اولیاء کے جذبات خود یہ واضح کر رہے ہیں کہ حدیث بالا کا مفہوم و مقصود وہ نہیں، جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں۔

صحابہ کرامؓ کی یزید سے بیعت

یزید کے لیے جب بیعت لی گئی تو صحابہ کرامؓ کی ایک بڑی تعداد نے، جن میں چند نامور صحابہؓ بھی شامل تھے، یزید کی بیعت کر لی۔ اس سے یہ شبہ پھیلایا جاتا ہے کہ یزید برحق تھا، ورنہ صحابہ کرامؓ اس کی بیعت نہ کرتے۔

یہ خیال درست نہیں، اس معاملے کو سمجھنے کے لیے اُس وقت کے حالات کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ امیر معاویہؓ کے دور میں جب یزید کے لیے بیعت کی تحریک چلائی گئی تو، کہیں جبر سے، کہیں ترغیب و تحریص سے، لوگوں نے بیعت کر لی..... ابھی کچھ ہی عرصہ ہوا تھا کہ امت خوز یزید قتال و جدال کے مرحلے سے گزری تھی..... چنانچہ بیعت کرنے والے صحابہؓ نے مستقبل میں اصلاح احوال کی توقع پر، امت کو نئے جدال سے بچانے کے لیے نہایت نیک نیتی سے یزید کی بیعت کی۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ امام حسینؑ تمام صحابہؓ میں کم سن تھے اور اس بیعت کے وقت امام حسینؑ کی عمر پچاس برس سے متجاوز تھی تو باقی صحابہؓ کتنے معمر ہوں گے؟ اور اتنی عمر میں ایک نئے میدان میں اترنا، جس کا باطل ہونا بھی واضح نہیں تھا، بڑی ہمت چاہتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ یزید کافس و فجور ابھی ڈھکا چھپا تھا، اس کی اہلیت اور صلاحیت کا پروپیگنڈا تھا، اس وقت ذرائع اطلاعات آج کی طرح کے نہیں تھے، تو بیعت کرنے والوں نے جدال سے بچانے کے لیے افضل شخصیات کے ہوتے ہوئے اسے صرف مفضول سمجھ کر بیعت کی، اس امید پر کہ اس کے بعد کوئی صالح تر فرد آ جائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ جب کربلا کے مظالم سامنے آئے اور مدینہ طیبہ سے ایک مؤقروند، جن میں غسیل الملائکہ حضرت حنظلہؓ کے فرزند حضرت عبداللہؓ اور حضرت عبداللہ بن ابی عمرو مخزومیؓ بھی شامل تھے، دمشق گیا، اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے

یزید کے اخلاق و اطوار کا مشاہدہ کیا تو انہوں نے واپس آ کر بیعت توڑ دی، صحابہ کرامؓ کی اس خلع بیعت کا ذکر صحیح بخاری: ۲/۱۰۵۳ پر موجود ہے۔

حورہ کا شرمناک واقعہ، جس میں صحابہ کرامؓ کو نہایت بے دردی اور سنگدلی سے شہید کیا گیا اور جس میں ابوسعید خدریؓ جیسے جلیل القدر صحابیؓ کی داڑھی کا ایک ایک بال نوچ لیا گیا، (وفاء الوفاء: ۱/۱۳۵ الامامۃ والسیاستہ: ۱/۲۱۳) اسی خلع بیعت کے نتیجے میں رونما ہوا۔

تیسری اور اہم بات یہ کہ بیعت کرنے والے صحابہؓ سے صرف ایک بیعت سمجھ رہے تھے، جبکہ یہ صرف ایک بیعت نہیں تھی بلکہ ولی عہدی کی صورت میں اسلام میں طرز قیصری اور رسم خسروی کی بنیاد رکھی جا رہی تھی، جس کا اسلام کے سیاسی نظام پر دور رس منفی اثر مرتب ہو سکتا تھا..... جیسا کہ بعد میں ہوا.....

یہ ایک نیا معاملہ اور نئی صورت حال تھی، جن لوگوں نے اسے صرف ایک بیعت سمجھا، انہوں نے نیک امید کے ساتھ بیعت کر لی..... اور جن لوگوں کی نظر اسلام کے سیاسی نظام پر تھی، جو لوگ خلافت کی گود میں پرورش پائے ہوئے تھے، انہیں اس کے مفاسد کا ادراک ہوا اور انہوں نے شدت سے اس بیعت کی مخالفت کی.....

علاوہ ازیں بیعت یزید کے صحیح یا غلط ہونے پر بحث اُس وقت ہو سکتی تھی جب تک اس کے برگ و بار نمودار نہیں ہوئے تھے، لیکن آج جب کہ اس بیعت کے نتائج خبیثہ آشکار ہو چکے، امام حسینؑ اور دوسرے صحابہؓ کے خدشات واقعات بن کر سامنے آ چکے، اب اس کی صحت پر بحث کرنا اور اس اقدام کے جواز پر دلائل فراہم کرنا ایک لایعنی مشق ہے۔

اب سوال امام حسینؑ کے قیام کے بارے میں نہیں، عدم قیام کے بارے

میں ہونا چاہئے!

یزیدی سازش کا پول کھلتا ہے

امام حسینؑ کی شہادت کے بعد سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ نے اپنی خلافت کا اعلان کیا اور دوسرے لوگوں کے ساتھ سیدنا عبداللہ بن عباسؓ کو اپنی بیعت کی دعوت دی۔ ابن عباسؓ نے اپنے موقف کی وجہ سے، جس کا انہیں حق تھا، بیعت سے انکار کیا۔ اس انکار سے یزید یہ سمجھا کہ چونکہ یہ میری بیعت میں داخل ہیں، اس لیے انہوں نے ابن زبیرؓ کی بیعت سے انکار کیا ہے۔ اس بات سے خوش ہو کر اس نے ابن عباسؓ کو ایک خط لکھا اور ابن عباسؓ نے اس کا جواب دیا۔ تاریخ نے یہ خط اور اس کا جواب اپنے دامن میں محفوظ کر کے بہت سے حقائق سے پردہ اٹھا دیا ہے۔

پہلے سیدنا ابن عباسؓ کے نام نامہ یزید پڑھتے ہیں:

(ترجمہ) ”بعد ازاں، مجھے اطلاع ملی ہے کہ ملحد ابن زبیرؓ نے آپ کو اپنی بیعت کی دعوت دی تھی، لیکن آپ ہم سے وفا کرتے ہوئے ہماری بیعت پر قائم رہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ایک رشتہ دار کی طرف سے وہ بہترین جزا عطا فرمائے جو وہ صلہ رحمی کرنے والوں کو اور عہد نبھانے والوں کو عطا فرمایا کرتا ہے۔ اب میں کچھ بھی بھولوں پر آپ سے حسن سلوک اور آپ کے شایان شان صلے کا فوری انتظام نہیں بھول سکتا۔ اب آپ ذرا اتنا خیال اور رکھیں کہ باہر سے جو لوگ آپ کے پاس آئیں، جنہیں ابن زبیرؓ نے اپنی جادو بیانی سے متاثر کر لیا ہو، تو آپ ابن زبیرؓ کے حال سے انہیں آگاہ کر دیا کریں، کیونکہ اس حرم کعبہ کی حرمت پامال کرنے والے (ابن زبیرؓ) کی نسبت لوگ آپ کی بات زیادہ سنتے اور زیادہ مانتے ہیں۔“

اور اب ابن عباسؓ کا صاف جواب:

(ترجمہ) ”بعد ازاں، تمہارا خط مجھے ملا، میں نے جو ابن زبیرؓ کی بیعت نہیں کی تو واللہ اس امید پر نہیں کی کہ تم مجھ پر احسان کرو گے اور میری تعریف کرو گے، میری جو نیت

ہے، اُسے اللہ خوب جانتا ہے۔

تم نے یہ جو کہا کہ تم مجھ سے حسن سلوک کو فراموش نہیں کرو گے تو اے انسان! تم اپنے حسن سلوک کو اپنے پاس رکھو، کیونکہ میں تم سے اپنا سلوک نہیں رکھنا چاہتا۔

تم نے مجھ سے یہ درخواست کی کہ میں لوگوں کے دلوں میں تمہاری محبت اور ابن زبیر سے نفرت پیدا کروں اور انہیں ابن زبیر کا ساتھ چھوڑنے پر آمادہ کروں، تو نہیں یہ نہیں ہوگا، یہ کام میرے لیے باعث مسرت ہے نہ باعث عزت۔

اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ تم نے حسین اور خاندان عبدالمطلب کے ان جوانوں کو قتل کیا جو ہدایت کے چراغ اور ناموروں میں ستارے تھے، تمہارے سواروں نے تمہارے حکم سے انہیں ایک کھلے میدان میں اس حال میں چھوڑا کہ وہ خون میں لت پت تھے، ان کے بدن پر جو کچھ تھا، چھینا جا چکا تھا، پیاس کی حالت میں انہیں قتل کیا گیا اور بے کفن، بے دفن رہنے دیا گیا، ہوا میں ان پر خاک ڈالتی رہیں اور دبلے بجے بار بار ان کی لاشوں پر آتے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی قوم کو ان کے کفن، دفن کی توفیق دی جو ان کے خون میں شریک نہ تھی۔

قسم ہے میرے رب کی ان ہی کے طفیل تجھے یہ عزت ملی اور تجھے اس جگہ بیٹھنا نصیب ہوا، جس جگہ اب بیٹھا ہوا ہے۔

سواب میں سب کچھ بھول سکتا ہوں لیکن یہ بات نہیں بھول سکتا کہ تیرے جبر سے حسین حرم نبوی سے نکل کر حرم الہی میں آئے پھر تو اپنے سواروں کو مسلسل ان کے پاس بھیجتا رہا یہاں تک کہ انہیں عراق کی طرف روانہ کر کے چھوڑا اور وہ اس حالت میں نکلے کہ ان کو دھڑکا لگا ہوا تھا، پھر تیرے لشکر نے انہیں جالیا، اور یہ سب کچھ تو نے اللہ اور اُس کے رسول اور اُن اہل بیت کی عداوت میں کیا جن سے اللہ نے گندگی کو دور کر کے انہیں خوب پاک صاف کر دیا تھا۔

’حسین نے تمہیں یہ بھی کہا کہ میں لڑائی بھڑائی نہیں چاہتا، مجھے واپس چلے

جانے دو، لیکن تم نے یہ موقع غنیمت جانا کہ انصار کی تعداد کم ہے اور پورے خاندان کو ختم کیا جاسکتا ہے تو تم مل کر ان پر یوں ٹوٹ پڑے گویا تم مشرکوں اور کافروں کے خاندان کو قتل کر رہے ہو۔

تو نے میرے باپ کے خاندان کو قتل کیا، تیری تلوار سے میرے خون کے قطرے ٹپک رہے ہیں اور میرا ایک مدعا علیہ تو ہے، ان حالات میں تو مجھ سے مودت کا طلبگار ہے! اس سے بڑھ کر عجیب چیز کیا ہوگی! اور کسی غلط فہمی میں نہ رہنا، اگر آج تو نے ہم پر فتح پائی ہے تو ایک دن یقیناً ہم تجھ پر فتح پائیں گے۔ (الکامل لابن اثیر: ۴/۵۰، ۵۱)

یزید کے مکتوب اور ابن عباسؓ کے جواب سے چند باتیں سامنے آتی ہیں:

(۱) یزید صحابہ کرامؓ کا گستاخ تھا، اس مکتوب میں عبداللہ ابن زبیرؓ جیسے جلیل القدر صحابی کو ملحد لکھ رہا ہے۔

(۲) یزید کا ذہن گندی سیاست کی آماجگاہ تھا۔

(۳) مکہ میں امام حسینؑ کے پاس جو وفود اور خطوط آتے تھے، ان میں بہت سے یزید کے بھیجے ہوئے ہوتے تھے۔ اس طرح اس نے ایک سازشی منصوبے سے امام حسینؑ کو مکہ سے نکالا اور کربلا تک پہنچایا۔

(۳) کربلا میں جو کچھ ہوا، یزید کی رضا بلکہ حکم سے ہوا، اس واقعے پر اس کا اظہار افسوس محض دکھاوا تھا، جیسا کہ آجکل ہوتا ہے۔

(۴) اہل بیتؑ کا کوئی فرد یزید کا حامی نہیں تھا، جو پہلے خاموش رہے، اس واقعے کے بعد انہوں نے بھی یزید کی شدید مذمت کی۔

یہی حال دوسرے صحابہ کرامؓ کا تھا، کسی صحابیؓ نے یزیدی اقدامات کی تائید و تصویب نہیں، بلکہ واقعہ کربلا کے بعد انہوں نے کھل کر یزید کی مذمت کی۔

سانحہ کربلا میں نصرانی سازش بھی کارفرما تھی

قاضی اطہر مبارک پوریؒ اپنی مشہور تصنیف ”علیؑ و حسینؑ“ میں واقعہ کربلا کا ایک پس منظر ذکر کرتے ہیں، یہ پس منظر دلدوز بھی ہے اور ہماری ملٹی بے حسی کا غماز بھی! آئیے اس کا مطالعہ کرتے ہیں:

”اسلام سے پہلے شام کا پورا علاقہ رومی امپائر کے زیر نگیں تھا، شام کے غسانی حکمران رومی شہنشاہیت کے نمائندے تھے، اور چونکہ شام اور بیت المقدس کا سارا علاقہ عیسائیوں کے لیے مقدس تھا (اور ہے) اس لیے یورپ کی تمام مسیحی طاقتیں وہاں نظر جمائے رکھتی تھیں، شام مسیحیوں کا دینی اور قومی مرکز ہی نہ تھا بلکہ ان کی سیاست و حکومت اور تہذیب و تمدن کا بھی مشرقی گہوارہ تھا۔

خلافت راشدہ میں جب شام فتح ہوا تو حضرت عمرؓ نے یہاں کا انتظام حضرت معاویہؓ کے سپرد کیا، جو اسلامی سیاسی دوراندیشی سے رومی سیاست کا توڑ کر سکتے تھے، چنانچہ حضرت معاویہؓ نے رومیوں کا پورا مقابلہ کیا۔ عہد فاروقی میں بحری جنگ کی اجازت طلب کی اور عہد عثمانی میں قبرص وغیرہ پر چڑھائی کر کے بار بار فتح حاصل کی..... حضرت معاویہؓ رومیوں کے معاملے میں نہایت سخت تھے اور پوری طاقت سے ان کی حرکتوں کا مقابلہ کرتے رہے.....

مگر افسوس کہ حضرت معاویہؓ کی آنکھیں بند ہوتے ہی ہر قلت اور رومی سیاست اسلام پر حملہ آور ہوئی اور ان نوعمر، ناسمجھ حکمرانوں کے زیر اثر اسے پروان چڑھنے کا موقع ملا، جو اسلامیت اور مسیحیت سے قطع نظر صرف اموی حکومت کا استحکام چاہتے تھے۔ واقعہ کربلا اسی طرز سیاست کا مکروہ نتیجہ تھا۔

ہوا یہ کہ ہنگامی ضرورت کی وجہ سے حضرت معاویہؓ نے اپنے زمانے میں دیوان خراج (محکمہ مالیات) میں کام کرنے کے لیے کچھ نصرانی لوگوں کی خدمات

حاصل کیں، چنانچہ شہر حمص کے خراج کی وصولی کے لیے ابن اثال نصرانی کو مقرر کیا اور سرجون بن منصور رومی مسیحی کو دیوان خراج کا کاتب (سیکرٹری) بنایا۔

سرجون (اسے سرجس بھی کہتے ہیں) حضرت معاویہؓ، یزید، معاویہ بن یزید، مروان بن حکم اور عبدالملک بن مروان کے زمانے تک شام کے دیوان خراج کا منتظم اعلیٰ رہا (کتاب الوزراء والکتاب از جیشیاری) اس نے اپنے عملے میں نصرانیوں کو بھرتی کیا، رفتہ رفتہ اس کا اثر و رسوخ بڑھتا گیا اور یہ یزید کا قابل اعتماد مشیر بن گیا اور وہ اپنے عمال و امراء کے عزل و نصب میں اس سے مشورہ کرنے لگا۔

یہ قدیم رومی حکومت کا زمانہ دیکھنے والا سیکرٹری اپنے مذہب پر قائم رہا، مسلمان حکومت کا ملازم ہوتے ہوئے یہ روم کی مسیحی حکومت کا خیر خواہ تھا اور اسلامی فتوحات سے راضی نہ تھا، ایسا آدمی کب صحیح مشورہ دے سکتا تھا، اور اسلامی معاملات خصوصاً مسلمانوں کے باہم نزاع و جدال میں امن و صلح کی بات کیسے کر سکتا تھا۔

چنانچہ علامہ جیشیاری اپنی مشہور و معتبر کتاب الوزراء والکتاب: ص ۳۱ پر لکھتے ہیں کہ:

”جب حسینؑ کے کوفہ پہنچنے کی خبر یزید کو ملی تو اس نے عراق کے والی کے بارے میں سرجون بن منصور سے مشورہ کیا“ اور اس نے عبید اللہ بن زیاد کو کوفہ کا والی مقرر کرنے کا مشورہ دیا اور مشورہ دینے سے پہلے یزید کو متاثر کرنے کے لیے حضرت معاویہؓ کے ساتھ اپنے تعلق کا حوالہ دیا۔ (طبری)

سرجون کا یہ مشورہ مسیحی پالیسی کے عین مطابق تھا، کیونکہ ابن زیاد اپنی شدید عصبیت اور طرفداری میں مشہور تھا اور حکومت کے ساتھ وفاداری میں کسی شخصیت، جماعت یا دیانت کی پروا نہیں کرتا تھا۔

آج عرب کی سب سے بڑی دنیوی طاقت ایک طرف تھی اور خاندان رسالت اور ان کے طرفدار دینی جذبے کے ساتھ دوسری طرف، اہل دنیا کے ہاتھوں

اہل دین کو رسوا کرنے کا اس سے بہتر موقع کب میسر ہوتا!

چنانچہ اس نے ایک سفاک شخص کو والی بنانے کا مشورہ دیا، ابن زیاد کی جگہ اگر کوئی اور سمجھ دار اور دیندار والی ہوتا تو شاید یہ نصرانی سازش کامیاب نہ ہوتی اور واقعہ کربلا رونمانہ ہوتا۔

آج مسیحی مصنفین اور مستشرقین امام حسینؑ اور ان کے رفقاء کو جو غلط کار قرار دے رہے ہیں اور یزید کی حکومت اور اس کے عمال کو جو سراہ رہے ہیں تو اس کی وجہ درحقیقت یہی ہے کہ یزید نے یہ ظلم سرجون مسیحی کے مشورے سے کیا اور اس کارروائی کے نتیجے میں امت اسلامیہ میں ہمیشہ کے لیے افتراق و انشقاق پیدا ہو گیا، اسلام دشمن طاقتوں کا ہمیشہ سے یہی مقصود رہا ہے، تو وہ کیوں نہ یزیدی اقدام کو درست قرار دیں؟ اموی دربار میں نصرانی اثر و نفوذ کتنا بڑھ چکا تھا؟ اس بارے میں ایک مسیحی مستشرق جان کر یر لکھتا ہے:

”عیش و عشرت کی مشغولیت کی بنا پر اکثر اموی خلفاء نے عیسائیوں اور دیگر غیر مسلموں کے ساتھ بہت زیادہ رواداری برتی، عیسائیوں کو نہ صرف یہ کہ خلفاء کے دربار میں آزادی کے ساتھ داخلے کی اجازت تھی بلکہ انہیں اکثر اہم ترین ذمہ داری کے عہدے بھی دیے جاتے تھے۔ سرجون، جو یوحنا دمشق کا باپ تھا، عبدالملک کے دربار میں مشیر اعلیٰ کے عہدے پر فائز تھا، اور اس کی وفات پر یہ عہدہ اس کے بیٹے کو تفویض ہوا، یہاں تک کہ دربار کا ملک الشعراء ایک مسیحی اخطل ہی تھا۔

عیسائیوں کی حالت ایسی اچھی تھی کہ انہیں مساجد میں بے روک ٹوک جانے کی اور عام جمعوں میں طلائی صلیب کے ساتھ چلنے پھرنے کی اجازت تھی۔“

ایک اور مستشرق نکسن لکھتا ہے:

”عیسائیوں کو اموی خلفاء کے دربار میں آزادی کے ساتھ نقل و حرکت کی اجازت تھی، نصرانی شاعر اخطل دربار کا ملک الشعراء تھا اور اس کے ہم مذہب حکومت

کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے، مسلمان اور عیسائی دوستانہ گفتگو نیز مذہبی مناظروں میں تبادلہ خیال کیا کرتے تھے“ (علیؑ و حسینؑ: ۱۷۴ تا ۱۷۹ بہ تلخیص)

بات صرف دربار تک محدود نہ تھی، خود یزید کی شخصیت پر مسیحی تہذیب و تمدن کے اثرات تھے۔

”مورخین نے لکھا ہے کہ جب حضرت معاویہؓ شام کے گورنر مقرر ہوئے تو انہوں نے اپنی حکومت مضبوط کرنے کے لیے شام کے سب سے طاقتور قبیلے بنو کلب کی ایک خاتون میسون (Maysun) سے شادی کی، یزید انہی کے لطن سے پیدا ہوا، میسون خود تو مسلمان ہو گئی تھیں، لیکن ان کے عزیز واقارب بدستور عیسائی رہے۔ یزید ایک طرف اپنے گھر میں اسلامی معاشرت اور عربی تہذیب کی خوبیاں دیکھتا تھا تو دوسری طرف جب وہ ننھیال جاتا تو عیسائی تہذیب و تمدن کے مظاہر دیکھتا تھا، وہیں اس نے گھڑ سواری اور شاعری سیکھی۔

یہاں تک خیریت تھی، لیکن آگے بڑھ کر اس نے ایسے مشاغل بھی سیکھ لیے جو اسلامی تعلیمات کے منافی تھے، نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی سیرت میلی ہوتی چلی گئی۔“

(ماہ نامہ ”اردو ڈائجسٹ“ مارچ ۲۰۰۲ء ص: ۸۵)

عیسائی تہذیب و تمدن سے آشنائی کا ثمر تھا کہ اتنے اہم معاملے میں یزید نے ایک مسیحی مشیر سے مشورہ کیا اور پھر اس پر عمل بھی کیا۔

واقعات کی ان کڑیوں کو ملایا جائے تو خیال آتا ہے کہ کربلا میں مسیحیوں نے ایک تو مباہلے کی ہزیمت کا انتقام لیا، دوسرے وحدتِ ملی کو پارہ پارہ کر دیا۔ اور یہ سب کچھ اُن کے ہاتھوں سے کروایا، جو اپنے کہلاتے تھے۔ اسی کا نام سازش ہے، نصرانی سازش!

معاویہ بن یزید کا اعترافِ حق

مدّعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری!

یزید کے بعد اُس کے بیٹے معاویہ کے لیے بیعت لی گئی اور وہ امیر وقت ہو گیا۔ امام حسینؑ اور دوسرے اکابر صحابہؓ نے بیعت یزید کی تحریک پر یہی تو کہا تھا کہ یہ اسلام کے سیاسی نظام کو خلافت سے ملوکیت میں بدلنے کی کوشش ہے، یزید کے بعد معاویہ کی بیعت نے تصدیق کر دی کہ ان صحابہؓ کا اعتراض بالکل بجا تھا۔

دین و دانش میں معاویہ اپنے باپ یزید سے بہتر تھا، یہی وجہ ہے کہ اس شاہی بیعت کا بوجھ زیادہ دیر برداشت نہ کر سکا۔ چالیس دن، اور بعض نے کہا ہے کہ پانچ ماہ اور کچھ دن، گزرے تھے کہ مجلس طلب کی، منبر پر چڑھا، کافی دیر خاموش بیٹھا رہا، پھر گفتگو کا آغاز کیا۔

مشہور محقق کمال الدین محمد بن موسیٰ دمیریؒ (۷۴۲-۸۰۸ھ) اس مجلس

کا حال بیان کر رہے ہیں:

(ترجمہ) ”سب سے پہلے اس نے اللہ تعالیٰ کی بلیغ انداز میں حمد و ثنا کی، پھر نبی اکرم ﷺ کا حسین و جمیل ذکر کیا، پھر یوں گویا ہوا:

”لوگو! میں تم پر امارت کا خواہش مند نہیں ہوں، اس لیے کہ یہ بڑی ذمہ داری ہے، اور میں جانتا ہوں کہ تم ہمیں ناپسند بھی کرتے ہو، اس لیے کہ تمہاری وجہ سے ہم جتلا ہوئے اور ہماری وجہ سے تم جتلا ہوئے۔

میرے دادا معاویہؓ نے اس خلافت کے سلسلے میں ایک ایسے شخص سے نزاع کیا

جو

رسول ﷺ سے اپنی قرابت، اپنی عظمت و فضیلت اور اپنی دینی سبقت کی

وجہ سے خلافت کے لیے

اُن سے اور دوسروں سے اولیٰ تھے

جو مہاجرینؓ میں

سب سے عظیم القدر تھے

سب سے دلیر تھے

سب سے بڑے عالم تھے

سب سے پہلے مؤمن تھے

سب سے بلند مرتبت تھے

اور سب سے قدیم صحابی تھے

رسول اللہ ﷺ کے چچا زاد

آپؐ کے داماد

اور (دنیا و آخرت) میں آپؐ کے بھائی

رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی فاطمہؑ کا اُن سے نکاح کیا

اُنہیں اُن کی اپنی پسند سے فاطمہؑ کا شوہر بنایا

اور فاطمہؑ کو ان کی اپنی پسند سے اُن کی زوجہ بنایا

جو

جوانانِ جنت کے دوسرے داروں

اس امت کی دو بہترین شخصیتوں

آغوشِ رسولؐ میں تربیت یافتہ

فاطمہؑ بتولؑ کے دو فرزندوں

شجرہ طیبہ، طاہرہ، زکیہ کے دونوں نہالوں

حسنینؑ سبطین کے والد گرامی ہیں۔

میرے دادا نے اُن سے جو کیا، وہ تم جانتے ہو
 اور اُن کے ساتھ مل کر تم نے جو کچھ کیا، اُس سے بھی تم ناواقف نہیں۔
 ان کاروائیوں کے نتیجے میں امور خلافت میرے دادا کے انتظام میں آ گئے،
 پھر اُن کا حتمی وقت آ پہنچا اور موت کے ہاتھوں نے انہیں ہم سے چھین لیا،.....

..... پھر خلافت میرے ابا کی طرف منتقل ہوئی، وہ تمہارے امیر بن گئے، اور اس
 امارت میں ان کے والد کی خواہش کا عمل دخل تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ میرے ابا یزید اپنے برے کردار اور اسرافِ نفس
 کی وجہ سے امت محمد ﷺ پر خلافت کے اہل نہیں تھے۔

چنانچہ وہ اپنی خواہشات پر سوار رہے، اپنی خطاؤں کو درست سمجھتے رہے،
 بڑی دیدہ دلیری سے اللہ کے احکام کو توڑا اور اولاد رسول ﷺ کی حرمت کو اپنی
 عزت کی خاطر پامال کیا۔

چنانچہ اُن کا وقت گھٹ گیا، خیر کا سلسلہ کٹ گیا اور وہ اپنے عمل کے ساتھ سو
 گئے، آج وہ اپنے گڑھے کی آغوش میں اپنے جرم کے گروہی ہیں اور ان کی بدیوں کے
 نتائج دنیا میں باقی ہیں..... انہوں نے جو کچھ کیا اس کا صلہ پالیا، وہ شرمندہ ہیں لیکن
 بے فائدہ..... آج اُن کی موت کا نہیں، خود اُن کا غم ہمیں کھارہا ہے۔

کاش مجھے معلوم ہو جائے کہ اُن کے بارے میں جو کچھ قیل و قال ہے، کیا یہ
 اُن کی برائیوں کی سزا اور اُن کے عمل کا بدلہ ہے؟ (تو بھی مجھے اطمینان ہو جائے کہ
 جان سستی چھوٹی) اور یہ میری خود فریبی ہے“

اتنا کہہ کر اُس کی آواز رندھ گئی، دیر تک روتا رہا اور زور زور سے ہچکیاں لیتا

رہا، پھر بولا:

”تیسرا حکمران میں بنا اور حال یہ ہے کہ مجھ سے راضی لوگ کم ہیں، ناراض زیادہ ہیں، میں تمہارے گناہ اٹھانے کی اپنے اندر ہمت نہیں پاتا، اللہ تعالیٰ مجھے اس حال میں نہ دیکھے کہ تمہارے بوجھ میرے گلے میں ہوں اور تمہارے تاوان میں بھروں! سو تم جانو اور تمہاری حکومت جانے، جسے چاہو، اپنا حکمران بنالو، میں نے تو اپنی بیعت کا قلاوہ تمہاری گردنوں سے اتار پھینکا۔ والسلام علیکم“

یہ خطاب سن کر مروان بن حکم، جو وہاں منبر کے قریب بیٹھا تھا، بولا:
”ابو لیلیٰ! کیا یہ سنت عمری ہے؟“

(یعنی کیا تم حضرت عمرؓ کی طرح مجلس خلافت بنانا چاہتے ہو؟)
”میری نظروں سے دور ہو جاؤ، کیا تم میرے دین کے بارے میں مجھے دھوکا دینا چاہتے ہو؟“ معاویہ بن یزید نے جواب دیا

”واللہ! میں نے تمہاری خلافت کی مٹھاس نہیں چکھی تو میں اس کے تلخ گھونٹ کیوں بھروں! میرے پاس عمرؓ کے آدمیوں جیسے آدمی تو لاؤ، علاوہ ازیں جب انہوں نے خلافت کو شوریٰ کے تحت رکھا اور ایسے لوگوں کے سپرد کیا، جن کی عدالت میں شک نہیں ہو سکتا تھا، تو مجلس بنا کر انہوں نے کوئی ظلم نہیں کیا،

واللہ! اگر خلافت کوئی اچھی چیز ہے تو میرے ابا نے (اپنے کرتوتوں کی وجہ سے) اس کا تاوان اور گناہ پالیا اور اگر کوئی بری چیز ہے تو جو بھگت لیا، اتنا ہی کافی ہے“
یہ کہہ کر معاویہ منبر سے اتر آیا (گھر گیا) رشتہ داروں کے ساتھ ماں ملنے آئی تو روتے ہوئے پایا، اس پر ماں نے اُسے کہا: ”کاش تو حیض ہی رہتا اور میں تیری (پیدائش کی) خبر نہ سنتی!“

”واللہ! میری بھی یہی تمنا رہی (کہ میں پیدا ہی نہ ہوتا) ہائے میری بد بختی اگر میرے رب نے مجھ پر رحم نہ فرمایا!“ معاویہ بن یزید نے کہا۔

حالات نے جویوں پلٹا کھایا تو بنو امیہ نے اس کے اتالیق عمر المقصوص

کو دھریا:

”یہ سب کچھ تو نے اسے تعلیم و تلقین کیا ہے، تو نے اسے خلافت سے روکا ہے، علیؑ اور اولاد علیؑ کی محبت تو نے اس کے دل میں ڈالی ہے، اس کی وجہ سے ظلم کا جو داغ ہم پر لگ گیا، یہ تو نے لگوا یا، تو نے ہی (اس طرح کی) بدعتیں اسے لبھائیں تبھی اُس نے ایسی گفتگو کی۔“

”اللہ کی قسم! میں نے کچھ نہیں کیا، دراصل حبّ علیؑ اس کی جبلت اور طبیعت میں ودیعت ہوئی ہے“ اتالیق نے کہا۔

لیکن انہوں نے اتالیق کی بات تسلیم نہ کی، اسے پکڑا اور زندہ دفن کر دیا، یہاں تک کہ وہ (بے چارا) مر گیا۔

خود معاویہ بن یزید بھی خلع بیعت کے بعد صرف چالیس دن، بعض نے کہا: ستر دن، زندہ رہا، کل عمر تیس سال، بعض نے کہا: اکیس سال اور بعض نے کہا: اٹھارہ سال ہوئی اور لا ولد مرا۔“ (حیاء الحيوان الكبرى: ۸۸/۱، ۸۹)

معاویہ بن یزید کا یہ خطاب اعتراف حق ہے اور یہ واقعات عبرت کی نشانیاں ہیں، لیکن اُن کے لیے جو بصیرت رکھتے ہیں!

امام حسینؑ کا ہر قدم شریعت کے مطابق اٹھا

کچھ مؤرخین لکھتے ہیں کہ اہل کوفہ سیدنا علیؑ اور سیدنا حسنؑ سے بے وفائی کر چکے تھے، اس لیے ان پر اعتماد کرنا امام حسینؑ کی خطا تھی، چنانچہ کوفہ کے قریب پہنچ کر راہ بدلنا آپؑ کے تأسف اور ملال کو ظاہر کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بات لکھتے ہوئے ان لوگوں نے امام حسینؑ کا علمی و فقہی مقام سامنے نہیں رکھا۔

جب حکومت پر غاصبانہ قبضہ ہو جائے، امور مملکت شریعت کے خلاف چلائے جائیں اور اس دور میں کسی اہل کو اتنی عوامی تائید حاصل ہو جائے جس سے اقتدار بدلا جاسکے یا اس کی اصلاح کی جاسکے تو ایسی شخصیت پر ایسے حالات میں قیام واجب ہو جاتا ہے..... امام حسینؑ کا بیضہ کا خطبہ اس حقیقت کو واضح کر رہا ہے.....

چنانچہ امام حسینؑ بیعت عامہ کی خبر ملنے پر مکہ سے کوفہ کے لیے روانہ ہوئے، اور آپؑ نے روانگی کے لیے آٹھ ذی الحجہ کا انتخاب فرمایا..... لوگ مکہ سے منیٰ کے لیے روانہ ہو رہے تھے اور پچیس مرتبہ پیدل حج کرنے والا امامؑ مکہ سے کوفہ کے لیے روانہ ہو رہا تھا! ایک تو یہ اندیشہ تھا کہ حج کے دوران میں آپؑ کو سازش سے شہید کیا جائے گا، جیسے اموی گورنر حجاج بن یوسف کے اشارے سے حج کے ہجوم میں عبداللہ بن عمرؓ کو زہر آلود نیزہ چھو یا گیا اور اسی کے اثر سے وہ شہید ہوئے۔

دوسرا سب کے سامنے ایک مختلف سمت کی جانب روانہ ہو کر اس عالمی اجتماع کے ذریعے آپؑ پوری امت پر واضح کرنا چاہتے تھے کہ موجودہ حکومت شریعت کی ہدایت اور امت کی روایت کے خلاف جاہلانہ حکومت ہے، اور ظلم و جبر کے خلاف قیام نفل حج سے زیادہ اہم عبادت ہے۔

آپؑ نے خواتین اور بچوں کو بھی ہمراہ لے لیا، یہی خیال ہو گا کہ کوفہ کو مرکز بنا

کر آمریت کے خلاف جدوجہد کی جائے گی۔

ابھی کوفہ نہیں پہنچے تھے کہ راستے میں یزیدی ظلم و جور کی خبر ملی، صورت حال یکسر بدل گئی، اب کہاں جائیں؟

ایک صورت مکہ یا مدینہ واپسی کی تھی، لیکن جن لوگوں نے پہلے ٹکٹ نہ دیا، وہ اب کہاں ٹکٹ دیتے! اب تو جبر میں یقیناً اضافہ ہوتا، اس لیے آپؑ نے یہ صورت ترک کر دی۔ دوسری صورت یہ تھی کہ کسی گوشے میں جا بسیں اور حالات کے سازگار ہونے کا انتظار کریں۔

یہ دوسری صورت آپؑ کی جدوجہد کے مناسب حال تھی، چنانچہ آپؑ نے اسے ہی اختیار فرمایا اور کوفہ کی راہ سے ہٹ کر دوسری راہ پر ہو لیے۔

(اس سلسلے میں طبری: ۳۹۲/۵ کی روایت میں یہ جو مذکور ہے کہ ”آپؑ شام کی طرف یزید کی طرف چل پڑے..... اور کربلا میں آپؑ نے یزید کے ہاتھ پر بیعت کی پیشکش کی“ اس میں صرف اتنی بات تو درست ہے کہ آپؑ شام کے راستے پر چل پڑے، باقی یزید کے حوالے سے سب باتیں راویوں کے اندازے ہیں۔ امام حسینؑ نے کبھی یزید کی بیعت کی پیشکش نہیں کی..... اور شام کے راستے پر چلنے سے یہ کہاں متعین ہوتا ہے کہ شام ہی جانا چاہتے تھے، ہو سکتا ہے کہ آگے جا کر آپؑ کسی اور طرف جانا چاہتے ہوں، ایسی صورت حال میں دشمن کو غچہ دیا جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ بعض دفعہ جہاد کے لیے جب مدینہ طیبہ سے روانہ ہوتے، تو منافقین اور اعداء اسلام آپؐ کی سمت کودیکھ کر کچھ اندازہ لگاتے لیکن آپؐ کی منزل مقصود کچھ اور ہوتی تھی!)

یزیدی لشکر مسلسل تعاقب کرتا رہا، آپؑ کربلا میں فروکش ہوئے، لیکن ظالموں نے آپؑ کو یہاں بھی چین نہ لینے دیا، آپؑ ہڑنا نہیں چاہتے تھے، لیکن آپؑ کوڑنے پر مجبور کیا گیا، آپؑ نے اپنے دفاع میں تلوار اٹھائی، آپؑ کسی مسلمان پر، خواہ

وہ نام نہاد مسلمان ہی کیوں نہ ہو، اقدامی حملہ کرنا روا نہیں سمجھتے تھے، ورنہ کون تھا جو آپؑ کے سامنے ٹھہر سکتا!

ان نازک اور جانکسل لمحات میں آپؑ اپنے والد ماجدؑ کے نقش قدم پر چل رہے تھے، علی مرتضیٰؑ شیر خدا ہیں، ہر میدان آپؑ کی شجاعت و بسالت کا گواہ ہے، لیکن صفین میں بچ بچ کر حملوں کا جواب دے رہے ہیں، مبادا کوئی مسلمان ناحق قتل نہ ہو جائے! پھر امام حسینؑ نے جوابی حملے سے پیشتر ظالموں کو دین کے احکام بھی بتائے اور رسول اللہ ﷺ سے اپنے تعلقات بھی یاد دلائے، تاکہ اتمام حجت ہو جائے۔ لیکن یزیدی جبر اور زیادتی استبداد اندھا، بہرا ہو چکا تھا، سینوں میں دلوں کی جگہ سیاہ پتھر تھے، انہوں نے کچھ سنا نہ دیکھا، نہ سمجھا اور چاروں طرف سے حملہ آور ہو کر نہایت بے دردی سے شہید کر ڈالا اور پھر تمام جاہلی روایات زندہ کی گئیں، اس طرح پوری دنیا کے سامنے واضح ہو گیا کہ یزیدی آمریت صرف شرع اسلامی ہی کی نہیں، شرع انسانی کی بھی باغی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ امام حسینؑ کا مکہ سے کوفہ کی جانب چلنا بھی شریعت کے مطابق تھا، اور کوفہ کے قریب پہنچ کر راہ بدلنا بھی شریعت کے مطابق تھا، پہلے سفر کو ناعاقبت اندیشی کہا جاسکتا ہے نہ دوسرے سفر کو پسپائی، آپؑ کا ہر قدم شریعت کے موافق اور بر محل تھا۔

آپؑ کے رویے میں تبدیلی حالات کی تبدیلی کی وجہ سے ہوئی، یہی فقہاہت اور فراست ہے۔

جن لوگوں نے اس فرق کو نہیں سمجھا، انہیں امامؑ کا اقدام خطا نظر آیا۔

اللہ تعالیٰ فہم سلیم عطا فرمائے۔

اس مضمون کی کتابت ہو چکی تھی کہ حضرت خواجہ گیسو درازؒ کا ایک ملفوظ ملا، جس سے اس نظریے کی کلی تائید ہوتی ہے، تبرک کے طور پر اسے نقل کیا جا رہا ہے:

”رسول اللہ ﷺ کے اہل بیتؑ میں سے کوئی بھی سیرت رسولؐ سے

روگرداں نہ ہوا“ اور جب تک وہ زندہ رہے رسول اللہ ﷺ کی سیرت کو پکڑے رہے، اور ہمیشہ اس راستہ پر گامزن رہے جس میں سیرت رسول سے ذرا بھی تبدیلی اور روگردانی کا شائبہ نہ تھا، اور ان کے دشمن ہمیشہ اسی وجہ سے ان سے خائف رہے کہ انہوں نے برے سے برے وقت میں بھی شریعت کی پابندی اور رسول اللہ ﷺ کی سیرت کو نظر انداز نہیں کیا، اور ان کے دشمنوں نے اس کے برخلاف دین و مذہب سے ہٹ کر اور شرع کی پابندیوں سے قطع تعلق کر کے ہر طرح کے مکر و فریب سے کام لے کر ان کو زیر اور مغلوب کرنا چاہا۔ اہل بیتؑ دشمنوں کی اذیت سہتے رہے، جان دیتے رہے لیکن شریعت الہی اور سیرت رسول سے وہ بال برابر منحرف نہ ہوئے، انہوں نے شریعت اور سیرت پر قائم رہنے کے لیے اپنی جانیں قربان کر دیں۔ سب کو معلوم ہے ان پر کیا گزری لیکن بچے سے لے کر جوان اور بوڑھے تک کسی کا بھی جنگ و دشمنی کے وقت قدم نہ ڈگمگایا۔ پھر ان لوگوں کا کیا پوچھنا جو رسول اللہ ﷺ کے فرزند اور لخت جگر تھے، ان سے کوئی کام شریعت اور سیرت رسول ﷺ کے خلاف ہونے کا کیا امکان تھا؟“ (جوامع الکلم: ۱۹۲)

روکنے والوں نے امام حسینؑ کو کیوں روکا؟

امام حسینؑ نے جب مکہ مکرمہ سے کوفہ روانگی کا ارادہ فرمایا تو بہت سے احباب واعزہ نے آپؑ کو روکا، لیکن آپؑ اپنے عزم پر قائم رہے، اس سے یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ امام حسینؑ کا ارادہ صائب نہیں تھا۔

حقیقت یہ نہیں ہے۔

جن لوگوں نے آپؑ کو روکا، اُن کا روکنا اس وجہ سے نہیں تھا کہ وہ آپؑ کے موقف کو غلط سمجھتے تھے، اُن کا روکنا اس وجہ سے تھا کہ اس وقت آپؑ کا واسطہ بے مروت، بے لحاظ، خود غرض، ابن الوقت اور جاہ پرست لوگوں سے ہے، ایسا نہ ہو کہ: ”ان تقادفی عثمان“ (ابن کثیر: ۱۶۴/۸) یہ لوگ آپؑ کو قصاص عثمانؓ کے بہانے قتل کر ڈالیں۔

اگرچہ مخلصین کے یہ اندیشے بالکل صحیح ثابت ہوئے لیکن امام حسینؑ نے تمام خطرات کے باوجود عزیمت کی راہ اپنائی، کیونکہ ایک طرف ذاتی خطرات تھے، دوسری طرف امت کا مفاد تھا، آپؑ نے اپنی ذات کو امت کے مفاد پر قربان کر دیا۔ اور امت کی خاطر اپنی ذات وہی قربان کر سکتا تھا جس کی رگوں میں ”امتی“ کی فریاد کرنے والے نبی ﷺ کا خون دوڑ رہا ہو یا جو اس نبی ﷺ کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے والے کافر زندہ ہو!

ایسے پر خطر معاملات میں رخصت کے لیے تو عذر ہوتا ہے، عزیمت کے لیے نہیں، اور امام حسینؑ صاحب عزیمت تھے۔

امام حسنؑ کی امیر معاویہؓ سے صلح

سانحہ کربلا کا امام حسنؑ اور امیر معاویہؓ کے درمیان ہونے والی صلح سے گہرا تعلق ہے۔ اس لیے ایک نظر اس صلح نامہ پر بھی!

”بسم اللہ الرحمن الرحیم

حسن بن علی ان شرائط پر اہل اسلام کی ولایت معاویہ بن ابی سفیان کی سپرد کر رہے ہیں:

(۱) امور مملکت کتاب اللہ، سنت رسول اللہ ﷺ اور خلفاء راشدین مہدیینؑ کی سیرت کی روشنی میں انجام دیے جائیں گے۔

(۲) معاویہ بن ابی سفیان کو اپنے بعد کسی کو ولی عہد بنانے کا حق نہیں ہے، ان کے بعد اہل اسلام کی مشاورت سے امیر چنا جائے گا۔

(۳) اللہ تعالیٰ کی سرزمین پر بسنے والے سب انسانوں کو امن حاصل ہوگا، خواہ وہ شام میں ہوں یا عراق میں، حجاز میں ہوں یا یمن میں۔

(۴) علی کے اصحاب اور حامیوں کی جان و مال اور عزت آبرو کو تحفظ حاصل ہوگا، وہ جہاں بھی ہوں۔

حسن بن علی کو، ان کے بھائی حسین کو اور اہل بیت نبوی کے کسی فرد کو کھلے، چھپے کسی طور نشانہ بنایا جائے گا نہ ہی ان میں سے کسی کو ملک کے کسی حصے میں ڈرایا دھمکایا جائے گا۔

(۵) معاویہ بن ابی سفیان اللہ تعالیٰ سے عہد و میثاق کرتے ہیں کہ ان شرائط کو پورا کریں گے۔“ (الصواعق المحرقة: ۱۳۶)

صلح ہو جانے کے بعد سب کی موجودگی میں امیر معاویہؓ کے التماس پر آپؐ نے خطاب فرمایا اور اس میں واضح کر دیا کہ:

”میرے پیش نظر امت کی اصلاح اور فتنہ و فساد کا خاتمہ ہے..... میں سمجھتا

ہوں کہ آپس میں لڑ کر خون بہانے سے بہتر ہے کہ جانیں بچالی جائیں، اس صلح سے میری مراد صرف تمہاری اصلاح اور بقا ہے۔

”وَإِنْ أَدْرِي لَعَلَّهُ فِتْنَةٌ لَكُمْ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ“ (الانبیاء: ۱۱۱)

ترجمہ: ”اور میں نہیں جانتا شاید یہ تمہارے لیے آزمائش ہو اور ایک وقت تک دنیوی فائدہ ہو۔“ (الصواعق: ۱۳۷)

امام حسنؑ کے اس اقدام سے رسول اللہ ﷺ کی یہ پیشگوئی اعجازی شان کے ساتھ پوری ہوئی:

”میرا یہ بیٹا سید ہے اور بہت جلد اللہ اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو عظیم گروہوں کے درمیان صلح کرائے گا“ (صحیح بخاری: ۵۳۰۱)

آپؐ کے اس فیصلے کو کئی معنی پہنائے گئے ہیں لیکن محدثین نے صراحت کی ہے کہ آپؐ کی صلح اضطراری نہیں، سراسر اختیاری تھی۔ (الصواعق: ۲۱۷)

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ بھی فرماتے ہیں:

”فانه ترك الملك لالقلة ولا لذلّة ولا لعلّة بل لرغبة فيما عند الله.....“ (فتح الباری: ۵۷/۱۳)

”آپؐ مملکت سے دستبردار کسی قلت کی وجہ سے ہوئے نہ کسی ذلت کی وجہ سے اور نہ کسی علت کی وجہ سے بلکہ خالص اللہ کی رضا کے لیے آپؐ نے حکومت چھوڑی۔“

آپؐ سیدنا علیؑ کے بعد چھ ماہ خلیفہ رہے اور ربیع الاول ۴۱ھ میں اس ذمہ داری سے الگ ہوئے، جبکہ سیدنا ابوبکرؓ کی خلافت سے لے کر اب تک ٹھیک تیس سال پورے ہوئے تھے، اس طرح رسول اللہ ﷺ کی ایک اور پیشگوئی بھی پوری ہوئی کہ ”خلافت میرے بعد تیس سال رہے گی۔“ (مشکوٰۃ، کتاب الفتن)

صلی اللہ علیہ وآلہ وبارک وسلم

مناقب اہل بیتؑ کی روایات پر بے جا تنقید

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی محدث عبدالرحمن مہدیؒ (۲۳۴ھ) سے ایک اصول نقل فرماتے ہیں:

ترجمہ: ”جب ہم حلال و حرام کے بارے میں نبی اکرم ﷺ سے کوئی حدیث روایت کرتے ہیں تو اسانید میں شدت برتتے ہیں اور رجال کی خوب جانچ پرکھ کرتے ہیں، اور جب ہم فضائل میں اور ثواب و عقاب کے بارے میں کوئی حدیث روایت کرتے ہیں تو اسانید میں نرمی برتتے ہیں اور رجال کے بارے میں تسامح سے کام لیتے ہیں“ (فتح الملہم: ۸/۱)

لیکن براہوتعصب جاہلی کا، خلفاء ثلاثہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں تو یہی اصول برتنا جاتا ہے، لیکن مناقب اہل بیتؑ کی روایات جب بیان کی جاتی ہیں تو معاسند پر نقد و جرح اور مضمون پر اعتراض وارد کیے جاتے ہیں، حتیٰ کہ صحیحین کی روایات بھی اس جاہلی رویے سے نہ بچ سکیں۔ اسے جاہلی رویہ اس لیے کہا جا رہا ہے کہ مناقب اصحابؑ کی روایات پر اگر ایسا ہی انتقاد ہو تو شاید ہی کسی کی منقبت ثابت ہو سکے۔

مناقب اہل بیتؑ کی روایات پر ایک عمومی تنقید سند کے کسی راوی کے بارے میں منقول اس جملے کے حوالے سے ہوتی ہے کہ ”کان شیعياً“ ”وہ شیعہ تھا“ لہذا یہ روایت قابل قبول نہیں۔

ملا علی قاریؒ اس بارے میں بڑی معقول اور معتدل بات فرماتے ہیں:

ترجمہ: ”علی الاطلاق ہر شیعہ کی ہر روایت مسترد نہیں ہے، بلکہ صرف وہ روایت مسترد ہوگی جس میں اہل بیتؑ کی مدحت یا دشمنان اہل بیتؑ کی مذمت میں حد سے زیادہ غیر معروف مبالغہ ہو، وگرنہ جہاں تک اہل بیتؑ کی نفس فضیلت اور ان سے لڑنے والوں کی مذمت کا تعلق ہے تو یہ علماء اہل البیتؑ اور اکابر ائمہ امت کے یہاں

اجماعی بات ہے۔

خیال رہے کہ کسی کے ساتھ محبت زیادہ ہونے سے اس کا افضل ہونا ثابت نہیں ہوتا، اس لیے کہ کسی دوسرے کے یقینی طور پر افضل ہونے کے باوجود اولاد اور کسی عزیز سے محبت ایک فطری امر ہے، ہاں جو خونی رشتہ نہیں رکھتے اُن کے لیے کسی کا افضل ہونا اُس کے ساتھ زیادہ محبت رکھنے کا سبب ہوا کرتا ہے۔ (مرقاۃ: ۱۱/۳۸۷)

اسی طرح شیعہ راوی کی روایت سے اُس کے خاص مسلک کی تائید ہو رہی ہو تو اسے بھی پرکھا جائے گا، وگرنہ روایت قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

صحیح بخاریؒ کے راویوں کی ثقاہت مسلمہ ہے، جبکہ صحیح بخاریؒ میں کتنے راوی ہیں، جن کے بارے میں محدثین لکھتے ہیں کہ وہ شیعہ تھے! اس سے معلوم ہوا کہ ایک راوی شیعہ ہوتے ہوئے بھی ثقہ ہو سکتا ہے۔

اس سے بڑھ کر، سنی صحاح ستہ میں ایک مجموعہ حدیث ”سنن نسائی“ ہے، جو صدیوں سے ہمارے دینی مدارس میں پڑھا پڑھایا جاتا ہے، اس کے مؤلف امام ابو عبد الرحمن احمد بن شعیب بن علی النسائیؒ کے حالات زندگی، جو درسی نسخے کے آخر میں مطبوعہ ہیں، میں ہے:

”وکان یتشیع“ ”آپ اہل تشیع تھے“

اس پر حافظ ابن حجر عسقلانیؒ ”تہذیب“ میں لکھتے ہیں:

ترجمہ: ”متقدمین کے عرف میں تشیع یہ عقیدہ ہے کہ علیؑ عثمانؓ سے افضل ہیں اور یہ کہ تمام جنگوں میں علیؑ راہ صواب پر تھے اور ان کے مخالف خطا پر تھے، ہاں شیخینؓ سب سے مقدم اور افضل ہیں، بلکہ بعض تو یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد علیؑ افضل المخلوق ہیں، اس عقیدہ کا حامل اگر خدا ترس ہے، دیندار ہے، سچا ہے، مجتہد ہے تو محض اس عقیدے کی وجہ سے اُس کی روایت رو نہیں کی جائے گی، بالخصوص جبکہ وہ اپنے مسلک کا داعی بھی نہ ہو۔“ (سنن النسائی، ترجمۃ المؤلف: ۲/۳۳۷)

اس سے یہ بات سامنے آئی کہ کتب حدیث میں جب کسی راوی کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ شیعہ تھا، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ آجکل کے شیعہ کی طرح شیعہ تھا، بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جو سیاسی اختلاف تھا، اُس میں وہ شیعہ علیؑ میں سے تھا، چنانچہ تاریخ میں شیعہ عثمانؑ اور شیعہ معاویہؓ کے الفاظ بھی ملتے ہیں، اس کا معنی یہ ہے کہ قرون خیر میں شیعہ کا ٹائٹل مذہبی حوالہ نہیں، سیاسی حوالہ تھا، اس سیاسی اختلاف میں مذہب کا رنگ بعد میں بھرا گیا، جس سے بات بگڑ گئی۔

صحابہ کرامؓ کے درمیان سیاسی اختلاف کو اس مثال سے سمجھیے..... اور ذہن میں رہے کہ یہ مثال صرف اختلاف کی ہے، رہا صحابہ کرامؓ کی عظمت و فضیلت کا معاملہ اس مثال کا اُس سے کوئی تعلق نہیں۔

آج مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی میں سیاسی اختلاف ہے، لیکن اختلاف کے باوجود دونوں پارٹیوں کے افراد اور قائدین ایک دوسرے سے ملتے ہیں، خوشی، غمی میں شریک ہوتے ہیں، کسی نکتے پر اتحاد بھی ہو جاتا ہے۔

پچاس سو برس بعد کوئی ظالم اس سیاسی اختلاف پر مذہب کی چھاپ لگا دے تو کیا حال ہو!

آئندہ نسل اس اختلاف کو ایمان و کفر کا مسئلہ بنا لے گی، جبکہ حقیقت بالکل اور ہے۔

ضرورت ہے کہ اہل بیتؑ اور صحابہؓ کے حالات کو انہی کے دور میں پہنچ کر پڑھا جائے یعنی قرآن اور حدیث کی اہمات کتب میں ان کا مطالعہ کیا جائے تو مسائل آسانی سے سمجھ آئیں گے۔ ہاں یہی مسائل جب مناظرانہ رنگ کی کتابوں میں پڑھے جائیں تو بات ابھتی چلی جاتی ہے۔

حفظ مراتب تقاضاے شریعت ہے

قرآن و حدیث میں صحابہ کرامؓ کے جہاں درجات بیان ہوئے ہیں، وہاں حفظ مراتب کی بھی تلقین فرمائی گئی ہے۔
ارشاد ربانی ہے:

ترجمہ: ”تم میں سے جس نے فتح (مکہ یا صلح حدیبیہ) سے پہلے خرچ اور قتال کیا وہ (دوسروں کے) برابر نہیں، ان لوگوں کا درجہ بڑا ہے اُن سے جنہوں نے اس کے بعد خرچ اور قتال کیا، اور (یوں تو) سب سے اللہ نے وعدہ کیا ہے بھلائی کا، اور اللہ کو خبر ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔“ (الحديد: ۱۰)

معلوم ہوا کہ جن اصحابؓ نے کڑے وقت میں رسول اللہ ﷺ کا ساتھ دیا، وہ بعد میں آنے والوں سے عظیم تر ہیں۔

ایک مرتبہ عبدالرحمن بن عوفؓ اور خالد بن ولید کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہو گیا، خالد بن ولید نے انہیں کوئی سخت جملہ کہہ دیا، بات رسول اللہ ﷺ تک پہنچی تو ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

ترجمہ: ”میرے اصحاب کو برا مت کہو، اگر تم میں سے کوئی احد جتنا بھی سونا خرچ کرے تو ان کے خرچ کیے ہوئے ایک مدہ بلکہ نصف مدہ کے بھی برابر نہیں۔“

(مشکوٰۃ مع مرقاۃ: ۱۱/۲۷۷)

خالد بن ولید بھی صحابی ہیں، اور ان کی اسلام کے لیے خدمات محتاج بیان نہیں، لیکن اس مقام پر رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب انہیں قرار دے رہے ہیں، جنہوں نے سب کو چھوڑ کر اور سب کچھ چھوڑ کر اوّل اوّل آپؐ کی صحبت اختیار کی۔

ان روایات کی روشنی میں ہر دور میں امت نے فرق مراتب کا لحاظ رکھا۔ اس سلسلے میں مولانا محمد منظور نعمانیؒ اپنی آپ بیتی میں یہ فکر انگیز ملفوظ نقل کرتے ہیں:

”مولانا عبدالشکور لکھنویؒ سے میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے، ایک موقع پر حضرت علی مرتضیٰ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درجات کا فرق بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سابقون اولون کی پہلی صف کے بھی اکابر میں ہیں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اگرچہ صحابی ہونے کی حیثیت سے ہمارے سر تاج ہیں لیکن حضرت علی مرتضیٰؑ سے اُن کو کیا نسبت؟ اُن کی مجلس میں اگر صفِ نعال میں بھی حضرت معاویہؓ جو جگہ مل جائے تو اُن کے لیے سعادت اور باعثِ فخر ہے۔“

(تحدیثِ نعمت: ۳۴۶)

مولانا لکھنویؒ کا یہ ارشاد اور مولانا نعمائیؒ کی روایت دونوں اپنی جگہ بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔

اور خیال رہے کہ مولانا نعمائیؒ نے یہ بات مولانا لکھنویؒ کے ”غیر معمولی اعتدال“ کے زیر عنوان ذکر کی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلکِ اعتدال دراصل یہی ہے، اور اس سے ہٹ کر جتنی باتیں کی جاتی ہیں، سب افراط و تفریط ہیں۔

قرآن کی آیت آپؐ نے پڑھی، حدیث بھی پڑھ لی، اکابر علماء کا ارشاد بھی ملاحظہ ہوا، اب عصر حاضر کے ایک صاحب کی بات سنئے:

”بے شک ابو عبیدہؓ و خالدؓ، علیؑ عظیم

لیکن نہیں کسی سے بھی کم تر معاویہؓ“

ناطقہ سر بگریاں ہے! سے کیا کہیے!

تمام خلفاء راشدین ہیں، لیکن:

”بعد از چہار یار و حسن شد خلیفہ ای

امت کے حق میں ارشد و اکبر معاویہؓ“

’راشد اور، ارشد، کا فرق ملحوظ خاطر رہے!

مزید ارشاد ہوتا ہے:

”قولِ نبیؐ ہے جو بھی لڑے گا امیر سے

اس کو پچھاڑ دیں گے برابر معاویہؓ

پھر دیکھ کہ جو بھی مقابل ہوا رہا

مغلوب اور رہے ہیں مظفر معاویہؓ

یہ کونسا قول نبی ﷺ ہے؟ کون مقابل ہوا؟ اور کون مغلوب اور کون

غالب رہا؟ تاریخ سب کچھ بیان کر رہی ہے، لیکن کیا کیجئے تعصب میں ہوش و حواس

ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔

اور ذرا یہ طنزیہ انداز ملاحظہ ہو:

”گریں نہ انتقام تو پھر وہ حلیم ہوں

اور بیٹا ہو جانشین تو ستم گر معاویہؓ

یہ منطق خبیث ہے ابنِ سبا کا دین

ورنہ تھے حسن و خیر کے مظہر معاویہؓ“

جب انسان حفظِ مراتب اور حسنِ ادب سے محروم ہو جائے تو پھر اس سے

اسی طرح کی بے سروپا باتیں سرزد ہوتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ قلبِ سلیم عطا فرمائے!

یہ رشتہ دار

کچھ لوگ واقعہ کربلا کی سنگینی کو کم بلکہ ختم کرنے کے لیے یزید اور شمر کی بنو ہاشم کے ساتھ قرابت داری کا حوالہ دیتے ہیں کہ یہ حادثہ فتنہ پردازوں کی سازش کی وجہ سے ہوا، ورنہ قاتلین و مقتولین تو ایک دوسرے کے قرابت دار تھے، ان کے درمیان ایسا کشت و خون کیسے ہو سکتا تھا؟

یہ لوگ بھی کیا سادہ ہیں، یزید کے دفاع میں بھول گئے کہ:

اس سرزمین پر پہلا قتل بھائی کے ہاتھوں بھائی کا ہوا۔

سیدنا یوسفؑ کو کنوئیں میں سگے بھائیوں نے پھینکا۔

ابو جہل، ابولہب اور قبول اسلام سے پہلے ابوسفیان نے رسول اللہ ﷺ

سے جو کچھ ناروا سلوک کیا، وہ تمام تر رشتہ داری کے باوجود کیا۔

اب رشتہ داری کی بنیاد پر جیسے انہیں بری الذمہ قرار دینے کی بات حماقت

اور جہالت ہے، اسی طرح یزید کو بھی رشتہ دار ہونے کی وجہ سے بری قرار دینا پرلے

درجے کی سفاہت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حسد کی آگ ہمیشہ رشتہ داروں اور دوستوں میں بھڑکتی

ہے، بیگانوں کو تو خبر ہی نہیں ہوتی۔ خاص طور پر انسان جب اقتدار کی حرص میں مبتلا ہو

جائے تو سب رشتوں ناتوں کو فراموش کر دیتا ہے، عباسی، عثمانی اور مغل ادوار میں کتنے

واقعات ملتے ہیں کہ اقتدار کی خاطر ماں، باپ نے اولاد کو اور اولاد نے ماں، باپ کو

اور بھائیوں نے بھائیوں کو قتل اور قید کیا۔

اس لیے رشتہ داری کی وجہ سے یزید اور شمر نہ صرف یہ کہ اس جرم سے بری

نہیں ہوتے بلکہ سانحہ کربلا کا ایک بڑا سبب یہی رشتہ داری تھا!

ایک عربی شاعر کہتا ہے:

اقارب كالعقارب في الايذاء
فلاتفرح بعم او بخال
فكم عم يكون الغم منه
وكم خال عن الاحسان خال

ترجمہ: ”اذیت رسانی میں رشتہ دار بچھوؤں کی طرح ہوتے ہیں لہذا کسی چچا اور ماموں سے فرحت کی امید نہ رکھ (ہاں کسی سے راحت مل جائے تو شکر ادا کر) کتنے عم باعث غم ہوتے ہیں اور کتنے خال (ماموں) حسن سلوک سے خالی ہوتے ہیں“ کسی نے خوب کہا ہے:

سلکتی لکڑیاں ہیں یہ رشتہ دار
جو دور ہوں تو دھواں دیں، ملیں تو جلنے لگیں

تابعین کے لقب کا استحصال

امت میں صحابہؓ اور تابعینؓ کا خاص مقام ہے اور ان کا وجود باعث نصرت و برکت ہے، جیسا کہ ابوسعید الخدریؓ کی روایت (مشکوٰۃ مع مرقاۃ: ۲۷۴/۱۱) سے معلوم ہوتا ہے۔

اور عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”میری امت کے بہترین لوگ میرے زمانے کے لوگ ہیں (یعنی صحابہ) پھر وہ لوگ جو ان (صحابہ) سے قریب ہوں (یعنی تابعین) پھر وہ لوگ جو ان (تابعین) سے قریب ہوں (یعنی اتباع تابعین)“ (مشکوٰۃ مع مرقاۃ: ۲۷۶/۱۱)

اور جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اس مسلم کو آگ نہیں چھوئے گی، جس نے مجھے دیکھا یا میرے دیکھنے والے کو دیکھا“۔

(مشکوٰۃ مع مرقاۃ: ۲۷۸/۱۱)

کچھ لوگ یزید کے دفاع میں یہ احادیث بھی بڑے زور و شور سے بیان کرتے ہیں کہ یزید تابعین کے زمرے میں داخل ہے اور آگ اس پر حرام ہے، لہذا اسے کچھ نہ کہا جائے۔

یہ تابعین کے لقب کا استحصال ہے، احادیث پڑھنے، پڑھانے والے خوب جانتے ہیں کہ ایسی تمام روایات میں فضیلت عمل صالح سے مشروط ہوتی ہے، خواہ صراحۃً اس کا ذکر نہ بھی ہو۔

قرآن مجید نے سورۃ توبہ، آیت: ۱۰۰ میں سابقون اولون صحابہ اور ان کے تابعین کے لیے رضاے الہی اور جنت کا اعلان فرمایا ہے، لیکن ان تابعین کے لیے جو احسان کے ساتھ پیروکار ہوں۔

خود تابعین کا لفظ اتباع کا تقاضا کرتا ہے۔

جن لوگوں نے صحابہ کرامؓ کو دیکھا، لیکن ان کا اتباع نہیں کیا، وہ تابعین کی فضیلت سے محروم ہیں۔

یوں تو امام حسینؑ کو شہید کر کے ان کی نعش پر گھوڑے دوڑانے والے،

واقعہ حرہ میں مدینہ طیبہ کی حرمت پامال کرنے والے،

حجاج بن یوسف سمیت بیت اللہ پر چڑھائی کرنے والے بھی تابعین تھے،

لیکن احسان کے ساتھ صحابہؓ کے پیچھے چلنے والے نہیں،

ظلم و عدوان کے ساتھ صحابہؓ کا پیچھا کرنے والے!

یزید کا حال بھی ایسا ہی تھا۔

کوفہ اور کوفی

واقعہ کربلا کے حوالے سے کوفہ اور کوفیوں کو بہت بدنام کیا گیا ہے، آئیے ایک نظر اس پر بھی!

”نصب الراية لاحاديث الهداية“ حافظ عبد اللہ بن یوسف زیلیعی (۷۶۲ھ) کی مشہور کتاب ہے، جس میں انہوں نے فقہ حنفی کے دلائل بیان کیے ہیں۔ اس کتاب کا ایک شاندار مقدمہ استاذ کبیر محمد زاہد کوثریؒ نے تحریر فرمایا ہے۔ اس مقدمے میں ص: ۲۹ تا ۳۶ کوثریؒ نے قرآن، سنت، فقہ، عربیت وغیرہ اجتہادی علوم میں کوفہ کا مقام، کوفہ میں حضرت علیؑ اور حضرت ابن مسعودؓ کے کچھ اصحاب کا تذکرہ، کوفہ اور دوسرے شہروں کے علما کا موازنہ، کوفہ میں احادیث اور محدثین کی کثرت کے بارے میں نفیس تحقیق فرمائی ہے۔

کوثریؒ لکھتے ہیں: کوفہ ۷۱ھ میں حضرت عمرؓ کے حکم سے آباد کیا گیا، اس کے اطراف میں فصحائے عرب بسائے گئے اور یہاں کے مسلمانوں کی تعلیم و تذکیر کے لیے سرکاری طور پر عبد اللہ ابن مسعودؓ کو مقرر کیا گیا۔ اس بارے میں حضرت عمرؓ نے اہل کوفہ کو لکھا: ”ابن مسعودؓ کی مجھے اشد ضرورت ہے، لیکن تمہاری ضرورت کو مقدم رکھتے ہوئے میں انہیں تمہارے پاس بھیج رہا ہوں۔“

ابن مسعودؓ نے عثمانی دور کے آخر تک لوگوں کو قرآن مجید اور شریعت کی تعلیم دی۔ آپؓ کی ان علمی کاوشوں سے اس شہر میں چار ہزار علماء و محدثین پیدا ہوئے۔ حضرت علیؑ جب کوفہ پہنچے تو آپؑ نے اس شہر کے علمی ماحول کو دیکھ کر فرمایا: ”اللہ ابن مسعود کا بھلا کرے، انہوں نے اس شہر کو علم سے بھر دیا۔“

خود حضرت علیؑ کی اس شہر میں علمی اور روحانی خدمات گراں قدر ہیں۔ مذکورہ دو اصحابؓ کے علاوہ پندرہ سو صحابہؓ اس شہر میں قیام پذیر ہوئے، جن

میں ستر بدری صحابہؓ تھے۔“

صحابہ کرامؓ کے انوار و برکات اور علماء و فقہاء کی خدمات نے کوفہ کو اسلام کا مرکز اور علوم و فیوض کا منبع بنا دیا، جہاں دور دور سے پیاسے آتے تھے اور اپنی فکر و نظر اور علم و عمل کی پیاس بجھاتے تھے۔

مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ قدیم مراکز اسلام تھے۔ لوگوں سے جب یزید کی بیعت کا مطالبہ ہوا تو ان تینوں مراکز کی نمائندہ اکثریت نے بیعت سے انکار کیا، باقی علاقوں میں دھن، دھونس، دھاندلی کے تمام حربے آزمائے گئے، بیعت ہوئی لیکن خوف، بے دلی اور بے یقینی کی فضا میں، مراکز نے جب بیعت نہ کی تو بیعت صحیح نہ ہوئی، اور ایسی بیعت کی بنیاد پر استقرار حکومت بھی درست نہ ہوا، تو کوفہ اپنی مرکزیت کی وجہ سے حکومت سازی میں اہم کردار کا حامل تھا۔

واقعہ کربلا پڑھتے ہوئے یہ خیال آتا ہے کہ اتنے اچھے ماحول میں رہنے والوں نے یہ کیا کیا کہ جہان میں بے وفائی ان کا حوالہ بن گیا، اور پھر ایسے جفا کار ماحول میں کیسے کیسے علماء، فقہاء و صوفیاء نے جنم لیا، یا اللعجب!

حالات کا جائزہ لیجیے تو حقیقت کچھ اور سامنے آتی ہے۔ کوفہ کے سب لوگ بے وفانہ تھے، بلکہ اہل اخلاص زیادہ تھے۔ یزید کی بیعت کی دعوت دی گئی تو اہل کوفہ نے بیعت نہ کی اور بجا طور پر امام حسینؑ کو خلافت کی ذمہ داری قبول کرنے کی دعوت دی، پھر امام حسینؑ کے نمائندے مسلم بن عقیلؓ کے ہاتھ پر ہزاروں نے بیعت کر لی۔ اس وقت نعمان بن بشیرؓ کوفہ کے والی تھے، صحابی رسول ﷺ تھے، اظہار رائے کی آزادی کو تسلیم کرتے تھے اور عوام کی رائے کا احترام کرتے تھے، انہوں نے اس بیعت کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا۔

اس پر ابن زیاد کو مارشل لائیڈ منسٹر یٹربنا کر کوفہ بھیجا گیا، اس نے آتے ہی تحریص و تہدید کے وہ تمام ہتھکنڈے استعمال کیے جو فرعونؑ، یزیدی سیاست کا طرزہ

امتیاز ہیں۔ سب سے پہلے قبائل کے سرداروں کو ہاتھ میں لیا گیا، بہکا اور ڈرا کر انہیں مسلم کا ساتھ چھوڑنے پر آمادہ کیا گیا، پھر ان کے ذریعے عوام میں سراسیمگی، بے دلی اور بے یقینی پھیلانی گئی اور آخر میں مسلم ابن عقیلؓ کو ظالمانہ اور سفاکانہ طریقے سے شہید کر کے تو گویا حوصلے توڑ دیے گئے۔ چنانچہ ایک طرف خوف و ہراس کی یہ فضا تھی، دوسری طرف وسائل ابلاغ نہ ہونے کی وجہ سے کربلا کے حالات سے مکمل آگاہی نہ تھی اور پھر یہ سان گمان نہ تھا کہ کوئی امام حسینؑ پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت بھی کر سکتا ہے، بس کوفہ میں یہی ملے جلے احساسات تھے کہ ادھر سانحہ کربلا رونما ہو گیا، اور پھر ایک سناٹا طاری ہو گیا، لیکن جو نہی قیادت ملی، انہی اہل کوفہ نے بھرپور انداز میں اپنے غیظ و غضب کا اظہار کیا اور قاتلانِ امامؑ کو چن چن کر کیفر کردار تک پہنچایا۔

اگر بھی اہل کوفہ بے وفا ہوتے تو یوں انتقام نہ لیتے، بے وفائی کچھ سرداروں نے کی، عوام بکھر گئے اور سہم گئے۔

اور سرداروں کی بے وفائی مال کی محبت میں تھی۔

براہو جب مال کا!

کتنے بڑے بڑے سانحے اسی جب مال کے نتیجے میں رونما ہوئے۔

حضرت موسیٰؑ پر تہمت لگانے والی کو اسی مال نے اندھا کیا تھا۔

قارون اسی دولت کی لالچ میں فرعون کا ایجنٹ بنا۔

اور وہ جس کے پاس کتاب اللہ کا علم تھا، وہ اسی دنیا کی خاطر دین سے

نکلا تھا۔ (اعراف: ۱۷۵، ۱۷۶)

مسیحی روایت کے مطابق حواری نے حضرت مسیحؑ کی مخبری اسی مال کی محبت

میں کی۔

اور عصر حاضر کے عراق میں صدام حسین کے وزراء اور کمانڈرز کی نگاہیں

دولت کی چمک دمک سے خیرہ ہوئیں۔

صدام کے کزن نواف الزیدان نے اپنے گھر میں پناہ دے کر صدام کے بیٹوں کو ۳ کروڑ ڈالر کے لالچ میں مروایا۔ (نوائے وقت، لاہور ۲۸ جولائی ۲۰۰۲ء)

خود صدام کو اس کے باڈی گارڈ نے انہی ڈالر کی حرص میں پکڑ وایا۔

لیکن یہ کردار بھی عراقی عوام کا نہیں، چند کا ہے، چنانچہ جو نہی قیادت میسر آئی، عراقی عوام بڑی ہمت اور جرأت سے امریکی فوج کے مقابلے میں آگئے اور سرفروشی کی نئی مثالیں پیش کرنے لگے! اب چند کی وجہ سے سب کو برا نہیں کہا جاسکتا!

بلا امتیاز اہل کوفہ کو ملامت کرنے والے پاکستان کے ماضی قریب کے حالات و واقعات پر ایک نظر ڈالیں۔

۹/۱۱ کے بعد جب طالبان کو دھمکایا گیا تو پاکستان کے چھوٹے بڑے شہروں میں علماء و مشائخ کی قیادت میں بڑے بڑے جلوس نکالے گئے، عزم کیا گیا کہ جہاں طالبان کا پسینہ بہے گا، ہم خون بہائیں گے، امریکہ کو مار بھگائیں گے۔ خوب اچھل اچھل کر تقریریں اور گلے پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگائے گئے، اخباروں میں دھڑا دھڑ جوشیلے مضامین لکھے گئے، طالبان کو یقین دلایا گیا کہ آڑے وقت میں ہم تمہارے ساتھ کھڑے ہوں گے..... اور یہ سب وہ لوگ تھے جن کا معاش بھی ایک مدت سے طالبان کی حمایت اور جہاد سے وابستہ تھا..... لیکن جب آزمائش آئی تو اکثریت چپ، یہاں تک کہ طالبان کے خون کی ندیاں بہہ گئیں اور ان کا پسینہ تک نہ بہا، یہ قائدین اپنے آراستہ و پیراستہ حمروں میں بیٹھے رہے، انٹرنیشنل گاڑیوں کے فراٹوں اور جہازوں کی اڑانوں سے لطف اندوز ہوتے رہے، کوئی ایک بھی تو شہید ہونے کے لیے نہیں نکلا..... حالانکہ یہ بڑے اگر مزاحمت کرتے اور جانیں قربان کرتے تو پاکستان میں امریکی اڈے نہ بنتے..... جب بڑے چپ سادھ گئے اور بولنے والے سیاسی بولی بولنے لگے تو عوام کیا کرتے، ان کی آواز دم توڑ گئی۔

اب جیسے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اہل پاکستان بے وفا ہیں، اسی طرح یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ اہل کوفہ بے وفا تھے، ہاں اُس وقت بھی بڑوں نے بے وفائی کی تھی، اب بھی بڑوں نے بے وفائی کی ہے۔

پھر اکتوبر ۲۰۰۲ء میں انتخابات ہوئے تو مذہبی جماعتوں کا اتحاد صرف طالبان کی حمایت یا مخالفت کے نعرے پر میدان میں اترا، لوگوں نے امریکی ظلم پر اپنے غیظ و غضب کا اظہار ووٹ سے کیا، چنانچہ پاکستان کی تاریخ میں مذہبی جماعتوں کو کبھی اتنے ووٹ نہیں ملے، جتنے ان انتخابات میں ملے۔

لیکن ایک سال تک قومی اسمبلی میں ایل، ایف، او کے مسئلے پر ڈیک بجانے کے بعد جب وقت آیا تو سیاسی چالوں سے اُسے ہی جتوایا، جس کی مخالفت میں عوام نے انہیں ووٹ دیے تھے! غضب یہ ہے کہ صوبہ سرحد میں حکومت بھی ایم، ایم، اے کی ہے اور وانا آپریشن بھی وہیں سے ہو رہا ہے!

کوئی حد ہے اس بے وفائی کی!

اب اس میں عوام کا کیا قصور!

اسی طرح کوئی عوام بھی بے قصور ہیں، سارا قصور کوئی سرداروں کا تھا، اس لیے ”کوئی بے وفا“ کہنا درست نہیں ”کوئی سردار بے وفا“ کہنا چاہیے، جیسے ”پاکستانی بے وفا“ نہیں کہا جائے گا، ”پاکستانی رہنما بے وفا“ کہنا چاہیے۔

بے وفا خون سے وفادار پیدا نہیں ہوا کرتے لیکن یہ کیا ہے کہ واقعہ کربلا کے بعد انہی کوفیوں کی نسل میں اسلام کے وفادار اور عظیم خدمت گزار پیدا ہوئے!

کیا یہ اس حقیقت کی دلیل نہیں کہ ان کے آباؤ کوئی عوام مخلص اور نیک نیت تھے؟ اور جن سرداروں نے بے وفائی کی، ان کی نسلیں مٹ گئیں۔

امام حسینؑ سے بے وفائی معمولی جرم نہیں تھا

اور امت سے بے وفائی بھی کوئی معمولی جرم نہیں ہے!

معصوم اور محفوظ میں فرق

معصوم وہ ہے جس سے خطا ہوتی ہی نہیں، اگر کبھی بتقاضائے بشریت خطا ہو بھی جائے تو اللہ تعالیٰ فوراً اس کی اصلاح فرما دیتا ہے۔

محفوظ وہ ہے جس سے خطا ہو سکتی ہے اور ضروری نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی خطا کی اصلاح ہو، لیکن چونکہ نہایت درجہ مخلص، نیک نیت اور صالح ہوتا ہے، اس لیے دنیا میں سوء خاتمہ اور آخرت میں عذاب سے محفوظ رہتا ہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں، جبکہ صحابہ کرامؓ، اولیاء عظامؓ، ائمہ فخام محفوظ ہوتے ہیں۔

ہمارے ہاں صحابہ کرامؓ کی شان بیان کرتے ہوئے ایسی جذباتی تقریریں کی جاتی ہیں کہ صحابہؓ سے خطا ہو، یہ کیسے ممکن ہے؟ اور جو کسی معاملے میں بیان واقعہ کے لیے خطا کا ذکر کر دے، وہ گستاخ ہے، اور پھر تان بیعت یزید پر آ کر ٹوٹتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ بدر کے قیدیوں، غزوہ احد، واقعہ افک پھر لشکر اسامہؓ کی روانگی اور دوسرے متعدد مواقع پر کیا خطا نہیں ہوئی؟ بالکل اسی طرح بیعت یزید کے معاملے میں بھی بیعت کرنے والوں سے اجتہادی خطا ہوئی..... یہاں بیعت سے انکار کرنے والے بھی عظیم المرتبت صحابہؓ ہی تھے، بالفرض امام حسینؑ کے موقف کی تائید میں کوئی اور صحابی نہ بھی ہوتا تو تنہا آپؐ کی شخصیت ہی اتنی بلند مرتبہ ہے کہ صرف آپؐ کا انکار ہی کافی ہوتا!

آخر کوئی توجہ تھی کہ یزید کو سب سے پہلے آپؐ ہی سے بیعت لینے پر اتنا اصرار تھا!

اس سلسلے میں اہل السنۃ والجماعۃ کا مسلک یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کے حوالے سے طعن و تشنیع حرام ہے، البتہ بیان خطا جائز ہے۔

ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ”جب میرے اصحاب کا ذکر ہو تو زبان سنبھال کر بات کرو“ یعنی ان پر طعنہ زنی نہ کرو، کیونکہ قرآن مجید نے متعدد مقامات میں ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی رضا کا اعلان فرمایا ہے، اس کا لازمی تقاضا ہے کہ ان کا انجام بخیر ہو اور ان کا ٹھکانہ جنت ہو۔ علاوہ ازیں (اپنی خدمات اور قربانیوں کی وجہ سے) اُن کے امت پر حقوق ہیں، لہذا لازم ہے کہ ان کا ذکر ثنائے جمیل اور دعائے جزیل سے کیا جائے۔

لیکن تمام تر احترام کے باوجود اس میں کوئی گناہ نہیں کہ اجمالی طور پر یا تعین کے ساتھ یہ بتلایا جائے کہ علیؑ کے ساتھ جنگ آزما ہونے والے بغاوت کی راہ پر چل رہے تھے، جیسا کہ حدیث عمارؓ واضح طور پر بتلا رہی ہے کہ ”تجھے باغی جماعت قتل کرے گی“، اس لیے کہ مقصود یہ ہے کہ حق اور باطل کے درمیان تمیز ہو جائے اور مجتہد کی خطا اور صواب کا سب کا پتہ چل جائے، لیکن خیال رہے کہ اُن کی تعظیم و توقیر کا دامن دل سے چھوٹنے نہ پائے، چنانچہ بعض اکابر سے پوچھا گیا کہ عمرؓ بن عبدالعزیز افضل ہیں یا معاویہؓ؟ تو فرمایا: رسول اللہ ﷺ کی ہم رکابی میں معاویہؓ نے جس گھوڑے پر بیٹھ کر جہاد کیا، اس گھوڑے کی ناک کا غبار بھی عمرؓ بن عبدالعزیز سے بہ مراتب افضل ہے۔ (مرقاۃ: ۱۰/۱۳۱)

غزوہ بدر میں ستر کافر قیدی بنے، اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں مسلمانوں کے سامنے دو صورتیں رکھیں:

(۱) انہیں قتل کر دو

(۲) یا فدیہ لے کر چھوڑ دو، لیکن اس صورت میں آئندہ سال اتنی ہی تعداد میں تمہارے آدمی شہید ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اختیار مسلمانوں کے امتحان کے لیے تھا، صحابہ کرامؓ نے دینی، اخلاقی اور مالی مصلحتوں کے پیش نظر فدیے کی صورت اختیار کی، اللہ تعالیٰ کو

یہ پسند نہ آئی تو سورۃ الانفال، آیت: ۶۷، ۶۸ میں شدید عتاب ہوا۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی آیات مذکورہ کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

”..... بہر حال فدیہ لے کر چھوڑ دینا اُس وقت کے حالات کے اعتبار سے بڑی بھاری غلطی قرار دی گئی..... اُسے صحابہ جیسے مقربین کی شان عالی اور منصب جلیل کے منافی سمجھا گیا، اسی لیے ان آیات میں سخت عتاب آمیز لہجہ اختیار کیا گیا۔ حدیث میں ہے کہ لڑائی میں ایک شخص کے سر پر زخم آیا، اُسے غسل کی حاجت ہوئی، پانی سر پر استعمال کرنا سخت مہلک تھا، ساتھیوں سے مسئلہ پوچھا، انہوں نے کہا: پانی کی موجودگی میں ہم تیرے لئے کوئی گنجائش نہیں پاتے، اس نے غسل کر لیا، نتیجہ فوت ہو گیا، حضور ﷺ کو جب اس واقعے کی اطلاع ہوئی تو فرمایا: ”قتلوہ قتلہم اللہ“

(انہوں نے اُسے مار ڈالا، اللہ انہیں مارے)

اس سے ظاہر ہوا کہ اجتہادی غلطی اگر زیادہ واضح اور خطرناک ہو تو اُس پر عتاب ہو سکتا ہے، گویا یہ سمجھا جاتا ہے کہ مجتہد نے پوری قوت اجتہاد صرف کرنے میں کوتاہی کی۔

بغض صحابہؓ اور بغض اہل بیتؑ کی سزا

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: ”ایک طبقہ وہ ہے جو صحابہؓ پر سب و شتم کرتا ہے، دوسرا طبقہ وہ ہے جو اہل بیتؑ کو برا بھلا کہتا ہے۔ اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے، ان کی بدکلامی کی وجہ سے صحابہؓ و اہل بیتؑ کے نامہ اعمال میں، موت کے بعد بھی، حسنات کا اضافہ ہو رہا ہے اور ان دشمنوں کا نامہ اعمال روز بروز سیاہ ہوتا جا رہا ہے اور یہ قدم بہ قدم عذاب شدید کے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔“ (مرقاۃ: ۱۱/۲۸۰)

صحابہ کرامؓ پر لعن طعن قیامت کی علامت ہے

رسول اللہ ﷺ نے چند گناہوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک برائی یہ بیان فرمائی کہ جب اس امت کے پچھلے پہلے لوگوں پر لعنت کرنے لگیں تو آسمانی اور زمینی آفات کا انتظار کرو (ترمذی، مفہوم)

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں:

یہود سے پوچھا جائے کہ تمہاری امت کا بہترین طبقہ کون سا ہے؟ تو کہیں گے: اصحاب موسیٰؑ،

نصاریٰ سے یہی پوچھا جائے تو کہیں گے: اصحاب عیسیٰؑ،

لیکن ایسے بد بخت صرف اسی امت میں پیدا ہوئے جو اصحاب محمد ﷺ پر

زبان طعن دراز کرتے ہیں“ (مرقاۃ: ۱۰/۱۷۲)

قصاص عثمانؓ کا معاملہ قضا سے تعلق رکھتا ہے

اور بہترین قاضی علیؑ ہیں

حضرت علیؑ کے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد آپؑ سے ناروا انداز میں قصاص عثمانؓ کا مطالبہ کیا گیا اور لوگوں میں اشتعال پیدا کیا گیا، حالانکہ قصاص کا مسئلہ قضا سے تعلق رکھتا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے یہ سند عطا فرمائی تھی: ”واقضاهم علیؑ“ ”تمام صحابہ میں بہترین قاضی علیؑ ہیں“ (مشکوٰۃ مع مرقاۃ: ۱۱/۳۶۱)

حضرت عمرؓ اقرار کرتے تھے: ”اقضانا علیؑ“

”ہمارے درمیان بڑے قاضی علیؑ ہیں“ (صحیح بخاری: ۶۴۴۲)

عبداللہ ابن مسعودؓ جیسے فقیہ صحابی فرماتے ہیں کہ: ”ہم آپس میں یہ کہا کرتے

تھے کہ اہل مدینہ میں بہترین قاضی علی بن ابی طالبؑ ہیں“

(ہذا حدیث صحیح علی شرط الشيخین، مستدرک حاکم: ۳/۱۳۵)

لہذا قصاص عثمانؓ کے بارے میں حضرت علیؑ کا طرز عمل ہی درست اور

آپؑ کا فیصلہ ہی حجت تھا، اس بارے میں آپؑ کی دیانت پر شبہ کرنے والوں کو اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہیے۔

اور صرف قصاص ہی نہیں بلکہ آپؑ کے دور خلافت میں جتنے بھی مشاجرات

ہوئے، فقہاء کا اتفاق ہے کہ ان میں اسوۂ علیؑ ہی ہمارے لیے حجت اور ہدایت ہے۔

آپؑ کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپؑ نے انتہائی دشوار اور نامساعد حالات میں بھی خلافت

کے نظام کو منہاج نبوت سے ہٹنے نہیں دیا، آپؑ کا دور خلافت بھی آپؑ کی شجاعت،

استقامت اور فراست کا ایک نمونہ ہے۔

سیدنا علیؑ کی فراست

سیدنا علیؑ دار الخلافہ مدینہ طیبہ سے کوفہ لے گئے،
نکتہ چین کہتے ہیں کہ آپؑ نے مرکز اسلام بدل دیا!
غور کیجئے تو حقیقت کچھ اور سمجھ آتی ہے

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے لیے سیاسی، انتظامی، معاشری، سماجی معاملات
میں معیار دور نبوت اور دور خلافت ہے۔

خلفاء ثلاثہ کا دار الخلافہ مدینہ طیبہ رہا، حضرت علیؑ کا دار الخلافہ بھی مدینہ منورہ
ہی رہتا تو قیامت تک کسی اور شہر کو دار الخلافہ بنانا جائز نہ ہوتا، عملی اعتبار سے اس میں جو
مشکلات پیش آتیں، وہ محتاج بیان نہیں۔

حضرت علیؑ کے اس اقدام سے امت کے لیے وسعت اور راحت کی راہ
نکل آئی، نیز قیامت تک وہ لوگ کہاں سے آتے، جو پاکیزہ سیاست کرتے، مدینہ
میں بیٹھ کر خلافت اسلام حکومت کرنا تو ہیں رسول ﷺ کے مترادف ہوتا، تو سیدنا علیؑ
کے اس فیصلے سے حرم مدینہ کا احترام برقرار رکھنے میں مدد ملی ہے۔

حدیث معادن کا صحیح مفہوم

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(ترجمہ) ”لوگ کانیں ہیں جیسے سونے چاندی کی کانیں ہوتی ہیں، جو لوگ دور جاہلیت میں بہتر رہے، وہ اسلام میں بھی بہتر رہیں گے بشرطیکہ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کر لیں“ (مشکوٰۃ مع مرقاۃ: ۱/۲۶۷)

ناصبی حلقے میں اس حدیث شریف سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ چونکہ بنو امیہ مکہ کے اہل حل و عقد، سربراہ آوردہ، کمانڈر اور حکمران تھے، اس لیے فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کرتے ہی انہی کا حق بننا تھا کہ انہیں اہل حل و عقد، سربراہ اور حکمران بنایا جاتا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا ہی کیا..... اور یہ لوگ اپنے اس سیاسی نظریے کی تائید کے لیے مذکورہ بالا حدیث شریف کے جملے: ”خیار ہم فی الجاہلیۃ خیار ہم فی الاسلام“ کا تحریف کے ساتھ ترجمہ یوں کرتے ہیں: ”ان میں جو لوگ جاہلیت میں سربراہ آوردہ تھے، اسلام میں بھی وہی سربراہ آوردہ ہیں.....“

یہ استدلال درست نہیں۔ حدیث کا مقصود، جیسا کہ اوپر ترجمے سے واضح ہو رہا ہے، یہ ہے کہ جیسے سینہ کائنات میں اللہ تعالیٰ نے مختلف اشیاء کی کانیں رکھی ہیں، اسی طرح سینہ انسان میں بھی اللہ تعالیٰ نے فکری و نظری صلاحیتوں اور عملی و اخلاقی قوتوں کی کانیں ودیعت فرمائی ہیں، اور اللہ کا دین اللہ کی عطا کردہ ان صلاحیتوں کو دبانا نہیں، ابھارتا ہے، ان قوتوں کو زنگ نہیں لگاتا، بلکہ صیقل کرتا ہے، ہاں صحیح سمت میں کوشش انسان کی اپنی ذمہ داری ہے، چنانچہ دور جاہلیت میں جو لوگ بہتر فکری اور عملی صلاحیتیں رکھتے تھے، لیکن ان کی صلاحیتیں بے محل صرف ہو رہی تھیں، شرف اسلام حاصل ہونے کے بعد جب ایمانی رسوخ پیدا ہو جائے اور دینی سمجھ بوجھ حاصل ہو جائے تو اب یہ قوتیں صحیح رخ پر استعمال ہوں گی، لہذا جلد

ترقی کریں گے اور نیکی میں جلد آگے بڑھیں گے..... سونے اور چاندی کی کانوں سے تشبیہ خود یہ مفہوم متعین کرتی ہے.....

اس حدیث کا مقصود یہ نہیں کہ جو لوگ دور جاہلیت میں سربراہ اور وہ، کمانڈر اور چودھری تھے، اسلام قبول کرنے کے بعد ان کا استحقاق ہے کہ انہیں کمانڈر اور چودھری مانا جائے اور انہیں عہدے تفویض کیے جائیں۔

سماجی مرتبے، سیاسی حیثیت اور روحانی فضیلت کا معیار سبقت اور خدمت ہے، اور یہاں ایک ایک لمحہ اور ایک ایک قدم مرتبہ متعین کرتا ہے۔ قرآن مجید کی نص بھی یہی ہے اور خلافت راشدہ کی زیریں روایات بھی یہی رہیں، اور تاریخ کی شہادت ہے کہ جب بھی گڑ بڑ ہوئی، اس میرٹ سے انحراف کے نتیجے میں ہوئی۔

یہ بھی غنیمت ہے کہ یہ لوگ بنو امیہ کا یہ تقابل صرف السابقون الاولون صحابہؓ ہی سے کرتے ہیں، یہ نہیں کہتے کہ مکہ میں حضور اکرم ﷺ کا خاندان والا شان مذہبی مراسم کا قائد تھا، سیاسی قیادت بنو امیہ کے پاس تھی، اس لیے بنو امیہ کے مسلمان ہوتے ہی حضور ﷺ کے لیے مناسب تھا کہ عبادات کی امامت اپنے پاس رکھتے اور سیاسی قیادت بنو امیہ کے حوالے کر دیتے!

یزیدی تلبیس

کچھ لوگ بہت جوش کے ساتھ اکثر یہ جملہ کہا کرتے ہیں:

”صحابہ کرامؓ قرآنی شخصیات ہیں، تاریخی شخصیات نہیں“

غور کیجئے تو اس جملے میں ”صحابہ کرامؓ“ کا ذکر نا صبی تقیہ ہے، مقصود خوب واضح ہے، اور قرآن مجید کی یہ آڑ پہلی مرتبہ نہیں لی گئی، بلکہ اس سے پہلے بھی قرآن نزول پر اٹھایا جا چکا ہے!

سیدھی بات ہے کہ اگر صحابہ کرامؓ صرف نزول قرآن تک زندہ رہے تو صرف قرآنی شخصیات ہیں اور اگر نزول قرآن مکمل ہونے کے بعد تاریخ کے کسی عہد میں بھی زندہ رہے تو تاریخی شخصیات بھی ہیں۔

قرآن مجید کی آڑ میں جو عقیدہ معصومیت دیا جا رہا ہے، اہل السنۃ والجماعۃ کبھی اس عقیدے کے حامل نہیں رہے۔ شیعہ صرف گیارہ معصومین عن الخطا مانیں تو مجرم، یزیدی ایک لاکھ چوبیس ہزار معصومین عن الخطا کا دعویٰ کریں تو پکے مسلم!

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح خارجیوں کا ”ان الحکم اللہ“ کا نعرہ ایک تلبیس تھا، یہ جملہ بھی ایک تلبیس ہے، اور ہم اس یزیدی تلبیس کے جواب میں وہی کہتے ہیں، جو سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم نے خارجی تلبیس کے جواب میں کہا تھا: ”کلمۃ حق اريد بها الباطل“ یعنی بات حق ہے، مقصود باطل ہے۔

امام حسینؑ کی امامت

ایک عالم نے مجھے کہا: حسینؑ کو امام کیوں کہتے ہو؟ وہ صرف کے امام ہیں یا نحو کے، تفسیر کے امام ہیں یا حدیث کے، انہوں نے کوئی فقہ مرتب کی ہے یا منطق و فلسفہ کی گتھیاں سلجھائی ہیں؟ یا معانی، بیان اور بدیع کے اصول بیان کیے ہیں؟

میں نے عرض کیا: سبحان اللہ! فکر ہر کس بقدر ہمت اوست!

ائمہ اہل بیتؑ کے لیے آپ نے بہت چھوٹے پیمانے تلاش کیے
ائمہ اہل بیتؑ تو وہ ہیں کہ ان کے عمل کا نام تفسیر اور ان کے قول کا نام حدیث ہے
صرف اور نحو نے ان کی گفتگو سے جنم لیا

فصاحت و بلاغت کے اسالیب ان کے تکلم سے متعین ہوئے
منطق و فلسفہ ان کی فکر کی خیرات ہے

اور ابوحنیفہؒ و مالکؒ، شافعیؒ و احمدؒ ان کے قدموں کی دھول ہیں!
سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:
”انی جاعلک للناس اماماً“ (البقرہ: ۱۲۴)

”میں تجھے سب لوگوں کا امام بناؤں گا“.....

ابراہیمؑ کون سے علم و فن کے امام تھے؟ میں نے پوچھا۔

حسینؑ کی امامت اپنے جدا مجد جیسی تھی،

آپؑ ہدایت و عزیمت اور استقامت و شہادت کے امام تھے۔

ایک صاحب نے مجھے لکھا امام حسینؑ کہتے ہو تو امام ابو بکرؓ اور امام عمرؓ کیوں

نہیں کہتے؟

میں نے کہا: ان اصحابؓ کے لیے خلیفۃ الرسول اور امیر المؤمنین کے القاب

معروف ہیں اور کسی بھی شخصیت کے ساتھ معروف القاب ہی جتے ہیں، باقی اس میں

کوئی شک نہیں کہ یہ اصحابؓ بھی امت کے امام اور مقتدا ہیں۔

سراب

امت کی تاریخ میں جتنی پر عظمت نسبتیں امام حسینؑ کے دامن میں ہیں، کسی کے پاس نہیں۔ حکومت نے آپؑ کو شہید تو کر دیا، لیکن آپؑ کی بات نہیں مانی۔ اب اگر کوئی بڑے سے بڑا شخص یہ خیال رکھتا ہے کہ حکومت میرے احترام میں اپنی پالیسی بدل لے گی، تو وہ سراب کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔

غلط تصور

امام حسینؑ پر اعتراض کرنے والوں کے ذہن میں اپنے ماحول کی وجہ سے لیڈروں، پیروں اور مہتمموں کی اولاد کا تصور ہوتا ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ امامؑ کا احترام بس ”صاحبزادہ“ ہونے کی وجہ سے ہے اور یہ سارا حادثہ ایک صاحبزادے کی ضد کی وجہ سے ہوا۔ یہ تصور غلط ہے، امام حسینؑ نسب کی عظمت کے ساتھ ذاتی اوصاف و محاسن کے بھی حامل تھے، درجہ اجتہاد اور مرتبہ امامت پر فائز تھے، آپؑ کا اقدام ضد نہ تھا، جد اور جہل تھا، فساد نہ تھا، اجتہاد تھا۔

دورِ فتنہ میں ثابت قدم رہنے پر امام احمد بن حنبلؒ کی تحسین کرنے والے امام حسینؑ کے لیے نجانے کیوں کنگ ہو جاتے ہیں، حالانکہ وہاں بھی چند آدمی امام احمدؒ کے ہم نوا تھے اور ان میں سے بھی اکثر ساتھ چھوڑ گئے تھے۔
راہِ عزیمت پر چلنے کے لیے حسینی حوصلہ چاہیے:

یہ شہادتِ مگر الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

فتنہ انگیز کون ہوتا ہے؟

ایک عالم نے مجھے کہا: حسینؑ نے اپنی رائے پر اصرار کر کے فتنہ برپا کیا.....
معاذ اللہ ثم معاذ اللہ

یہ پست سوچ صرف اس دور کے گمراہوں کی نہیں، شام کے یزیدی بدبختوں کی سوچ بھی یہی تھی۔

جب امام علی بن حسینؑ زین العابدین کو گرفتار کر کے دمشق لایا گیا تو ایک شامی کھڑا ہوا اور کہا:

”اللہ کا شکر ہے جس نے تمہیں قتل کر دیا، تمہاری بیخ کنی کردی اور فتنے کے دونوں سینک کاٹ ڈالے“ (روح المعانی: ۲۵/۳۱)

بات یہ ہے کہ فتنہ انگیز وہ ہوتا ہے جو شریعت کے مسلمہ احکام اور طے شدہ سیاسی نظام سے انحراف کرے اور انسان کی فطری حریت کو سلب کر لے۔

ایسے ظالم و جابر کے سامنے کلمہ حق کہنا فتنہ نہیں افضل جہاد ہے۔

اگر کلمہ حق بلند کرنا فتنہ انگیزی ہے تو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی آیات کا مفہوم کیا ہے!

ہر شرع سے بے گانہ لوگ

امام حسینؑ نے اپنے پرخطر سفر میں عورتوں، بچوں کو ہمراہ لا کر یہ ثابت کرنا چاہا تھا کہ اس وقت جو لوگ میرے مقابل ہیں، یہ کسی شرع و آئین کے پابند نہیں، شرع اسلام تو کجا، یہ شرع انسانیت سے بھی بے گانہ ہیں۔

جیت، ہار

ضروری نہیں کہ مقتول ہار گیا اور قاتل جیت گیا
بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ مقتول قتل ہو کر جیت جاتا ہے
اور قاتل قتل کر کے ہار جاتا ہے۔

قاتل قتل کر کے ہار گیا،
ہاتل قتل ہو کر جیت گیا۔

کربلا میں بھی یہی ہوا۔

عظمتِ عاشوراً

عاشوراً ہی تھا، جب فرعون اپنے جاہ و جلال اور شان و شوکت سمیت قلمزم کی
موجوں میں غرق ہوا۔

اور عاشوراً ہی تھا، جب ملوکیت کا سفینہ خونِ ناحق کی لہروں میں ڈوب گیا:

تاقیامت قطع استبداد کرد

موجِ خونِ او چمنِ ایجاد کرد

کچھ اوقات اعمال کی قیمت بڑھا دیتے ہیں تو کچھ اعمال اوقات کی عظمت کو

چار چاند لگا دیتے ہیں!

عاشوراً ایک ایسی ہی تاریخ ہے!

اہلِ عزیمت ہر دور میں کم رہے

امام حسینؑ پر اکثریت کی مخالفت کا الزام عائد کرنے والے جابر سلاطین
کے سامنے کلمہ حق کہنے والوں کے بارے میں کیا کہیں گے، جن کی تعداد ہر دور میں
اقلِ قلیل رہی؟

اکثریت ہمیشہ رخصت کی راہ پر چلی یا اقتدار کی ہمنوا رہی۔

اہلِ عزم و عزیمت ہر دور میں کم رہے، لیکن حق کی آبرو اور ملت کی آرزو وہی تھے۔

نسبت کا احترام لازم ہے

ارشادِ بانی ہے:

”یا ایہا الذین آمنوا لاتحلوا شعائر اللہ ولا الشهر الحرام ولا

الہدی ولا القلائد.....“ (المائدہ: ۲)

ترجمہ: ”ایمان والو! بے حرمتی نہ کرو اللہ کی نشانیوں کی اور نہ حرمت والے مہینے کی

اور نہ ہدی کی اور نہ (اُس کے گلے میں پڑے) ہاروں کی“

اللہ تعالیٰ نے اُس پٹے اور ہار کا احترام بھی لازم کر دیا، جو ہدی کے گلے

میں پڑا ہو، کیونکہ اس ہار کا اب تعلق ہے ہدی سے، اور ہدی کی نسبت ہے اللہ کی

طرف اور اللہ کا احترام لازم ہے، لہذا جو جو چیز اللہ سے خاص نسبت رکھتی ہو، اس کا

بھی احترام لازم ہے۔

اب سوچیے! جو رسول اللہ ﷺ اور علی وفاطمہ رضی اللہ عنہما کے گلے کا ہار

تھا، اور عارضی نہیں، دائمی ہار تھا، اس کا احترام کیوں کر لازم نہ ہوگا؟!

ایذا رسول ﷺ باعث لعنت اور سبب عذاب ہے

ارشاد الہی ہے: ”إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا

وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُهِينًا“ (الاحزاب: ۵۷)

ترجمہ: ”جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو اذیت پہنچاتے ہیں، اللہ نے دنیا اور

آخرت میں ان پر لعنت کی ہے اور ان کے لیے اہانت آمیز عذاب تیار کر رکھا ہے۔“

صحاح میں مسور بن مخرمہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”بنو ہشام بن مغیرہ (ابو جہل کا خاندان) علی بن ابی طالب سے اپنی بیٹی کا نکاح

کرنے کی اجازت مانگ رہے ہیں، میں اجازت نہیں دوں گا، پھر اجازت نہیں دوں

گا، پھر اجازت نہیں دوں گا، الا یہ کہ ابن ابی طالب چاہے تو میری بیٹی کو طلاق دے

دے اور ان کی بیٹی سے نکاح کر لے، فاطمہؓ تو میرا ایک ٹکڑا ہے، اس کی پریشانی میری

پریشانی اور اس کی اذیت میری اذیت ہے“ (الصواعق: ۱۹۰)

چنانچہ حضرت علیؑ نے سیدہ فاطمہؓ کی حیات طیبہ میں دوسرا نکاح نہیں کیا۔

غور کیجئے! ایک جائز کام میں رسول اللہ ﷺ نے سیدہ فاطمہؓ کی اذیت گوارا

نہیں کی تو کربلا کے مظالم سے سیدہ فاطمہؓ اور خود رسول اللہ ﷺ پر کیا ہوتی ہوگی؟

اس آیت اور روایت سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اہل بیتؑ کو ایذا رسول

اللہ ﷺ کو ایذا ہے اور رسول اللہ ﷺ کو ایذا اللہ کو ایذا ہے..... تو جن لوگوں نے

اہل بیتؑ کو اذیت پہنچائی اور اب جو لوگ اس ظالمانہ حکومت کو جواز فراہم کرتے

ہیں، یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کو اذیت پہنچا کر زندان لعنت میں گرفتار اور عذاب مہین کے

حقدار ہو رہے ہیں۔

اس سے بڑا فساد اور کیا ہوگا!

اللہ تعالیٰ دلوں میں مرضِ نفاق پالنے والوں سے فرماتا ہے:
(ترجمہ) ”پس تم سے کیا توقع ہے کہ اگر تم والی بن جاؤ تو ملک میں فساد مچاؤ اور اپنے
رشتے ناتے کاٹ ڈالو“ (محمد ﷺ: ۲۲)

اور اس خود غرضی اور مفاد پرستی کے جرم کا نتیجہ یہ ہوگا:
(ترجمہ) ”یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی تو ان (کے کانوں) کو بہرا اور
آنکھوں کو اندھا کر دیا“۔ (محمد ﷺ: ۲۳)

اور ان کی بیماری کا سبب یہ ہے:

(ترجمہ) ”کیا یہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے یا دلوں پر تالے پڑے ہیں؟“ (محمد ﷺ: ۲۳)
سبحان اللہ! قرآن کے عجائب کی انتہا نہیں، یوں لگتا ہے کہ ان آیات میں یزیدی دور کا
نقشہ کھینچا گیا ہے:

حکومت ملی تو ملک میں فساد برپا کیا، اپنے والد ماجد حضرت معاویہؓ کی
وصیت کو بھی نظر انداز کرتے ہوئے رشتوں کے حقوق بھلا دیے، اس گناہ کے نتیجے میں
لعنت پڑی، پھر بہرے، اندھے ہو کر ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا جرم
کرتے گئے، اور اس سنگدلی کا سبب یہ تھا کہ قرآن میں دھیان نہیں تھا، ورنہ اہل بیتؑ
کا مقام پہچانتے اور دلوں پر جاہلی تعصب کے تالے پڑے ہوئے تھے، اس لیے اتنا بڑا
پاپ کر گزرے!

آیات مذکورہ بالا کی تفسیر میں ابوالفضل سید محمود آلوسیؒ بغدادی (المتوفی ۱۲۷۰ھ)
ایک واقعہ نقل فرماتے ہیں:

”امام احمد بن حنبل سے ان کے بیٹے عبد اللہ نے یزید پر لعنت بھیجنے کے
بارے سوال کیا تو انہوں نے فرمایا:

جس شخص پر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں لعنت کی ہو، اس پر کیسے لعنت نہ

کی جائے!

عبداللہ نے کہا: کتاب اللہ تو میں نے بھی پڑھی ہے، مجھے تو اس میں یزید پر

لعنت نہیں ملی؟

اس پر امام احمدؒ نے مذکورہ بالا آیات پڑھیں اور فرمایا:

یزید نے جو کرتوت کیے، ان سے بڑا فساد اور قطع رحمی اور کیا ہوگی!“

(روح المعانی: ۷۲/۲۶)

امام حسنؑ اور امام حسینؑ نے اپنا حق وصول کیا

امیر معاویہؓ اپنے دور حکومت میں امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی خدمت میں..... ایک معاہدے کے تحت، کمافی روایہ..... عطیات بھیجتے تھے، اور دونوں حضرات قبول فرماتے تھے۔

ناصبی حلقے میں یہ بات تحقیر اور تحریص کے انداز میں لکھی گئی اور یزیدی خطیبوں نے وظیفہ خواری کے عنوان سے اس کا مضحکہ اڑایا۔
حقیقت کچھ اور ہے۔

رسول اللہ ﷺ اور اہل بیتؑ کا اپنی قربانیوں اور خدمتوں کی وجہ سے اسلامی نظام میں خاص مقام ہے۔ اس اختصاص کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید میں ان حضرات کا وظیفہ مقرر فرمایا:

(ترجمہ) ”اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کو غنیمت ملے کسی چیز سے تو اللہ کے لیے ہے اُس کا خُمس اور رسول کے لیے اور اُس کے قرابت داروں کے لیے“ (الانفال: ۴۱)
سیدنا عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں جب صحابہؓ کے وظائف مقرر فرمائے تو بدری صحابہؓ کا وظیفہ سب سے زیادہ رکھا، امام حسنؑ، امام حسینؑ بدری نہیں ہیں، لیکن ان دونوں کا وظیفہ بدری صحابہؓ کے برابر پانچ پانچ ہزار درہم مقرر فرمایا۔

(الحسینؑ حفیداً و شہیداً: ۲۲)

اب کیا عمرؓ کی عدالت پر بھی شک ہے!

اس لیے یہ حضراتؑ امیر معاویہؓ سے اپنا حق لیتے تھے اور اپنا حق لینا نہ صرف جائز بلکہ عین حق ہے۔

ابن کثیرؒ اس سلسلے میں ایک دلچسپ مکالمہ روایت کرتے ہیں:

”ایک دن امیر معاویہؓ نے امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی خدمت میں دو لاکھ

پیش کیے اور کہا:

قبول کیجئے، میں ابن ہند ہوں، واللہ اتنا عطیہ آپ کو مجھ سے پہلے کسی نے دیا ہوگا نہ میرے بعد کوئی دے گا!

اس پر امام حسینؑ نے فرمایا:

واللہ! آپ نے اور آپ سے پہلے اور آپ کے بعد کسی نے ہم سے افضل کسی شخص کو عطیہ دیا بھی نہیں ہوگا!“ (الحسین حفیذاً و شہیداً: ۱۹۰)

اور یہ بھی تو دیکھیے یہ قدسی صفات ان عطیات کو کہاں خرچ کرتے تھے؟ اس حوالے سے چند واقعات گذشتہ اوراق میں گذر چکے ہیں، ایک واقعہ اور پڑھیے اور ایمان تازہ کیجئے۔

”ایک دن ایک آدمی امام حسینؑ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا: فرزند رسول ﷺ! میں ایک درویش ہوں اور عیال دار ہوں، آج رات کے لیے کھانا چاہتا ہوں۔

فرمایا: بیٹھ جاؤ، ہمارا رزق راستے میں ہے، اس کے پہنچنے کا انتظار کرو۔ کچھ دیر نہ گزری تھی کہ امیر معاویہؓ کا بھیجا ہوا ایک آدمی آیا اور پانچ تھیلیاں سرخ دیناروں کی لایا، ہر تھیلی میں ہزار دینار تھے۔

لانے والے نے عرض کیا کہ امیر معاویہؓ نے معذرت کی ہے اور کہا ہے کہ ابھی یہ اپنے خدمت گزاروں پر خرچ کریں، اور انتظام کیا جا رہا ہے۔

امام حسینؑ نے پانچوں تھیلیاں سائل کو اٹھا دیں اور فرمایا:

تمہیں بہت زحمت ہوئی، بہت انتظار کرنا پڑا، اگر مجھے معلوم ہوتا کہ رقم کی مقدار اس قدر کم ہے تو میں تمہیں اتنی دیر انتظار میں نہ بٹھاتا، ہمیں معاف کر دو کہ ہم اہل آزمائش ہیں، دنیا کی تمام راحتوں سے دور رہ کر، اپنی تمناؤں سے منہ موڑ کر

دوسروں کی ضرورتیں پوری کرنے میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔“

(کشف المحجوب، باب ہشتم، اہل بیتؑ)

یہ واقعہ سید محمدؑ مبارک علوی کرمانی المعروف بہ امیر خور د نے بھی سیر الاولیاء: ص ۸۳ پر نقل کیا ہے۔

اللہ اللہ! کیا ٹھکانہ ہے اس سخاوت کا!

صلی اللہ علیہ وآلہ وبارک وسلم

عظمتِ صحابہؓ کا نعرہ

وطن عزیز میں عظمتِ صحابہؓ کا نعرہ بلند ہوا اور بروقت ہوا، لیکن ہمیشہ کی طرح نا صبی ایک سازش کے تحت اہل حق کی جماعت میں گھس گئے اور عظمتِ صحابہؓ کے نعرے کو دلوں میں پوشیدہ بغضِ اہل بیتؑ کے لئے ڈھال بنا لیا، یہ لوگ صحابہؓ سے محبت کی آڑ میں یزیدی ظلم و جور کو سند جواز فراہم کرنا چاہتے ہیں۔

سوچنے کی بات ہے کہ کیا امام حسینؑ صحابی نہیں تھے؟

بلکہ انہیں تو نسبت کے ساتھ نسب کی فضیلت، تربیتِ نبویؐ کا شرف، اور نبوی دعاؤں اور بشارتوں کا نور بھی حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خلفاء راشدینؓ سمیت تمام صحابہؓ آپؐ کی تعظیم و تکریم کرتے تھے،

اب صحابہؓ کی عظمت کا نعرہ لگایا جائے اور جس ہستی کی صحابہؓ بھی تعظیم کرتے ہوں، انہیں مجروح کیا جائے، یہ دل کا مرض ہی تو ہے!

کیا عجب ہے

جو باہر سے آئے اور بہت بعد میں آئے، وہ تو اسلام کا سیاسی نظام سمجھ گئے اور جو لوگ بیتِ نبوت میں پیدا ہوئے، آغوشِ رحمت میں پلے بڑھے، معلمِ قدسی ﷺ سے کتاب و حکمت کی تعلیم لی، وہ اسلام کے سیاسی نظام سے نابدر رہے!

نسب اور نسبت

حضرت نوحؑ کا بیٹا کنعان نافرمان اور بدعقیدہ تھا، اس لیے اسے کشتی نوحؑ میں سوار ہونے کی اجازت نہ ملی، نوحؑ نے عرض کیا تو جواب ملا:

”إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ“ (ہود: ۴۶)

”وہ تیرے اہل بیت میں داخل ہی نہیں کیونکہ سراپا بد عمل ہے“

معلوم ہوا اصل چیز نسب نہیں نسبت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ بھی کشتی نوحؑ میں سوار ہوئے جو اہل بیت نوحؑ سے نہیں تھے، لیکن نسبت رکھتے تھے۔

اسی طرح جو شخص حسنی یا حسینی ہے، لیکن نا صبی موقف کا ترجمان اور یزیدیت کا نقیب ہے، وہ نسبی تعلق ہونے کے باوجود سفینہ اہل بیتؑ میں سوار نہ ہو سکے گا، اور جو اس میں سوار نہ ہوا، حدیث نبوی کے مطابق، ہلاک ہوا۔

اور جو لوگ اہل بیتؑ سے محبت رکھتے ہیں، ان کے مشن کے خدمت گزار ہیں، وہ نسبی تعلق نہ ہونے کے باوجود سفینہ اہل بیتؑ میں سوار ہیں اور جو اس میں سوار ہیں، وہ ہلاکت سے پار ہیں۔

نسبت کی سعادت سے سلمانؑ فارس سے آ کر اہل بیت میں محسوب ہوئے اور ابو لہب نسبی تعلق کے باوجود داخلِ ناراً ذات لہب ہوا:

پسرِ نوحؑ بابتِ بنشست
خاندانِ نبوتش گم شد
سب اصحابِ کہف روزے چند
پئے نیکاں گرفت مردم شد

حسینی اور یزیدی

عین ممکن ہے کہ ایک شخص نسباً تعلق نہ ہونے کے باوجود اپنے حسن عمل کی وجہ سے حسنی، حسینی شمار ہو اور ایک شخص حسنی، حسینی ہوتے ہوئے اپنے ظلم و جور اور اپنے فسق و فجور کی وجہ سے یزیدی قرار پائے۔

بات عمل سے بنتی ہے۔

فکری تضاد

عصر حاضر میں یزیدیت کے نقیب جمہوریت کو حرام کہتے ہیں اور برسر منبر جمہوریت کو ایسی ایسی گالیاں دیتے ہیں کہ منبر و محراب کی جہیں بھی عرق آلود ہو جاتی ہے۔ لیکن جب امام حسینؑ اور دوسرے اصحابؓ کی بات آتی ہے تو کہتے ہیں کہ صحابہؓ کی اکثریت نے یزید کی بیعت کر لی تھی، لہذا اسے تسلیم کرنا چاہیے! یہ بغض اور ضد نہیں تو اور کیا ہے؟

افراط و تفریط

ایک گروہ نے زیادتی کی، صحابہ کرامؓ کا ذکر چھوڑا اور سب دشتم کیا۔ دوسرے گروہ نے ان کی ضد میں بے وقوفی کی کہ اہل بیتؓ کا تذکرہ چھوڑ دیا۔ تیسرا گروہ ضد میں اور آگے بڑھا اور اہل بیتؓ پر نقد و جرح کرنے لگا۔ افراط و تفریط پر مبنی اس روش کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ عوام الناس اہل بیتؓ کو شیعہ خیال کرتے ہیں اور صحابہؓ کو سنی سمجھتے ہیں! اس لیے جب تک دونوں طرف دونوں کا ذکر نہیں ہوتا اور احترام و محبت سے نہیں ہوتا، اعتدال و اتفاق پیدا نہیں ہو سکتا۔

بغض اور ضد

کچھ لوگ وہ ہیں جو حب صحابہؓ کے عنوان سے بغض اہل بیتؑ کی بھڑاس نکالتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جنہیں صرف شیعہ دشمنی یزیدی کمپ میں لے گئی ہے۔ ارشاد گرامی ہے: ”وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَنْ لَا تَعْدِلُوْا، اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی“ (المائدہ: ۸)

(ترجمہ) ”اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث عدل کو ہرگز نہ چھوڑو، عدل کرو، یہی تقویٰ سے قریب تر ہے۔“

اس لیے ہم کسی کی کجروی کی وجہ سے اہل بیتؑ کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑ سکتے۔ ہمارا جینا، ہمارا مرنا حب آل محمد ﷺ پر ہوگا، انشاء اللہ تعالیٰ بفضلہ ورحمتہ وکرمہ۔

آل محمد ﷺ

آل گھرانے کے مفہوم میں ہو یا ہر تقی و تقی آل میں داخل ہو..... تحقیق گذشتہ صفحات میں گذر چکی ہے..... بہر مفہوم ائمہ اہل بیتؑ آل کا مصداق اولین قرار پاتے ہیں۔

مہر زدہ لوگ

مجھے تعجب ہوتا تھا کہ یہ کیسے سنگدل اور بد بخت لوگ تھے، نماز میں جن پر صلوٰۃ و سلام پڑھا، سلام پھیرتے ہی انہیں قتل کر دیا۔

لیکن جب اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ نماز میں آل محمد ﷺ پر درود پڑھا، پھر خطبے میں آل محمد ﷺ پر درود پڑھا لیکن خطاب آل محمد ﷺ کی تردید میں کیا، تو یہ تعجب جاتا رہا۔

شاید ”خَتَمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ وَعَلَى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةً“ (البقرة: ۷) کی یہ بھی ایک صورت ہے!
 اور جب آیت کا پہلا حصہ ان پر صادق ہے تو دوسرا حصہ ”وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ“ بھی یقیناً ان پر صادق ہوگا!
 ایسے مہرزودہ اور مہرباختہ لوگوں کا ایمان بھی لفظی اور نماز بھی لفظی!

جعلی سنی

اہل سنت کے ائمہ اربعہ امام حسینؑ کے موقف کو تسلیم کریں اور ان کی تائید کے لیے اپنی سی کوششیں کریں۔
 اہل سنت کی صحاح ستہ میں مناقب اہل بیتؑ پر مستقل باب قائم کیے جائیں۔
 اہل سنت کے تمام اولیاء، جن میں عظیم اہل کشف بھی شامل ہیں، امام حسینؑ کے موقف کو برحق قرار دیں۔
 لیکن ایک شخص اہل سنت سے نسبت کا دعویٰ رکھتے ہوئے امام حسینؑ کے موقف کو صحیح نہ سمجھے تو وہ اپنے دعوے میں جھوٹا ہے۔

ہائے بدبختی

ہر امت نے اپنے رسول کے اصحاب کو بہترین طبقہ شمار کیا، لیکن اپنے پیغمبر ﷺ کے اصحاب کو برا کہنے والے ہمارے اندر پیدا ہوئے۔
 احترام والوں نے اپنے پیغمبر کے گدھے کا بھی احترام کیا، لیکن اپنے پیغمبر ﷺ کے گھرانے کو روندنے والے بھی ہمارے ہی اندر پیدا ہوئے۔
 اور آہ یہ کیسی بدبختی ہے کہ منبر رسول کے صدقے زندگی گزارنے والے منبر رسول پر بیٹھ کر آل رسول کی تنقیص کریں اور ہماری آنکھیں دیکھیں اور کان سنیں!
 صلی اللہ علیہ وآلہ وبارک وسلم

حسنیت حیات ہے

جن لوگوں نے حسینیت کو اپنا اسوۂ حیات قرار دے لیا ہو، وہ کبھی شکست نہیں کھا سکتے، کبھی کسی باطل سے دب نہیں سکتے، انہیں کبھی ختم نہیں کیا جاسکتا، اس لیے کہ حسینؑ زندوں کے امام ہیں، جو انہیں مان لیں، وہ بھی زندہ جاوید ہو جاتے ہیں، حسینی موقف حق ہے اور حق ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔

احترام مدینہ

خلیفہ ثالث امیر المؤمنین سیدنا عثمانؓ نے اپنی جان قربان کر دی لیکن اپنی ذات کے لیے جیتے جی سرزمین طیبہ پر خون ریزی نہیں ہونے دی۔ یزیدی لشکر نے واقعہ حصرہ میں اسی سرزمین پر صرف اپنے اقتدار کے لیے ہر سفاکی اور ناپاکی روارکھی اور دعویٰ تھا کہ ہم عثمانی ہیں! حقیقت میں یہ لوگ صرف دنیا کے بندے اور اقتدار کے غلام تھے۔

اگر میں اُس وقت ہوتا

ایک دینی مدرسے میں سیدنا علیؑ کے دور خلافت کے حوالے سے بات چل نکلی، ایک عالم نے کہا: دونوں طرف صحابہؓ ہیں، آپ کسی ایک فریق کو کیسے غلط کہہ سکتے ہیں؟ اگر میں اُس وقت ہوتا تو لشکر علیؑ میں ہوتا! میں نے کہا۔

امام ابو حنیفہؒ کا سکوت

امام ابو حنیفہؒ نے یزید کے بارے میں توقف اور سکوت فرمایا۔ اس سے نا صبی یہ استدلال کرتے ہیں کہ یزید کو کچھ نہیں کہنا چاہیے، ورنہ حنفی، حنفی نہیں رہے گا۔ یہ استدلال درست نہیں۔

امام ابو حنیفہؒ نے یزید کی تکفیر میں توقف اور سکوت فرمایا ہے (الصواعق: ۲۲۱) اس کی

تفسیق میں نہیں، آپؑ زندگی بھر امام حسینؑ کے موقف کی تائید کرتے رہے اور اسی جرم کی پاداش میں شہید ہوئے۔

یہ نہیں کہ ناصبی امام حسینؑ کے موقف کو غلط کہتے پھریں اور یزید کے مناقب بیان کریں اور اہل حق پر سکوت لازم ہو!

بعض نے امام ابوحنیفہؒ کے سکوت فرمانے کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ یزید ایک ناقابل ذکر شخصیت ہے شیطان، فرعون کی طرح، بلا ضرورت اس کا نام لینے کو بھی جی نہیں چاہتا۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: ”روایت میں وارد ہے کہ ”قاجر کا فجور بیان کر دوتا کہ لوگ اس سے بچ سکیں، فاسق کا فسق ظاہر کرنے میں غیبت نہیں“ (مرقاۃ: ۱۰/۱۳۰)

یزید اور اُس کے ہمنوا اسی طبقے میں داخل ہیں، ان کے سیاہ کارنامے بیان کر دینے چاہئیں، تاکہ امت ان کے فتنہ ضلالت سے بچ سکے۔

غیرت یا حماقت

ایک محفل دین و دانش تھی، اس میں ناصبی فکر کے کچھ لوگ بھی موجود تھے۔ میں نے پوچھا: فرض کیجئے اسامہ بن لادن گھیرے میں آجائیں، ان سے گورنر کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا مطالبہ کیا جائے وہ کہیں: میں صدر کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے لیے تو تیار ہوں، گورنر کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالوں گا۔

گھبرنے والے گورنر کے سامنے ہی ہتھیار ڈالنے پر اصرار کرتے ہیں۔ لیکن اسامہ مسلسل انکار کرتے ہیں، جنگ شروع ہو جاتی ہے، اسامہ اپنے بیٹوں، بھتیجیوں، بھائیوں کو قربان کر دیتے ہیں، خود شہید ہو جاتے ہیں، اعزہ و اقارب کو رسوا کیا جاتا ہے، مال و متاع لوٹ لیا جاتا ہے، اور یہ سانحہ صرف اس وجہ سے پیش آتا ہے کہ اسامہ گورنر کے سامنے ہتھیار پھینکنے کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں، یہ سوچ غیرت ہے یا حماقت؟

”سراسر حماقت! جب ہتھیار ڈالنے پر آمادہ ہو ہی گئے تو صدر کیا اور گورنر

کیا! گورنر صدر کا نمائندہ خاص ہی تو ہوتا ہے!“

سب بیک زبان بولے۔

میں نے کہا: اب یہ فلسفہ پڑھیے کہ یزیدیوں نے جب امام حسینؑ کا راستہ روکا اور ابن زیاد کے ہاتھ پر یزید کی بیعت کا مطالبہ کیا تو سیدنا حسینؑ نے تین باتوں کی پیشکش کی، ان میں سے ایک یہ تھی ”تم میرے راستے سے ہٹ جاؤ اور مجھے یزید کے پاس جانے دو کہ میں اپنا ہاتھ یزید کے ہاتھ پر رکھ دوں..... لیکن ”ابن زیاد کے ہاتھ پر یزید کی بیعت؟ یہ میری موت کے بعد ہی ممکن ہے“ سیدنا حسینؑ کا یہ فیصلہ عین حق تھا اور غیرتِ حسینؑ کا یہی تقاضا تھا۔ اس لیے حسینؑ شہیدِ غیرت ہیں۔“

یہ پڑھ کر سب نے سر جھکا لیے۔

ناصبی حلقے کی طرف سے اس قسم کی باتیں دراصل امام حسینؑ کی کردار کشی کی مہم کا حصہ ہیں، یہ لوگ امام حسینؑ کو ایک ضدی اور فہم و فراست سے عاری انسان ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

فاتح کون رہا؟

یزیدی عمال سانحہ کربلا کے بعد شہداء کے سروں اور اسیروں کو قریہ قریہ گھماتے ہوئے دمشق لے گئے۔ مقصد تھا کہ اہل بیتؑ رسوا ہوں اور عوام پر ہماری ہیبت بیٹھ جائے۔

لیکن ہوا کیا؟

اسیران اہل بیتؑ جہاں جہاں سے گزرے، اپنی عظمت اور کرامت کے نقوش ثبت کرتے گئے۔ اپنی جرأت اور استقامت سے حریت کی روح پھونکتے گئے، خاندان رسالت کی مظلومی اور بے کسی نے ظلم و جبر سے نفرت اور ظالموں سے انتقام کا جذبہ پیدا کیا۔

چنانچہ آج تک وہ راہیں محفوظ ہیں، جہاں سے اہل بیتؑ کا قافلہ گذرا تھا، حلب میں وہ پتھر محفوظ ہے جس پر امام حسینؑ کا سر مبارک رکھا گیا اور خون مقدس لگ گیا، عجیب بات یہ ہے کہ وہ خون ابھی تک تازہ ہے اور حیات جاوید کی شہادت دے رہا ہے: **بل احياء عند ربهم يرزقون!**

مشق میں آپ کو وہ مقام ملے گا، جہاں شہداء کے سر رکھے گئے۔ وہ ریڑھا بھی جامع مسجد میں دکھائی دے گا، جس پر خواتینؑ نے سفر کیا۔

قدم قدم پر آپ کو اہل بیتؑ سے منسوب مقامات اور مزارت نظر آئیں گے، نہایت دیدہ زیب اور ہمہ وقت آباد، عقیدت مندوں کا ہجوم، آنسوؤں کے نذرانے اور قبول دعا کی امیدیں ہر طرف بکھری ہوئی ہیں۔

اموی پایہ تخت میں اگر کوئی چیز نظر نہیں آتی تو اموی جاہ و جلال ہے، محلات کھنڈرات ہیں، تخت اور دربار نشانِ عبرت ہیں، اموی اور مروانی خاندان کی قبریں تک لوگوں نے اکھیر پھینکیں۔

کہتے ہیں یزید کی قبر عبرت کے لیے باقی رکھی گئی ہے، دیرانے میں ہے، لوگ جاتے ہیں اور قبر پر تھوک کر اپنی نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔

جو انجام فرعون کا ہو (یونس: ۹۲) یزید کا انجام بھی اس سے کچھ مختلف نہیں۔ اور کیا بعید ہے کہ اموی دور میں اہل بیتؑ کی کردار کشی کی جو سرکاری مہم چلائی گئی تھی، یہ اسی کے انتقام..... ربانی انتقام..... ہی کی ایک صورت ہو! اب دیکھیے، سوچیے اور خود فیصلہ کیجئے کہ فاتح کون رہا؟

حسینؑ یا یزید!

عزت اور ذلت

دنیا میں لاکھوں ہوئے جو حسنی، حسینی کہلوا کر معاشرے میں معزز اور شریف قرار پائے، لیکن پوری دنیا میں کوئی ایک آدمی بھی یزیدی کہلوا کر معزز نہ ہوا۔ اس سے اندازہ کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے حسنؑ اور حسینؑ کو کتنی عزت و شرافت عطا فرمائی ہے!

اور کتنی روسیاہی یزید کی قسمت میں آئی ہے!

صراط مستقیم

ہم نماز میں التزام سے دعا کرتے ہیں:

”اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ، صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ

الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ“

یہ دعا کرتے ہوئے جب ہم اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ پر پہنچتے ہیں تو بے اختیار اپنے آقا و مولا ﷺ، ابوبکر و عمر، عثمان و علی اور اہل بیت رضی اللہ عنہم کا تصور ذہن میں آتا ہے کہ یا اللہ مجھے ان حضرات کی راہ پر چلا، کبھی ذہن میں یہ نہیں آتا کہ مجھے

یزید اور یزیدی ٹولے کی راہ پر چلا۔

یہ ہر مسلمان کے دل کی وہ آواز ہے جو متعین کرتی ہے کہ نیک کردار کون ہیں اور بد کردار کون؟

جو یزید اور اس کے ہمنواؤں کو اور اس کے اقدامات کو درست سمجھتے ہیں، انہیں چاہیے کہ یہ دعا کرتے ہوئے یزید کا تصور کیا کریں!

حُب اور بغض

کسی زمانے میں کہا جاتا تھا: ”یہ بات حب علیؑ میں نہیں، بغض معاویہؓ میں ہے۔“

اب معاملہ برعکس ہے۔

اب دلوں میں بغض علیؑ اور بغض اہل بیتؑ ہوتا ہے، جسے حب معاویہؓ یا حب صحابہؓ کے پردے میں تسکین دی جاتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا علیؑ اور اہل بیتؑ صحابہؓ نہیں تھے؟ اگر صحابہؓ سے خطا نہیں ہو سکتی تو اہل بیتؑ، جو فرمان نبوی کے مطابق کبھی قرآن سے جدا نہیں ہوں گے، سے کیسے خطا ہو سکتی ہے؟

اس لیے خلافت سے لے کر کربلا اور پھر ظہور مہدیؑ تک اہل بیتؑ کا موقف ہی افضل اور اسلم ہے۔

جن حضرات کرامؑ نے اختلاف کیا، ان کے موقف کی تاویل کی جائے گی۔ خیال رہے کہ ایک موقف کی ترجیح اگر دوسرے موقف کی توہین ہے، تو یہ وہ توہین ہے، جن سے ہماری دینی کتب لبریز ہیں، اور یہ وہ گستاخی ہے جو صدیوں سے ہمارے دینی مدارس میں بیانِ مسالک کے ضمن میں شب و روز کی جارہی ہے!

بس اللہ تعالیٰ عقل سلیم عطا فرمائے!

ہمارے سیاسی رہنما

قرآن و سنت ہمارے لیے دستور العمل ہیں، لیکن تعمیل کی تمام صورتیں رسول اللہ ﷺ کے دور مبارک میں پیش آئیں نہ آ سکتی تھیں..... غالباً اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے خلفاء راشدینؓ اور اہل بیتؑ کو ہمارے لیے نمونہ عمل قرار دیا..... چنانچہ اب قیامت تک امت کے سیاسی نظام کے لیے خلافت راشدہ کے دور کو اور اہل بیتؑ کے فکر و عمل کو اپنا سیاسی رہنما مانا جائے گا۔

حالات کے اختلاف کے ساتھ ان حضراتؑ سے کیسے رہنمائی حاصل کی جائے؟ چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

☆ شریعت سے بغاوت ہو جائے تو ایسے فتنے کو فرو کرنے کے لیے سیدنا ابوبکرؓ کا عزم و استقلال ہمارا رہنما ہے۔

☆ نظام مملکت کے استحکام کے لیے سیدنا عمرؓ کے انصاف اور احتساب سے رہنمائی لی جائے گی۔

☆ مفسدین شورشاں پر پا کر رہے ہوں، خلیفہ برحق کی ناحق مخالفت پر تلے ہوئے ہوں تو سیدنا عثمانؓ ہمیں ہمت عطا فرماتے ہیں۔

☆ اپنے ہم عصروں کے ساتھ تعاون علی البر و التقویٰ کی اور ناحق کشاکش کے دور میں منہاج نبوت کے مطابق خلافت کی روشن مثال سیدنا علیؓ ہیں۔

☆ طاقت اور قوت کے باوجود امت کے بہترین مفاد میں اپنے اقتدار کی قربانی کا حوصلہ سیدنا حسنؓ سے ملتا ہے۔

☆ جابر سلطان مسلط ہو جائے، حق اور باطل میں التباس ہونے لگے، حلال و حرام کا فرق مٹنے لگے تو دس محرم کو میدان کربلا میں سیدنا حسینؑ ہمیں اسلامی نظام بچانے کا طریقہ تعلیم فرماتے ہیں۔

یہی حالات ہیں، جو سیاسی نظام میں امت کو پیش آ سکتے ہیں تو معلوم ہوا کہ قیامت تک یہی حضراتؑ ہمارے سیاسی رہنما بھی ہیں۔

کلام آخر

ہمارا المیہ بلکہ بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ہم ہمیشہ قوت اور دولت کے سامنے جھک جاتے ہیں۔
مسلم ابن عقیلؒ کے ہاتھ پر ہزاروں نے بیعت کی، لیکن سلام پھیر کر دیکھا تو ایک بھی نہیں تھا۔

اور جس کے گھر میں پناہ لی، اُس نے بھی بیچ دیا۔
امام حسینؑ کوفہ سے بالکل قریب کربلا میں جامِ شہادت نوش کر رہے تھے، ہم کوفہ میں بیٹھے افسوس تو کر رہے تھے لیکن نصرت کے لیے کوئی نہیں اٹھا۔
آج بھی ہم امام حسینؑ کی عظمت و جرأت کو سلام تو کرتے ہیں..... وہ بھی شاید اس لیے کہ اہل زمانہ نے اُن کی عظمت کو تسلیم کر لیا ہے اور اُن کے آنے کا کوئی خطرہ نہیں!..... لیکن حسینؑ کے نقش قدم پر نہیں چلتے۔
ہم آہ و فغان کی آوازیں تو بلند کرتے ہیں، لیکن کلمہ عدل کی آواز بلند نہیں ہوتی۔

شہیدوں کی داستانوں سے خون تو گرماتے ہیں لیکن شہادتِ حق کے لیے نہیں اٹھتے۔

آج بھی ہم بیعت تو مسلمؑ کے ہاتھ پر کرتے ہیں،
عقیدت حسینؑ سے رکھتے ہیں،
لیکن ساتھ یزید کا دیتے ہیں۔
ہم یزید کو پلید کہتے ہیں، لیکن گذشتہ یزید کو،
یزید حاضر سے ہم سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔
وہی عراق کی سرزمین ہے، عالمی یزید اس پر حملہ آور ہے،

وہ ہر اصول کو بالائے طاق رکھ کر نجف اشرف اور کربلا معلیٰ میں دندنا رہا ہے۔
جنتی روضوں پر میزائل اور گولے برسا رہا ہے۔
ابو غریب جیل میں ہمارے بھائیوں، بہنوں سے جو سلوک ہوا، انسانیت
اس پر ماتم کر رہی ہے۔

افغانستان ابھی تک دہک رہا ہے
فلسطین جل جل کے سکڑ رہا ہے،
کشمیر خونِ شہدا سے لالہ زار ہو رہا ہے
لیکن امت خاموش تماشائی ہے یا بیان بازی سے لطف اندوز ہو رہی ہے۔
مسلم ابن عقیلؒ کی طرح پوری دنیا میں مسلم ابن محمد ﷺ آج بھی
بے سہارا ہے

اپنے ہی اُسے رسوا کر رہے ہیں
اسے پکڑ پکڑ کر کافروں کو دے رہے ہیں
اور ڈالرز لے رہے ہیں۔

آج بھی دل حسینؑ کے ساتھ ہیں اور تلواریں یزید کے ساتھ!
میرا خیال ہے کہ امام حسینؑ اگر آج تشریف لے آئیں اور عالمی یزید کے
مقابل کھڑے ہوں تو ان کے ساتھ شہید ہونے والے ۷۲ ہی نکلیں گے!
بلکہ شاید اس سے بھی کم!

اور ہم
امام حسینؑ کو شہید کروا کے ایک مرتبہ پھر ان کے ماتم میں مصروف ہو جائیں
گے!
(۷ ربیع الثانی ۱۴۲۵ھ / ۲۷ مئی ۲۰۰۴ء، جمعرات)

مصادر

- ۱ قرآن مجید
- ۲ انجیل برنباس، ترجمہ اردو از مولوی محمد حلیم انصاری، کشمیر بک ڈپو، اوکاڑہ
- ۳ کتاب مقدس، اردو، بائبل سوسائٹی، انارکلی، لاہور
- ۴ الصواعق المحرقة فی الرد علی اهل البدع والزندقة
احمد بن حجر اہمیتی المکی (۸۹۹ھ-۹۷۲ھ) مکتبۃ الحقیقۃ، استانبول
- ۵ مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح، علی بن سلطان محمد القاریؒ (۱۰۱۳ھ)
- ۶ ریاض الصالحین، ابوزکریا یحییٰ بن شرف النوویؒ، اسلامی اکادمی، اردو بازار لاہور
- ۷ روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، السید محمود آلوسیؒ بغدادی (۱۷۰ھ)
- ۸ تفسیر عثمانی، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ
- ۹ سیرۃ المصطفیٰ ﷺ مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، مکتبہ عثمانیہ، جامعہ اشرفیہ، لاہور
- ۱۰ الطبقات الکبریٰ، محمد ابن سعد بن منیع البصری الزہری، دارصادر، بیروت
- ۱۱ صحیح مسلم مع شرح النوویؒ مطبع مجتہبائی، دہلی
- ۱۲ فتح الملہم شرح صحیح مسلم، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ
- ۱۳ تذکرہ غوثیہ، مولانا شاہ گل حسنؒ، دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی
- ۱۴ تاریخ الرسل والملوک، ابو جعفر محمد بن جریر الطبری، دارالمعارف، قاہرہ، مصر
- ۱۵ فی منزل الوحی، محمد حسین ہیکل، قاہرہ
- ۱۶ معارف القرآن، مولانا مفتی محمد شفیعؒ، ادارۃ المعارف، کراچی
- ۱۷ سیرۃ النعمان، علامہ شبلی نعمانیؒ، مدینہ پبلشنگ کمپنی، بند روڈ، کراچی
- ۱۸ تاریخ بغداد، حافظ ابو بکر احمد بن علی الخطیبؒ البغدادی
- ۱۹ محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے، مولانا تقی الدین ندوی، مجلس نشریات اسلام، کراچی

- ۲۰ تجلیات ربانی تلخیص و ترجمہ مکتوبات امام ربائی، مولانا نسیم احمد فریدی
امروہوی کتب خانہ الفرقان، لکھنؤ
- ۲۱ مقامات مظہری، حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ، اردو سائنس بورڈ، لاہور
- ۲۲ احکام عالمگیری، حمید الدین خان، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲ کلب روڈ، لاہور
- ۲۳ صحبۃ با اہل دل، سید ابوالحسن علی ندویؒ، مجلس نشریات اسلام، کراچی
- ۲۴ کشف المحجوب، حضرت سید علی ہجویریؒ، ترجمہ فضل الدین گوہر، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
- ۲۵ ماہ نامہ ”قومی زبان“ دسمبر ۱۹۸۲ء، انجمن ترقی اردو، کراچی
- ۲۶ دوستی کا سفر، اثر چوہان، ملت پبلی کیشنز، اسلام آباد
- ۲۷ حیاۃ الحیوان الکبریٰ، کمال الدین محمد بن موسیٰ الدمیریؒ، مکتبہ مصطفیٰ البابی، مصر
- ۲۸ تجرید البخاری، حسین بن مبارک زبیدیؒ، ملک دین محمد اینڈ سنز، لاہور
- ۲۹ فیوض الحرمین، شاہ ولی اللہ، ترجمہ پروفیسر محمد سرور، سندھ ساگر اکادمی، لاہور
- ۳۰ ارمغان شاہ ولی اللہ، ترتیب پروفیسر محمد سرور، سندھ ساگر اکادمی، لاہور
- ۳۱ انوار انوری، مولانا محمد انوریؒ، لائل پور سے طبع ہوئی، ۱۹۶۸ء
- ۳۲ در السحابہ فی مناقب القریبۃ والصحابہ، محمد بن علی الشوکائیؒ، دار الفکر، دمشق
- ۳۳ مناقب علی والحسین واماہما فاطمۃ الزہراءؑ، عبدالمعطی امین قلعجی مکتبہ سید احمد شہیدؒ لاہور
- ۳۴ الجامع الصحیح، امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ، قدیمی کتب خانہ، کراچی
- ۳۵ سنن ابن ماجہ، محمد بن یزید ابن ماجہ قزوینیؒ، قدیمی کتب خانہ، کراچی
- ۳۶ بزم صوفیہ، سید صباح الدین عبدالرحمنؒ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد
- ۳۷ الحسینؑ حفید او شہید، عرفان بن سلیم العشاشویۃ الدمشقی، المکتبۃ العصریہ، صیدا، بیروت
- ۳۸ الفتح الربانی لترتیب مسند الامام احمد بن حنبل الشیبائیؒ، احمد بن عبدالرحمن

البنا الشہیر بالساعاتی، بیروت

- ۳۹ دروس الحدیث، صوفی عبدالحمید سواتی، مکتبہ دروس القرآن، فاروق گنج، گوجرانوالہ
- ۴۰ شامل ترمذی، محمد بن عیسیٰ بن سورۃ ترمذی، نور محمد اصح المطابع، کراچی
- ۴۱ الحسن والحسینؑ، محمد رضا، المکتبۃ العصریہ، صیدا، بیروت
- ۴۲ سیر الاولیاء، امیر خور، ترجمہ اعجاز الحق قدوسی، اردو سائنس بورڈ اپر مال، لاہور
- ۴۳ جلاء الافہام فی الصلوٰۃ والسلام علی خیر الانام ﷺ ابن قیم الجوزیہ، مکتبہ المؤید، ریاض
- ۴۴ المستدرک للحاکم، دائرۃ المعارف النظامیہ، حیدر آباد دکن
- ۴۵ کلیات اقبالؒ، اردو، فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، اردو بازار، لاہور
- ۴۶ تاریخ اسلام، مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی، مکتبہ الفیصل، اردو بازار، لاہور
- ۴۷ تاریخ الخلفاء (مترجمہ) جلال الدین عبدالرحمن بن ابی بکر سیوطی، نفیس اکیڈمی، اردو بازار، کراچی
- ۴۸ خطبات حکیم الاسلامؐ، ترتیب: محمد ادریس ہوشیار پوری، کتب خانہ مجیدیہ، ملتان
- ۴۹ ماہ نامہ ”الحسن“ ستمبر ۲۰۰۳ء، شمارہ: ۷، جلد: ۱۸، جامعہ اشرفیہ، لاہور
- ۵۰ معجم مفردات الفاظ القرآن، علامہ راغب اصفہانی
- ۵۱ الاممۃ والسیاسة، ابو محمد عبداللہ بن مسلم ابن قتیبہ الدینوریؒ، مکتبہ مصطفیٰ البابی، مصر
- ۵۲ سیرۃ النبی ﷺ، شبلی نعمانی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، پاکستان
- ۵۳ المرئضیؒ، سید ابوالحسن علی ندویؒ، مکتبہ سید احمد شہیدؒ، لاہور
- ۵۴ الکامل فی التاريخ، عزالدین ابی الحسن علی ابن محمد بن عبدالکریم الجزری، المعروف بابن الاثیر المکتبۃ الاسلامیہ، طہران
- ۵۵ ہفت روزہ ”خدام الدین“ لاہور، امام انقلابؒ نمبر
- ۵۶ حجۃ اللہ البالغہ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ
- ۵۷ تفسیر مظہری، قاضی ثناء اللہ پانی پٹی

- ۵۸ تحقیق و اثبات شہادت امام حسینؑ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، تحریک خدام اہل سنت، کرم آباد، وحدت روڈ، لاہور
- ۵۹ سواطع الالہام، مجموعہ کلام سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مکتبہ نادیۃ الادب الاسلامی، کچہری روڈ، ملتان
- ۶۰ یاد یار مہربان آید ہے، عبدالستار نجم، جھنگ ادبی اکادمی، جھنگ
- ۶۱ معارف الحدیث، مولانا محمد منظور نعمانیؒ، عمر فاروق اکیڈمی، لاہور
- ۶۲ سنن نسائی، احمد بن شعیب نسائیؒ، عمر فاروق اکیڈمی، لاہور
- ۶۳ نصب الراية لاحادیث الہدایہ، حافظ عبداللہ بن یوسف زیلیعیؒ، المجلس العلمی، ڈابھیل، سورت، الہند
- ۶۴ تحدیث نعمت، مولانا محمد منظور نعمانیؒ، کتب خانہ الفرقان، لکھنؤ
- ۶۵ ماہ نامہ ”اردو ڈائجسٹ“ الطاف حسن قریشی، بمن آباد، لاہور
- ۶۶ علیؑ و حسینؑ، قاضی اطہر مبارک پوری، مکتبہ سید احمد شہیدؒ، لاہور
- ۶۷ تاریخ دعوت و عزیمت، سید ابوالحسن علی ندویؒ، مجلس نشریات اسلام، کراچی
- ۶۸ تہذیب سیرت ابن ہشامؒ، عبدالسلام ہارونؒ، دارالاجوٹ العلمیہ، کویت
- ۶۹ دیوان الفیض، تحقیق و تقدیم، ڈاکٹر ظہور احمد اظہر، الجمع العربی، پاکستان
- ۷۰ اکابر کا مسلک و مشرب، مولانا عزیز الرحمن، مکتبہ خانقاہ اقبالیہ، ٹیکسلا
- ۷۱ الحیاۃ بعد الممات، فضل حسین بہاری، المکتبۃ الاثریہ، سانگلہ اہل، شیخوپورہ
- ۷۲ البدایۃ والنہایۃ فی التاریخ، عماد الدین ابی الفداء اسماعیل بن عمر بن کثیرؒ قرشی دمشقی، مطبعۃ السعادة، مصر
- ۷۳ سوانح حیات مولانا محمد یوسفؒ کاندھلوی
- ۷۴ الفقہ الحنفی وادلہ، الشیخ اسعد محمد سعید الصاغر جی..... ادارۃ القرآن، کراچی
- ۷۵ جوامع الکلم، ملفوظات حضرت خواجہ گیسو درازؒ..... نفیس اکیڈمی، کراچی

تاریخِ کرِ بلا

ہلالِ محرم نے رُخ سے نقاب سرکائی تو اس کے چہرے پر اسلام کے نشانِ عزت و غیرت عمر فاروقؓ کے خون کی سرخی نظر آئی، پھر ہر شب یہ ہلالِ یزیدی جو روحِ جفا اور اہل بیتؑ کے خونِ ناروا سے خونیں قبا ہوتا گیا، یہاں تک کہ شبِ عاشورائی تو فرزندِ رسولؐ، جگر گوشہٴ بتوں کے مقدس لہو میں ڈوب کر اس شان سے طلوع ہوا کہ اس کی سرخروئی سے عالمِ اسلام سرخرو نظر آنے لگا!

”شہادتِ حسینؑ“ کے حوادث و معارف پر غور کرتے ہوئے طاہر خیال ”شہادتِ گاہِ حسینؑ“ پر پرواز کرنے لگا، اس دوران میں اُس نے قرونوں کا سفر کیا اور بہت سے مناظر اپنے دامن میں سمیٹے۔

آئیے! آپ بھی میرے شریکِ سفر ہو جائیے!

تاریخِ اسلام میں کربلا کا مقام

اللہ جل شانہ نے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر اتارا اور ”لا الہ الا اللہ“ کا اعلان و اظہار اس کا فرض منصبی قرار دیا۔ خدا کے پہلے گھر کی بنیادیں اسی عقیدہٴ توحید پر اٹھائی گئی تھیں، لیکن صدیاں بیتیں کہ حرم کے در و دیوار کلمہٴ طیبہ سننے کو ترس رہے تھے، یکا یک رحمتِ باری جوش میں آئی اور سرزمینِ مکہ پر ”لا الہ الا اللہ“ کا نعرہٴ حق ”محمد رسول اللہ“ کی زبان سے بلند ہوا، کفر کے ایوان میں کھلبلی توپچی لیکن نظامِ خلافت کا قیام سرزمینِ مدینہ کا مقدر بنا۔

کاروانِ خلافت رواں دواں تھا کہ ملوکیت نے شبِ خون مارا اور امت کو

صراطِ مستقیم سے بھٹکانے کی کوشش کی، حکمت الہی کا فرما ہوئی اور سرزمینِ کربلا پر نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خون سے خلافت کی حدود کا تعین کیا گیا، خون کی لکیروں کا یہ تعین و تشخیص اتنا پختہ اور اتنا گہرا تھا کہ زمانہ ہزار کوششوں کے باوجود اب تک اسے مٹا سکا ہے اور نہ قیامت تک مٹا سکے گا۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ دین اسلام اور نظام خلافت کی تاریخ میں مکہ اور مدینہ کے بعد اگر کسی شہر کو مذہبی اور سیاسی اہمیت حاصل ہے تو وہ کربلا ہے۔

کربلا کا محل وقوع

کربلا موجودہ عراق کا ایک اہم تاریخی شہر ہے۔ یہ بغداد کے جنوب مغرب میں 105 کلومیٹر دور 44,01 ڈگری طول بلد پر شرقاً اور 32,37 ڈگری عرض بلد پر شمالاً واقع ہے۔ طبعی اعتبار سے یہ عراق کی ریتلی (Sandy) رسوبی (Sedimentary) اور چٹانی سرزمین کا سنگم ہے۔

کربلا کی عمرانی تاریخ

کربلا کی تاریخ عہدِ بابلی تک پہنچتی ہے۔ بعض مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ کربلا ”لابالا کو باس“ یعنی فراتِ قدیم کے شہروں میں سے ہے۔ ”ماریا“ ”عمورا“ ”صفورا“ ”نواولیس“ اس کے قدیم نام ہیں، اور یہ نام اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ یہ شہر عبادت و ریاضت کا مرکز رہا۔

کربلا کے ارد گرد پائے جانے والے مقابر اور ان سے ملنی والی ٹھیکریاں عہدِ مسیحی سے بھی پہلے کی ہیں۔ کربلا سے چند میل کے فاصلے پر ”حر بن یزید ریاحی“ کے مزار سے کچھ دور قرطہ اور کمالیہ میں متعدد ٹیلے اور کھنڈرات ہیں۔ کلیدار نے ’مدینہ

الحسینؑ، میں چوالیس ٹیلوں کے نام دیے ہیں۔ ان ٹیلوں کے نیچے آشوری، بابلی، ساسانی، اموی اور غزنوی عہد کی تہذیبیں دفن ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اصل کربلا یہاں واقع تھا۔ آجکل انہیں ’ظہیرہ‘ اور ’عرقوب‘ کے ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ ان ٹیلوں اور کھنڈرات سے کربلا کی قدامت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ کربلا نے آہستہ آہستہ ترقی کی ہے۔ کلدانی، عرب، تنوخ، لخم اور منافزہ کے عہد میں کربلا ایک متمدن اور ترقی یافتہ شہر تھا۔ اس عہد میں دارالحکومت ’حیرہ‘ تھا اور کربلا ’حیرہ‘ اور ’عین التمر‘ کے درمیان مشہور تجارتی مرکز تھا۔ شہر کی مرکزیت کی وجہ سے بہت سے عرب قبائل یہاں آباد ہوئے، اس میں قبیلہ بنو تمیم کی شاخیں ’بنو دارم‘ اور ’ایاد‘ اور قبیلہ بنو اسد کی شاخیں ’بنو عامر‘ اور ’بنو غاضرہ‘ زیادہ مشہور ہیں۔

کربلا میں بسنے والوں کی معیشت کا زیادہ تر انحصار زراعت پر تھا۔ اس لیے کہ یہاں کی زمین زرخیز اور سرسبز و شاداب تھی، پانی وافر تھا، کیونکہ اس کے اطراف میں جابجا قدرتی چشمے جاری تھے۔ علاوہ ازیں قدیم دریائے فرات سے نکالی ہوئی ”نہر علقمی“ اس میں سے ہو کر گزرتی تھی۔ اس نہر کے بارے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ شاہ بابل بخت نصر نے اسے فرات کے غربی علاقے ”ھیت“ سے نکالا تھا اور کویت تک پہنچایا تھا۔

لیکن کہتے ہیں: کمال کے بعد زوال ہوتا ہے۔ کربلا کے کمال پر بھی زوال آیا اور مرد و زمانہ کے ساتھ یہ شہر غیر آباد ہوتا چلا گیا..... عین ممکن ہے کہ تجارتی مراکز اور تجارتی راستہ بدلنے سے یہاں کے باسی بھی نقل مکانی کر گئے ہوں اور رفتہ رفتہ بھرا پڑا شہر ویرانے میں بدل گیا ہو..... چنانچہ پہلی صدی ہجری کے پہلے ساٹھ سالوں میں کربلا ایک غیر اہم اور غیر آباد علاقہ دکھائی دیتا ہے۔

کربلا کی جدید تاریخ 2 محرم الحرام 61ھ کو امام حسینؑ کے یہاں خیمہ زن ہونے سے شروع ہوتی ہے۔

کربلا کی جغرافیائی اور عسکری (Strategy) اہمیت کو سامنے رکھیے تو پڑاؤ کے لیے اس سرزمین کا انتخاب آپؑ کی فراست کی شہادت دیتا ہے۔ لیکن قضا و قدر کے معاملے عجیب ہوتے ہیں، 10 محرم 61ھ کو اسی سرزمین پر آپؑ جام شہادت نوش کرتے ہیں اور یوں کربلا کو اپنی دائمی منزل ٹھہرا کر اسے شہرت دوام عطا فرماتے ہیں۔ امام حسینؑ کے مرقد مطہر کی وجہ سے کربلا کو پھر اہمیت حاصل ہو گئی۔ زائرین کی آمد و رفت کا آغاز ہوا اور لوگ از سر نو یہاں آباد ہونے لگے۔ ابن الکازونی کے اندازے کے مطابق ساتویں صدی ہجری میں یہاں گھروں کی تعداد تقریباً ایک ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ آٹھویں صدی ہجری طلوع ہونے کے ساتھ کربلا میں ایک نہایت اہم ترقی رونما ہوئی، جس نے اس شہر کو حیاتِ نو بخشی۔ ترقی یہ ہوئی کہ 702ھ میں غازان خان ایلخانی نے یہاں ایک نہر پہنچانے کا حکم دیا، جو فرات سے کھود کر یہاں تک پہنچائی گئی۔ یہی نہر بعد میں نہر حسینی کے نام سے معروف ہوئی۔

پھر 767ھ میں سلطان اولیس الجلائری نے ایک قدرتی برساتی جھیل ”الحائر“ کی تعمیر نو کا حکم دیا، اس تعمیر کی تکمیل اس کے دونوں بیٹوں نے کی۔

زندگی پانی سے ہے۔ پانی آسانی سے فراہم ہونے لگا تو آبادی بھی تیزی سے بڑھنے لگی اور زندگی کی رونقیں نظر آنے لگیں۔ چنانچہ آئندہ دو تین صدیوں میں کربلا ایک شاد، آباد شہر میں تبدیل ہو گیا۔

آبادی بڑھی، رونق ہوئی تو حکمرانوں کی رال ٹپکنے لگی، دسویں، گیارھویں صدی ہجری میں عثمانیوں اور ایرانیوں کے درمیان عراق پر قبضے کے لیے شدید کشمکش جاری رہی۔ یہاں تک کہ سلطان سلیمان قانونی کے عہد میں عراق سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا۔

پھر نادر شاہ نے بغداد کا تین مرتبہ محاصرہ کیا اور شاہ عباس صفوی نے بغداد پر قبضہ کر لیا۔ 1032ھ میں بغداد پر قبضہ مکمل ہوتے ہی شاہ عباس نے کربلا اور نجف پر تسلط حاصل کرنے کے لیے چڑھائی کر دی اور ان دونوں شہروں کو ایرانی حکومت میں شامل کر لیا۔

یہ تو تھی کربلا کے عہد ماضی کی مختصر تاریخ اور اب

عہد موجود کا کربلا

اس وقت کربلا جمہوریہ عراق میں اسی نام کے صوبے کا صدر مقام ہے اور اہم تاریخی شہر ہے۔ پورا شہر سرسبز و شاداب اور صاف شفاف ہے، عمارتیں حسین، سرکاریں بہترین، بازار کھلے کھلے اور دکانیں بھری بھری ہیں، آبادی ڈیڑھ لاکھ سے متجاوز ہے، مضافات میں گھنے باغات ہیں، جو انواع و اقسام کے پھلوں سے لدے پھندے رہتے ہیں۔ کربلا سے بغداد تک بہت اچھی سڑک بنی ہوئی ہے اور سفر کے لیے اعلیٰ درجے کی بسیں اور ٹیکسیاں دستیاب ہیں، کرایے نہایت مناسب ہیں، دو طلائی گنبد اور چار سنہری مینار کئی میل دور سے زائرین کا استقبال کرتے دکھائی دیتے ہیں!

کربلا کی مقامی عوامی مصنوعات نہایت اعلیٰ پایہ کی ہیں۔ یہاں پلاسٹک اور چینی کے رنگین اور منقش برتن تیار ہوتے ہیں، پیتل کی نفیس اور دیدہ زیب الواح پر خطاطی کا فن بہت ترقی پر ہے۔ اسی طرح بہترین عباکیں، عمدہ قالین، خوبصورت تشبیہیں اور کڑھائی شدہ لباس بھی بلند معیار پر تیار ہوتے ہیں اور عالمی منڈیوں میں جگہ پاتے ہیں۔

امام حسینؑ اور حضرت عباسؑ کے روضے شب و روز ذکر و تلاوت اور نماز و دعا سے معمور رہتے ہیں اور زائرین اپنے دامن دل میں یہاں سے روحانی سکون اور ذہنی آسودگی کی دولت سمیٹ کر رخصت ہوتے ہیں۔ اس طرح آج کا کربلا روحانی اور مادی دونوں اعتبار سے عالم اسلام میں اہم مقام رکھتا ہے۔

کربلا کی اہم عمارات اور تاریخی مقامات

(۱) روضہ امامؑ کی تاریخ

ابتدا میں امام حسینؑ کی قبر مبارک ایک نشیب میں تھی، جس کے گرد کچھ اونچے ٹیلے تھے، اسی لیے اس مقام کو شروع شروع میں 'الحائر' کہا گیا۔

65ھ میں ابو اسحاق مختار بن ابی عبیدہ السقفی نے بنو امیہ کے خلاف بغاوت کی اور اسی زمانے میں مزار امامؑ پر ایک چھوٹی سی عمارت بنوائی، جس کا ایک دروازہ مشرق کی طرف تھا اور ایک مغرب کی جانب۔ ایک مسجد بھی تعمیر ہوئی، اس سے پہلے وہاں بیری کا ایک درخت تھا، جسے باقی رکھا گیا، اس عمارت اور درخت کو ہارون الرشید نے ختم کر دیا، مامون نے اپنے دور میں دوبارہ یہ عمارت بنوائی لیکن متوکل نے اسے گرا دیا، پھر المقتدر باللہ نے نئے سرے سے روضہ بنوایا اور راستے میں نشانِ راہ نصب کیے۔ اس کے بعد ہر دور میں شاہوں اور نیاز مندوں نے روضے کی تعمیر و توسیع، آرائش و زیبائش اور زائرین کی خدمت و سہولت میں دلچسپی لی۔

726ھ / 1326ء میں مشہور سیاح ابن بطوطہ یہاں زیارت کے لیے

حاضر ہوا، اس کا بیان ہے:

”یہ چھوٹا سا شہر کھجور کے باغوں سے گھرا ہوا ہے، فرات کا پانی زمین سیراب کرتا ہے، وسط شہر میں روضہ ہے، اس میں ایک بہت بڑا مدرسہ اور اہل عرفان کی نشست گاہ (زاویہ) ہے، جہاں مہمانوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے، روضے کے دروازے پر حاجب و دربان ہیں، جن کی اجازت کے بغیر اندر جانا ممکن نہیں، آستانہ مقدس کا دروازہ چاندی کا ہے، صریح مبارک پر سونے اور چاندی کی قندیلیں آویزاں ہیں، اور دروازوں پر ریشم کے پردے ہیں۔“ (تحفۃ النظار، بحوالہ دائرة المعارف، مقالہ: کربلا)

18 ذوالحجہ 1216ھ / 1802ء میں نجدیوں نے کربلا پر حملہ کیا، شہر میں

قتل و غارت گری کے علاوہ روضے لوٹ لیے اور تمام اسباب لے گئے۔

مزاج کی ہم آہنگی دیکھیے، یزیدیوں نے اہل بیتؑ کو لوٹا تو نجدیوں نے ان کے مزارات پر دھاوا بولا، دونوں طبقے اہل حرمت کی بے حرمتی سے تسکین پاتے ہیں،

فالی اللہ المشتکی!

اس نقصانِ عظیم کی تلافی فتح علی شاہ قاجار نے کی، امام حسینؑ اور حضرت عباسؑ کے روضوں کے گنبدوں پر سونا چڑھوایا، میناروں کی طلا کاری ہوئی، حرم میں توسیع ہوئی، اوقاف قائم ہوئے۔ اس کے بعد سے اب تک یہ مقدس مزارات مسلسل دیکھ بھال کی وجہ سے محفوظ ہیں اور عقیدت و محبت کی فراوانی نے انہیں فن تعمیر و تزئین کا اعلیٰ نمونہ بنا دیا ہے۔

تکوینی مصلحت

مدینہ طیبہ کا قیام اور جوار نبوی ہر مؤمن کی تمنا رہی ہے لیکن پہلے حضرت علیؑ نے اور پھر امام حسینؑ نے مدینہ طیبہ سے سکونت ترک کی..... اس میں یہ تکوینی مصلحت سمجھ آتی ہے کہ یہ حضراتؑ خلافت کی علامت ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں مدینہ طیبہ سے ایسے خطے میں منتقل کیا جہاں اسے معلوم تھا کہ احترام باقی رہے گا۔ چنانچہ ان پاکیزہ شخصیات کے آثار و مقابر ہر نسل کو مقدس جدوجہد کی یاد دلاتے رہے ہیں، امریکی تسلط کے بعد آج بھی عراقی مجاہدین کو مزاحمت کا حوصلہ اور قربانی کا ولولہ انہی آثار سے حاصل ہو رہا ہے:

جب کوئی فتنہ زمانے میں نیا اٹھتا ہے

وہ اشارے سے بتا دیتے ہیں تربت میری

مدینہ طیبہ میں رہتے تو آج جنت البقیع میں دوسرے صحابہ کرامؓ کے ساتھ ان کے آثار بھی مٹا دیے جاتے، اور رفتہ رفتہ جذبہ حریت کے یہ سرچشمے بند ہو جاتے۔

ایک قلندر مزار امامؑ پر

حضرت سید غوث علی شاہ قلندر پانی پٹی (1804 - 1880) ایک نامور بزرگ گذرے ہیں، آپ نے کسب فیض کے لیے خوب سیاحت بھی کی، ”تذکرہ غوثیہ“ آپ کے حالات و ملفوظات کا ایک دلچسپ تذکرہ ہے، اس میں آپ اپنی

سیاحت کربلا کا حال بیان فرماتے ہیں:

”کوفہ سے چل کر واپس کربلا سے معلیٰ پہنچے، سب بزرگوں کے مزارات متبرکہ کی زیارت کی۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کا مزار شریف دہرا ہے۔ ایک تہ خانے میں، دوسرا اس کے اوپر ہے اور وہی زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ تہ خانے میں جانے کی عام اجازت نہیں۔ ہم کو زرک اپنے ساتھ لے گیا۔ شمع کا فوری روشن تھی، خوشبو سے دماغ معطر ہوا جاتا تھا، ہم نے وہاں کے سوا کسی مزار پر شمع کا فوری روشن نہیں دیکھی۔ اس وقت تک ایک خیمہ بھی اُس مقام پر نصب ہے، جہاں امام حسین علیہ السلام نے اہل بیتؑ کے لیے خیمہ قائم کیا تھا۔ اس جگہ نہایت حسرت و بیکسی برستی ہے، کیسا ہی سنگدل کیوں نہ ہو، وہاں دل موم ہی ہو جاتا ہے اور خود بخود جی بھرا آتا ہے، طبیعت میں بے قراری پیدا ہوتی ہے۔

اور وہاں ایک عجیب بات یہ دیکھی کہ مسجد ایک اور امام کئی، یعنی ایک مسجد میں کئی امام اور ہر امام کے مقابل ایک لڑکا بیٹھا ہوا تکبیر کے وقت اللہ اکبر کہتا رہتا ہے، ہم نے دریافت کیا تو کہنے لگے کہ کسی کو کسی امام پر اعتقاد ہے کسی کو کسی پر، اسی واسطے ایک امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے، جس کو جس پر اعتقاد ہے، وہ اُس کے پیچھے نماز پڑھتا ہے، اس لیے بہت امام ہو جاتے ہیں، اور امام کے لیے یہ شرط ہے کہ معصوم ہو، بچوں کے علاوہ معصوم ملنا غیر ممکن ہے، اور بچوں پر نماز فرض نہیں، اس لیے امام کے سامنے بیٹھ کر تکبیر کہتا رہتا ہے۔“ (تذکرہ غوثیہ ص: ۱۰۷)

(۲) حصن الانحیض

یہ قلعہ کربلا سے 50 کلومیٹر جنوب مغرب میں صحرا میں واقع ہے۔ شرق اوسط میں یہ قلعہ اپنی رفعت، وسعت اور عجیب و غریب طرز تعمیر کی وجہ سے آثار اسلامیہ کا ایک خوبصورت اور حسین نمونہ ہے۔

یہ قلعہ حلب کو بصرہ سے اور صحرا لے شام کو نجد کی پہاڑیوں سے ملانے والی

شاہراہ پر واقع ہے۔ بندرگاہ بصرہ کی وساطت سے بحر ابیض اور بحر ہند کے درمیان سفر کے لیے یہی شاہراہ استعمال کی جاتی تھی، شاہراہ صالح اور نہر سویز سے پہلے یہی اہم ترین شاہراہ تھی، اس لیے یہ قلعہ عسکری نقطہ نظر سے بے حد اہمیت رکھتا تھا۔
یہ قلعہ کب تعمیر ہوا؟

اس بارے میں ایک رائے یہ ہے یہ عہد عباسی میں ابو جعفر منصور کے دور میں تعمیر ہوا۔

علامہ شکری آلوسیؒ کی رائے یہ ہے کہ ”احیضر“ ”اکیدر“ کا محرف ہے اور اکیدر قبیلہ کندہ کے امیر کا نام ہے، جو اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمان ہوا تھا، غالب گمان یہ ہے کہ یہ قلعہ اسی کا بنا کر وہ ہے۔

لیکن مشہور محقق ’موزیل‘ کا کہنا یہ ہے کہ ’الاحیضر‘ معروف تاریخی شخصیت ’اسماعیل بن یوسف الاحیضر‘ کا لقب ہے، جو چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں یمامہ کی جانب سے کوفے کا حاکم تھا۔ قرین قیاس یہ ہے کہ اسی نے اپنے مسکن کے طور پر یہ قلعہ تعمیر کروایا ہوگا۔

مشہور سیاح ڈاکٹر مصطفیٰ جواد کی رائے یہ ہے کہ قلعہ احیضر عہد ساسانی کی تعمیر ہے، کیونکہ اس کا طرز تعمیر عربی طرز تعمیر سے بالکل جداگانہ ہے۔

اس قلعے کی بیرونی دیوار مربع شکل میں تعمیر کی گئی ہے اور ہر جانب دیوار کا طول 170 میٹر ہے۔ اندرونی محل مستطیل ہے اور متعدد آرام گاہوں اور ضروری سہولتوں سے مزین ہے، قلعے کے اندر ایک بڑا دروازہ ہے، جس کے اوپر مربع شکل کا طاق بنا ہوا ہے، دروازے کی غربی جانب مسجد ہے، قلعے کی دیواروں پر چاروں طرف برجیوں کا ایک طویل سلسلہ ہے، جن میں سے چاروں کونوں کے برج اور شرقی و غربی سمت کے درمیانی برج قابل دید ہیں۔

(۳) عین التمر

کربلا کے جنوب مغرب میں 67 کلومیٹر کے فاصلے پر عین التمر نامی کھجوروں کا ایک بن واقع ہے۔ اس بن کے درمیان سبزہ پوش پہاڑیاں تھیں، پہاڑیوں کے دامن میں صاف شفاف پانی کے چشمے رواں رہتے تھے، اور انہیں عبور کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے پل بنے ہوئے تھے۔ کھجوروں کے ایک جھنڈ میں گندھک (Sulphur) کے چشمے تھے، جو تمام سال بہتے رہتے تھے اور ماحول کی مناسبت سے ان کے نام رکھے گئے تھے، عین التمر بن میں 19 سے زیادہ چشمے پائے جاتے تھے۔ اسی طرح منطقہ رحالیہ سے ”شغاٹا“ کے درمیان پچاس سے زیادہ چھوٹے بڑے چشمے موجود تھے، لیکن اب یہ سب بند پڑے ہیں، انہیں ”عیون بر بویل“ کہا جاتا ہے۔ آج بھی اگر ان چشموں کی اصلاح اور صفائی ہو تو معدنی پانی کے فوارے ابلنے لگیں۔

(۴) رزازہ جھیل

یہ جھیل کربلا سے مغرب میں 11 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے، یہ ایک وسیع و عریض جھیل ہے اور اس کا پانی دریائے فرات سے آتا ہے۔ جھیل کے حسن و دلکشی اور وسعت و ندرت کی وجہ سے یہاں ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کا ہجوم لگا رہتا ہے، جو مناظر فطرت سے اپنا دل بہلاتے اور قدرت کی فیاضی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

کربلا کی وجہ تسمیہ

لسانیات و اثریات کے ماہرین کربلا کی وجہ تسمیہ کے بارے میں مختلف آراء رکھتے ہیں۔ ان میں سے چند وجوہ ہدیہ قارئین ہیں:-

(۱) ”کربلا“ لغت بابلی کا لفظ ہے۔ اہل بابل سرزمین دجلہ و فرات کے مختلف

شہروں اور قصبوں میں آباد تھے، جن کے نام یہ ہیں: نینوی، غاضریہ، کربلہ (کربلاء

یا عقر بابل) نو اوہلیں اور حائر، ان شہروں اور قریوں کو وہ مجموعی طور پر 'کور بابل' سے موسوم کرتے تھے۔ اصل میں کور کا معنی ہے عمارے کا ایک چکر، پھیر، اونٹ کے کجاوے کو بھی کور کہا جاتا ہے۔ لہذا وہ علاقائی حد اور پٹی جو ایک خاص رقبے اور قوم کو اپنے اندر سمیٹ لے، اسے کورہ کہا جاتا ہے۔ آج بھی عربی میں کورہ صوبے اور ضلع کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ (الفراند الدریہ، القاموس المفرد)۔

کیا عجب ہے کہ ہمارے ہاں اکوڑہ اور اکاڑہ اسی کی بگڑی ہوئی شکل ہو!.....

خیال رہے کہ یہ علاقے بھی قدیم تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ اردو ڈائجسٹ سیاحت پاکستان نمبر ص: ۱۹۸ پر ہے: "ست گھرا اکاڑہ سے صرف ۲۰ منٹ کی مسافت پر واقع تاریخی اہمیت کا گاؤں ہے۔ یہاں سے ملنے والے سکے اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ علاقہ کشان دور حکومت میں بھی آباد تھا۔ کشان دوسری صدی عیسوی میں دریائے آمو (افغانستان) سے دریائے گنگا تک حکومت کرتے رہے۔"

اکاڑہ سے کچھ ہی مسافت پر ساہیوال کے قریب ہڑپہ واقع ہے۔ "موئن جو دڑو کے بعد وادی سندھ کی قدیم تہذیب کا دوسرا بڑا مرکز..... جب سکندر اعظم نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اس نے ہڑپہ کو بھی تاخت و تاراج کیا تھا، ملہی اور کائٹیا قبائل نے مل کر سکندر کی فوج کا مقابلہ کیا، لیکن وہ یونانی فوج کے بے پناہ ساز و سامان کے سامنے ٹھہر نہ سکے۔

رگ وید کی قدیم منتروں میں اس کا نام 'ہری روپا' لکھا ہے، زمانے کی چال نے ہری روپا کو بعد میں ہڑپہ بنا دیا..... ہڑپہ کی تہذیب وادی دجلہ و فرات اور وادی نیل کی تہذیب کے ساتھ ساتھ ڈھائی ہزار سال قبل مسیح میں اپنے شباب پر تھی۔"

(ماہ نامہ "اردو ڈائجسٹ" سیاحت پاکستان نمبر: ص ۱۸۵)

تہذیب اور دور کے اشتراک کے ساتھ اسماء کا اشتراک بعید از قیاس نہیں۔
بہر کیف کور بابل کا معنی ہوا صوبہ بابل، صوبہ بابل کے ان قریوں کے آثار
آج بھی سُدۃ الہندیہ، (ہندی دروازہ) کے قریب پائے جاتے ہیں۔

بابلی زبان میں 'کربلہ' کا معنی ہے قرب الالہ، یعنی معبود قریب ہوا، ہو
سکتا ہے کہ کربلا میں ان کی عبادت گاہ ہو، جس کی مناسبت سے وہ اس قریے کو کربلہ
کہنے لگے ہوں، پھر رفتہ رفتہ یہ لفظ کربلاء بن گیا ہو۔

(۲) کربلاء کا لفظ دو آشوری لفظوں: 'کرب' اور 'ایل' یا 'ایلو' سے
مرکب ہے اور اس کا معنی ہے 'حرم اللہ' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں آشوریوں
کی کوئی عبادت گاہ تھی، جس کی وجہ سے اس کا یہ نام رکھا گیا۔ خیال رہے کہ سریانی
زبان میں بھی ایل، اللہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے اسرائیل، جبرائیل۔

(۳) کربلاء ماخوذ ہے کربلة سے، اس کا معنی ہے: رخاوة فی الموضع،
یعنی جگہ کی نرمی، تو ممکن ہے کہ سنگریزوں اور جھاڑیوں سے خالی ہونے کی وجہ سے اس
کا یہ نام پڑ گیا ہو۔

(۴) یا قوت الحموی لکھتے ہیں: "الکربلة رخاوة فی القدمین" یعنی کربلہ
قدموں کی نرمی کو کہتے ہیں۔ عربی محاورہ ہے: جاء یمشی مکربلاً، یعنی وہ نرم
پاؤں چلتے ہوئے آیا۔

گندم کو جب چھان پھٹک لیا جائے تو کہا جاتا ہے: کُرِبِلَتْ الحِنْطَةُ
ایک شاعر گندم کی تعریف میں کہتا ہے:

یحملن حمراء رسوباً للثقل

قد غربلت و کربلت من القصل

”وہ عورتیں ایسی عمدہ اور بھاری گندم اٹھائے ہوئی ہیں، جو چھانی پھٹکی اور

بھوسے سے صاف کی ہوئی ہے۔“

تو ممکن ہے کہ سرزمین کربلا کا نرمی، کشادگی اور کنکروں سے صاف ہونے کی بنا پر یہ نام رکھا گیا ہو۔

(۵) کربلاء کا لفظ کربل سے مشتق ہے، کربل ایک کڑوی جنگلی بوٹی کا نام ہے، جو کربلا میں بکثرت پائی جاتی ہے۔ شاعر ابو وجرہ السعدی ہودج کے رنگ بہ رنگ منظر کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

وَأَمْرُ كَرْبَلٍ، وَعَمِيمٌ دِفْلَى

عَلَيْهَا وَالنَّدَى سَبْطٌ يَمُورُ،

ترجمہ: ”پھل دار کربل بوٹی اور دفلی کے ڈھیر اُس پر لدے ہیں اور شبِ نیم آلود تازہ چارا تیزی سے لہرا رہا ہے۔“

(دفلی: ایک پودا جس پر سرخ گلاب کی طرح پھول لگتے ہیں)

(۶) ’لسان العرب‘ میں ہے: ”كرب الأمر كروباً“ یعنی ”معاملہ قریب آ پہنچا“۔ عبد القیس بن خفاف البرجمی کا شعر ہے:

ابنِی ان اباک کارب یومہ

فاذا دعیت الی المکارم فاعجل

”میرے بیٹے! تیرا باپ اپنے یوم اجل سے قریب آ پہنچا ہے، لہذا تجھے

جب بزرگانہ کاموں کی دعوت دی جائے تو جلدی کرنا۔“

’ابن مقبل‘ اپنی اوٹنی کی تعریف میں کہتا ہے:

فبعثها تقص المقاصر بعدما

کربت حیاة النار للمتنور

”میں نے اوٹنی کو اٹھایا، وہ درختوں کی جڑوں کو توڑ رہی تھی، جبکہ آگ کی

زندگی روشنی کے طلبگار کے قریب ہو چکی تھی“ (یعنی شام کے وقت جب چراغ جلنے کا

وقت قریب آ پہنچا تھا، میں نے اوٹنی کو اٹھایا)۔

ان اشعار میں 'کرب' دنا (قریب ہونا) کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔
'لاء' کے بارے میں احتمال ہے کہ یہ 'لواء' (پرچم) کی بگڑی صورت ہو، پرچم عزت و عظمت کا نشان ہوتا ہے، تو گویا کربلاء کا معنی ہے: وہ مقام جہاں عزت و عظمت طلبگار سے قریب آ پہنچتی ہے۔

(۷) 'کربلا' اصل میں 'کاربیلا' تھا، آرامی اور آستوری میں اس کا معنی ہے: ملانے والا، تو ہو سکتا ہے کہ چٹانی اور ریتلی زمین کے سنگم پر واقع ہونے کی وجہ سے اسے کاربیلا کہنے لگے ہوں جو کثرت استعمال سے کربلا بن گیا۔

نیز آرامی اور آستوری زبان میں 'کربلا تو' (Karbalatu) اور ڈھنی اور سرچھپانے والے کپڑے کو بھی کہتے ہیں۔

(۸) عراق کے مختلف قریوں کے نام میں "کر" پایا جاتا ہے، جیسے کرکوک، کرخ، وغیرہ، بابل میں دریاے فرات کے کنارے 'کر کمیس' کا ذکر ہے، جہاں شاہ بابل بنو کدرضر نے شاہ مصر فرعون نکوہ کی فوج کو شکست دی تھی (یرمیاہ: ۴۶: ۲)۔
توفیق وہی کے نزدیک آشوری میں 'کر' اور 'کار' کا معنی ہے قلعہ یا چار دیواری سے گھرا ہوا قریہ، 'بلاء' ممکن ہے آشوری زبان میں ٹیلے کو کہتے ہوں کہ بعض کے خیال میں مشرق سے جنوب تک پھیلے ہوئے ٹیلوں کی مناسبت سے اسے کربلاء کہتے ہیں۔

(اور کیا بعید ہے کہ بلاء آشوری میں اسی مفہوم میں استعمال ہوتا ہو، جس مفہوم میں ہمارے ہاں، بیلا، استعمال ہوتا ہے یعنی دریا کے کنارے کا علاقہ، اوپر ساتویں وجہ 'کاربیلا' میں تو صریحاً 'بیلا' لفظ استعمال ہوا ہے!)

اس تفصیل کی روشنی میں کربلاء کا مطلب ہے قلعہ بلاء یا قلعہ بیلا، قریہ بلاء یا قریہ بیلا۔

بہر کیف وجہ تسمیہ کوئی سی ہو، ان وجوہ کی کثرت اور دقت کربلا کی قدامت اور روحانی عظمت کی خبر دے رہی ہے!

مصادر

- ۱۔ عبدالحسین الکلید ارآل طعمۃ: بغیۃ النبلاء فی تاریخ کربلاء: مطبعة الارشاد، بغداد۔
- ۲۔ سلمان ہادی آل طعمۃ تراث کربلاء، مطبعة الآداب، النجف
- ۳۔ محافظة کربلا بین التراث والمعاصرة، مطبعة الجمهورية، بغداد
- ۴۔ دليل العتبات المقدسة، دار الجمهورية۔ بغداد
- ۵۔ رسالہ ”الاخضر“ عباس علوان الصالح، مطبعة الثقافة، بغداد
- ۶۔ دائرة المعارف الاسلامیہ، مقالہ ”کربلا“ پنجاب یونیورسٹی، لاہور
- ۷۔ کتاب مقدس، بائبل سوسائٹی، انارکلی، لاہور
- ۸۔ ماہنامہ ”اردو ڈائجسٹ“ لاہور، سیاحت پاکستان نمبر، اپریل ۲۰۰۲ء
- ۹۔ تذکرۂ غوثیہ، مولانا شاہ گل حسنؒ، دارالاشاعت، کراچی

حضرت ڈاکٹر مفتی غلام سرور قادری حفظہ اللہ

(سابق وزیر مذہبی امور، صوبہ پنجاب)

”حضرت حافظ صاحب نے انتہائی عقیدت اور اخلاص کے ساتھ جس طرح سیدنا امام حسینؑ کی شخصیت اور واقعہ کربلا کے اسرار کو استدلال اور تحقیق کے ساتھ بیان فرمایا ہے، اس طرح پہلے کم ہی کسی صاحب علم نے کام کیا ہوگا۔ اس کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حافظ صاحب کو نہ صرف علم و تحقیق کی دولت بخشی ہے بلکہ حسن اعتقاد، حسن بیان اور حسن اخلاص کی نعمت سے بھی مالا مال فرمایا ہے یہ کتاب واقعی بہت بڑا علمی و تحقیقی کارنامہ ہے۔“

حضرت مولانا حافظ محمد سعد اللہ حفظہ اللہ

(ایڈیٹر مجلہ ”منہاج“ دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور)

(محترم حافظ صاحب نے بڑی دقت نظر کے ساتھ کتاب پڑھی اور ”تاثرات“ کے عنوان سے مبسوط تبصرہ تحریر فرمایا۔ خصوصی شکریے کے ساتھ چند جملے نقل کر رہا ہوں۔)

”واقعہ کربلا تاریخ اسلام کا ایک رنگین اور نہایت حزن باب ہے، لیکن یہی باب ہمیں خیر و شر اور حق و باطل کی معرفت بھی عطا کرتا ہے اور اسی میدان سے ہمیں جرأت و استقامت اور حق کی خاطر سرفروشی کا اسوۂ حسنہ بھی فراہم ہوتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ کچھ لوگ خود بھٹکے ہوئے ہیں اور دوسروں کو بھی بھٹکا رہے ہیں۔“

زیر نظر کتاب میں ہمارے فاضل اور مخلص دوست جناب حافظ ظفر اللہ شفیق نے بڑی بالغ نظری اور باریک بینی سے اس بارے میں صراطِ مستقیم واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب میں موضوع کی مناسبت سے کئی ضمنی مباحث کے ساتھ درج ذیل مضامین پر بطور خاص بڑے شرح و وسط اور استدلال سے روشنی ڈالی گئی ہے:

(۱) واقعہ کربلا کے اسرار و معارف

(۲) سانحہ کربلا کے بارے میں تمام شبہات کا اطمینان بخش جواب

(۳) اہل بیتؑ اور واقعہ کربلا سے متعلق بعض علمی اور معرکتہ الاراء مباحث کا تجزیہ

(۴) تاریخ کربلا

مجموعی طور پر یہ کتاب اپنے مباحث، سہل الفہم اسلوب، شستہ و شائستہ انداز تحریر اور بلند پایہ استدلال و استنباط کی خوبیوں سے آراستہ ہونے کی بنا پر اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔“

جناب سید سلمان گیلانی حفظہ اللہ (لاہور)

”حافظ ظفر اللہ شفیق نے زیر نظر کتاب لکھ کر ایک بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے، اس موضوع کے بارے میں ایک مدت سے ایسی کتاب کا انتظار تھا جو اہل السنۃ والجماعۃ کے صحیح موقف کو روایت اور درایت کے ساتھ واضح کرے، اور اس میں ادب کی چاشنی کے ساتھ عوامی شعور کی رعایت بھی ہو، یہ کتاب ان تمام خوبیوں کی حامل ہے۔ میں نے والد گرامی محترم سید امین گیلانی کو پوری کتاب دو نشستوں میں سنادی، اباجی نے بھی بہت سراہا اور بہت دعائیں دیں۔“

جناب پروفیسر ممتاز احمد تاجی، اعزازی مدیر ہفت روزہ ”خدام الدین“ لاہور

”اس موضوع پر ایسی مفصل، مدلل اور مکمل کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ“

ماہ نامہ ”الحق“ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک (نومبر ۲۰۰۵ء / شوال ۱۴۲۶ھ)

”زیر تبصرہ کتاب کے موضوع پر ہر زمانے میں مختلف زبانوں میں ضخیم اور مختصر کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور یہ سلسلہ جاری رہے گا، لیکن المیہ یہ ہے کہ ان میں بیشتر کتابیں افراط و تفریط سے خالی نہیں، ضرورت تھی کہ اس موضوع پر ایک ایسی مفصل کتاب لکھی جائے، جو جاوہ حق سے ہٹی ہوئی نہ ہو، تاکہ اس واقعہ کی خوب تنقیح و توضیح ہو جائے۔ ہمارے محترم اور مہربان اور شفیق دوست مولانا حافظ ظفر اللہ شفیق نے اس ضرورت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے انتہائی سلیجھے ہوئے انداز میں لا جواب کتاب لکھی ہے اور اس پر وہ صدمہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ کتاب ظاہری اور معنوی خوبیوں سے آراستہ و پیراستہ ہے اور یقیناً ہر لاہری کے لیے باعث زینت ہوگی۔“

ماہ نامہ ”الخیر“ جامعہ خیر المدارس، ملتان (اپریل ۲۰۰۵ء / ربیع الاول ۱۴۲۶ھ)

”برادر مکرم مولانا حافظ ظفر اللہ شفیق صاحب نے جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے، وہ نزاکت و لطافت میں پل صراط کی مانند ہے، جس سے عقیدہ و عمل میں پختہ اور جاوہ حق پر مستقیم

لوگ ہی نجات پائیں گے۔ بلاشبہ حافظ صاحب نے اپنے طرز فکر، انداز استدلال اور محتاط قلم سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ محبت اہل بیتؑ سرمایہ اہل سنت ہے اہل السنۃ والجماعۃ تمام اصحابؑ کی توقیر و تعظیم کے ساتھ اہل بیتؑ سے دل و جان سے محبت و عقیدت رکھتے ہیں۔ فاضل مولف نے کتاب کو تین ابواب پر تقسیم کیا ہے۔

(۱) واقعہ کربلا (۲) اسرار کربلا (۳) تاریخ کربلا۔ ان ابواب میں انہوں نے بہت سی فکری اور تاریخی اغلاط کی نشاندہی فرمائی ہے۔ امام عالی مقامؑ اور واقعہ کربلا کو قرآن و حدیث اور تاریخ و دانش کی روشنی میں سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے ”الخیر“ کے صفحات اجازت دیتے تو مفصل تبصرہ کیا جاتا، تاہم اتنی گزارش ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں اہل بیتؑ عظام کے متعلق کچھ شبہات یا مغالطات ہیں وہ خالی الذہن ہو کر ایک مرتبہ اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں، انشاء اللہ شبہات کے اندھیرے چھٹ جائیں گے۔“

محترم ڈاکٹر انور سدید (سندے میگزین ۳، اپریل ۲۰۰۵ء نوائے وقت لاہور)

”واقعہ کربلا تاریخ اسلام کا ایک ایسا دلفگار اور خونچکاں واقعہ ہے جس کے خون کے دھاروں سے حق و صداقت کی تاریخ لکھی گئی اور ملت اسلامیہ کے لیے فلاح کی راہ متعین کر دی گئی، اسلام کو زندہ رکھنے کا لائحہ عمل مرتب کر دیا گیا۔ اگرچہ یزیدیت کو اہل دنیا نے تھوڑے عرصے کی منفعت کیلئے قبول کیا، لیکن ہر زمانے میں امام حسینؑ کی شہادت عظمیٰ کو ہی دوام و قبول حاصل ہوا جس کی تقلید کو ایمانیات کا حصہ شمار کیا گیا۔ حافظ ظفر اللہ شفیق صاحب نے، جن کا تعلق ایک علمی اور دینی گھرانے سے ہے، زیر نظر کتاب ”امام حسینؑ اور واقعہ کربلا“ تالیف فرمائی ہے اور اس کی ترتیب و تدوین کیلئے قرآن حکیم، حدیث نبوی اور تاریخ کے علاوہ ماضی بعید و قریب کی دانش سے بھی روشنی حاصل کی ہے، انہوں نے اولاً کربلا کے اسرار و معارف کا بسیط جائزہ لیا اور پھر ان شبہات کے ازالے کی سعی کی جو بعض لوگ دانستہ پھیلاتے رہتے ہیں، کتاب کا مرکزی موضوع تو سیدنا امام حسینؑ اور واقعہ کربلا ہے لیکن حافظ ظفر اللہ شفیق نے اس واقعے کے تمام گرد و پیش، ظہور اسلام اور تبلیغ حق کے داعیان کرام کا تذکرہ بھی معنی خیز انداز میں کر دیا ہے، اس لحاظ سے یہ کتاب موضوعات کا سمندر ہے اور اس کا مطالعہ قلب و نظر کو روشنی اور ایمان کو استحکام عطا کرتا ہے حافظ ظفر اللہ شفیق صاحب کے اسلوب میں تخلیقی رعنائی ہے اور وہ مشکل اور متنازع مسائل کو شہنی انداز میں پیش کرتے ہیں۔“

”میں نہایت مسرت کے ساتھ اس کتاب کی تصدیق و تائید کرتا ہوں۔ اہل حق کا موقف سمجھنے کے لیے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔“

حضرت سید نفیس الحسنی

”کیا عرض کروں دوران مطالعہ میں کیا کیفیت ہوتی ہے۔ ماشاء اللہ احقاق حق خوب ہوا ہے۔“

حضرت مولانا ظفر احمد قادری

”جی چاہا وہ ہاتھ چوم لوں جن سے مودت و الفت میں ڈوبی ہوئی ایسی کتاب لکھی گئی۔“

حضرت ڈاکٹر عبدالمقیم

”مجھے کسی ہدیے سے اتنی مسرت نہیں ہوئی جتنی اس کتاب کے ہدیے سے ہوئی۔ واللہ میرے پاس الفاظ نہیں کہ اپنی قلبی مسرت کا اظہار کر سکوں۔“

حضرت مولانا طارق جمیل

اول سے آخر تک ایک ایک لفظ پڑھا اور بامعان نظر پڑھا، دل نے گواہی دی کہ ناصیت کے زہر کا تریاق یہ کتاب ہے مجھے اس کتاب پر اعتماد ہے۔“

حضرت مولانا عبدالمجید

”دل کی گہرائی سے آرزو ہے کہ میری ذریت کا ہر فرد، عورت ہو یا مرد، اس کتاب کا گہرا مطالعہ کرے۔“

ڈاکٹر مفتی ضیاء الحبیب صابری

”یہ کتاب واقعی بہت بڑا علمی اور تحقیقی کارنامہ ہے۔“

ڈاکٹر مفتی غلام سرور قادری

”اپنی خوبیوں کی بنا پر یہ کتاب اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔“

مولانا حافظ محمد سعد اللہ

”انتہائی سلجھے ہوئے انداز میں ایک لاجواب کتاب۔“

ماہنامہ ”الحق“ اکوڑہ خٹک

”جن دلوں میں اہل بیت عظامؑ کے متعلق کچھ شبہات ہیں، وہ خالی الذہن ہو کر ایک مرتبہ اس کتاب کا مطالعہ ضرور کریں۔“

ماہنامہ ”الخیر“ ملتان

”یہ کتاب موضوعات کا سمندر ہے اور اس کا مطالعہ قلب و نظر کو روشنی اور ایمان کو استحکام عطا کرتا ہے۔“

ڈاکٹر انور سدید، سنڈے میگزین، نوائے وقت، لاہور

